بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت کی آخری پناہ گاہ

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
رُکن مجلسِ مشاورت، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور

مرتب:

تمام حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	انسانیت کی آخری پناہ گاہ
مصنف	:	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
تعداد	:	500
قیمت	:	ــــــــــ
سنِ اشاعت	:	نومبر 2011ء
پرنٹرز	:	یمانی پرنٹرز، لاہور
ناشر	:	

انتساب

میں اپنی کتاب علی عثمان قاسمی صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں

جنہوں نے تحریکِ طلوع اسلام اور قرآنی مفکروں کے فکر کو

مغرب میں روشناس کرایا۔

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
1-	دیباچہ (پناہِ بلندی و پستی توئی)	7
2-	ایک غلط فہمی کا ازالہ	14
3-	انبیاء کرامؑ کے اقوال و اعمال خود اختیاری ہوتے تھے	26
4-	اَساسِ مُحکم	42
5-	اتباعِ دین کا فطری نتیجہ	59
6-	درود کا دینی مفہوم	66
7-	ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے	76
8-	جہاد کے بارے میں ایک اہم نکتہ	84
9-	خُمس کا مذہبی اور دینی مفہوم	96
10-	مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اصل سبب	105
11-	قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی منع ہے	123
12-	قرآنی الفاظ کے مذہبی اور دینی مفاہیم	130
13-	شرکِ خفی کا نادانستہ ارتکاب	144
14-	وجود باری تعالیٰ کے دلائل	148
15-	زکوٰۃ کی ادائیگی کا مسئلہ	155
16-	مملکتِ مدینہ	162

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
17-	عالمی فقہ کی تجویز	172
18-	بدلتی تاریخ	183
19-	استدراک	192
20-	تحریک طلوعِ اسلام کا ایک منفرد نظریہ	203
21-	ایک اچھے لیڈر کا قرآنی معیار	213
22-	موجودہ دور میں تبلیغ اسلام کا طریقہ	223
23-	روحانیت کا مذہبی تصور	232
24-	اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے روابط کے طریقے	242
25-	دین کے دعاوی کے نتائج اس کی صداقت کے ثبوت ہوتے ہیں	253
26-	اہمیت قبلہ	262
27-	تحریکِ طلوعِ اسلام کے ناقدین کی خدمتِ عالیہ میں	271
28-	قانون کی اہمیت	284
29-	حق تو یہ ہے عصرِ حاضر، عصر ہے پرویز کا	291
30-	کُن فیکون کا قرآنی مفہوم	304
31-	قرآنِ کریم کے الفاظ ہی وحی الٰہی ہونے کی دلیل ہیں	311
32-	مسلمان ممالک میں بیداری کی لہر	318
33-	اتباع رسول کے خوشگوار ثمرات ونتائج	329
34-	اطاعتِ رسول کے بارے میں دو متضاد زاویۂ فکر	336
35-	علمِ غیب اور استخارہ	340
36-	''حدود اللہ''	351

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
37-	شرکِ خفی کا نادانستہ ارتکاب	357
38-	''محدث'' کا انکارِ حدیث نمبر	361
39-	مسلمانوں میں تصوف پھیلانے کی کوشش	385

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پناہِ بلندی و پستی توئی

جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے' وہ اس وقت سے اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ کوئی ایسا ضابطۂ حیات وضع کر لے کہ جس میں انسانیت سکون واطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ لیکن صد افسوس کہ انسانی فکر اب تک ایسا ضابطۂ حیات وضع کرنے سے قاصر رہا ہے۔ جب سے انسانوں نے آپس میں مل جل کے رہنا شروع کیا' حالات کے مطابق از خود زندگی بسر کرنے کے طور طریقے بنتے چلے گئے۔ ابتداء میں قبائلی معاشرت شروع ہوئی۔ پھر ملوکیت نے زور پکڑا اور ہر جگہ ملوکیت کا دور دورہ فروغ پاتا چلا گیا۔ ملوکیت کوئی سوچا سمجھا نظامِ زندگی نہیں تھا' جس شخص نے بھی اپنی ہوشیاری اور چابکدستی سے قوت حاصل کر لی وہ ملک کا حاکم و بادشاہ بن بیٹھتا تھا۔ انسانیت نے جب مزید ترقی کی تو یہی ملوکیت جمہوریت میں تبدیل ہوگئی۔ جمہوریت میں یہ Eyewash رکھا گیا کہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود بھی ملک کی حکمرانی میں شریک ہیں۔ ورنہ اصل کے اعتبار سے ملوکیت اور جمہوریت ایک ہی چیز ہے۔ ان دونوں میں انسان ہی انسان پر حاکم ہوتا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ جمہوریت کوئی ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ یہ حکومت چلانے کی ایک مشینری ہے۔ آپ اپنے پڑوسی ملک ہندوستان کو پیشِ نظر رکھیں۔ بے شک ہندوستان کی حکومت کی مشینری جمہوری ہے لیکن ان کا ضابطۂ حیات یا ان کا کلچر جمہوری نہیں ہے۔ اُن

کے ہاں جس طرح آج سے ہزاروں سال پیشتر ذات پات کی تمیز تھی آج بھی وہاں براھمن اور شودر میں اتنا ہی امتیاز اور بعد ہے۔ ہندو کلچر کی بنیاد ہی نسل پرستی پر قائم ہے' جس دن بھی ہندوستان میں جمہوریت ان کے مذہب یا کلچر کا حصہ بن گئی' ہندوازم اسی دن بالکل ختم ہو جائے گا۔ ہندوازم اور جمہوریت تو بالکل ایک دوسرے کی متضاد ہیں البتہ فکر انسانی نے جو سب سے پہلا منظّم ضابطۂ حیات وضع کیا ہے وہ کمیونزم کا ہے۔کمیونزم ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو صرف فکر انسانی کا وضع کردہ ہے اس کے علاوہ کوئی ضابطہ حیات فکر انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔

جب 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اس برصغیر پر قبضہ کیا تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ یہاں کے عوام بھی ان کا مذہب عیسائیت اختیار کر لیں چنانچہ اس کوشش کے لئے غول کے غول پادری ہندوستان آنے لگے۔ پادری فنڈز اور پادری Sale ان میں نمایاں تھے' اسی زمانہ میں انگریزی حکومت کے زیر نگرانی ہندوازم' عیسائیت اور اسلام کے مابین مناظرے کرائے جاتے تھے۔اسلام کے دفاع کے لئے ہمارے نہایت ہی واجب الاحترام بزرگ علماء کرام مولانا نانوتوی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی مرحوم حصہ لیتے تھے' لیکن ہمارے اس دور کے ان علماء کا یہ بہت بڑا تسامُح تھا کہ وہ اسلام کو عیسائیت اور ہندوازم کے معیار پر لے آتے تھے' جو خود صرف مذہب کے مدعی تھے وہ اپنے لئے ضابطۂ حیات (دین) کا Claim ہی نہیں کرتے تھے درست بات تو یہ تھی کہ یہ علماء اسلام کو بطور دین کے پیش کرتے اور یہ ثابت کرتے کہ اسلام کا نظام' جمہوریت کے نظام سے بہتر ہے اور جمہوریت کا نظام نہایت ناقص ہے اور اس کے نقص کو نمایاں کرتے لیکن افسوس کہ اس دور کے علماء کے سامنے اسلام بطور دین کے تھا ہی نہیں وہ بھی مذہب کی سطح پر ہی کھڑے تھے اور بس۔

خلافت راشدہ کے بعد سے' اس موجودہ دور تک اسلام بطور مذہب کے ہی چلتا چلا آ رہا ہے۔ تحریک طلوع اسلام' ساری اسلامی دنیا میں' پہلی تحریک ہے جس نے اسلام کو بطور دین کے پیش کیا ہے اور قرآن کریم کو ایک بہترین ضابطۂ حیات ثابت کیا ہے۔ اس تحریک نے ایک طرف کمیونزم کے خلاف اتنا مواد فراہم کیا ہے کہ خود مغرب کے مفکرین نے اتنا مواد تحریر نہیں کیا۔ دوسری طرف اس تحریک نے قرآنی نظام کے اوصاف اور اس کی خوبیاں اس طرح واضح کیں کہ مسلمانوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کا نظام ہی انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہے۔ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَداً (18:27)- تمہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی سوائے اس کے کہ تم پھر قرآن کے قوانین کی پناہ میں آ جاؤ۔

انسانوں کے وضع کردہ نظاموں اور قرآن کریم کے نظام کا سب سے واضح' بنیادی اور نمایاں فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے قائم کردہ نظام میں انسانوں کو قانون وضع کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس نظام میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت چلائے اور حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے جس کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ اس میں پوری امت حکومت میں شامل ہوتی ہے (3:109, 22:41)' اور حاکم و محکوم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ کیونکہ جن حضرات کے ذمہ ان قوانین کو جاری کرنے کا اختیار دیا جائے گا وہ خود سب سے پہلے ان قوانین کی اطاعت کریں گے اور اس کے بعد دوسروں سے اس کی اطاعت کرائیں گے۔ اس نظام میں اطاعت' نظام جاری کرنے والوں کی نہیں ہوگی بلکہ خود اس نظام کی اطاعت مقصود ہوگی۔ سب سے پہلی قرآنی مملکت حضور ﷺ نے مدینہ میں قائم فرمائی تھی' اور آپ خود اس مملکت کے سربراہ تھے۔ اس مملکت میں بھی مقصود حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت نہیں تھی بلکہ اس نظام کی اطاعت کے ذریعے حضور ﷺ کی

اطاعت ہوتی تھی۔ حضورﷺ کے دور سعید میں بھی جو لوگ مدینہ سے دور دراز کے فاصلوں پر مقیم ہوتے تھے تو اس وقت بھی، حضورﷺ کی اپنی موجودگی کے باوجود، وہ حضورﷺ کے مقرر کردہ مقامی حکام کی اطاعت کرتے تھے، اوران کی یہ اطاعت ہی حضورﷺ کی اطاعت قرار پاجاتی تھی، کیونکہ وہ مقامی حکام نظام کی ہی اطاعت کراتے تھے۔ اپنی ذات کی اطاعت نہیں کراتے تھے، کیونکہ جب تک آپ انسان کو انسان پر حکومت چلانے کی اجازت دیں گے، دنیا میں کبھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں سب سے پہلے قرآن کریم نے انسانوں کی اطاعت کے بجائے نظام کی اطاعت کا تصور پیش کیا ہے اور چونکہ اس نظام کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار دیا گیا ہے، اس لئے اس نظام کے شہری اس نظام کی اطاعت مجبوراً نہیں کریں گے، بلکہ دل کی رضامندی کے ساتھ کریں گے۔ اس نظام کے سب سے پہلے سربراہ حضورﷺ نے فرمایا کہ میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں (5:50 ,7:203)-اور میں اس نظام کا اتباع سب سے زیادہ کرتا ہوں (6:163)، یہ نظام ہتھیار استعمال کرکے، یا دیگر ممالک کو ختم کرکے قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ نظام صرف ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی فہرست نہیں دی ہے، ہر وہ عمل جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے کیا جائے وہ عمل صالح ہوتا ہے۔ اگر آپ نے زمین میں ایک بیج بویا ہے تاکہ آپ کچھ عرصہ بعد اس کو ایک تناور درخت کی صورت میں حاصل کریں تو اس بیج کو پانی دینا، دھوپ مہیا کرنا، اس مقصد کے لئے اعمال صالحہ ہوں گے۔ مسلمان تو زندہ ہی صرف اس لئے رہتا ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرے، اس لئے اسلامی نظام قائم کرنے، اس کو چلانے، اور اس کے استحکام و استبقاء کے لئے جس قدر امور سرانجام دیئے جاتے ہیں وہ سب اعمال صالحہ ہوتے ہیں، طاغوتی نظام کے اندر زندگی بسر کرنے کے دوران کوئی عمل بھی عمل صالح نہیں

ہوسکتا، کیونکہ طاغوتی نظام میں تو زندگی بسر کرنا خود سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔

ہم اپنے موجودہ معاشرہ کو (بجا طور پر) رات دن Condemn کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہو جائے۔ اسلامی نظام اس قسم کے لوگ قائم نہیں کر سکتے۔ اسلامی نظام کے قیام کے لئے ضروری اور لازمی ہے کہ پہلے قلب و نگاہ میں تبدیلی آئے (13:11)۔ اسلامی نظام قائم کرنے کی تدابیر اور مراحل کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ: يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (2:151, 62:2)۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے حضور ﷺ سب سے پہلے ان کے سامنے قوانین الٰہیہ پیش فرماتے تھے۔ پھر ان قوانین کا Rationale اور ان کی Why of it، بیان فرماتے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان قوانین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہو اور انہیں ان قوانین پر عمل کرنے کے خوش گوار نتائج کا بخوبی علم ہو سکے۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوتا رہے کہ ان کے اعمال صالحہ کے نتائج برآمد بھی ہو رہے ہیں یا نہیں۔ قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ دنیا میں غلبہ و اقتدار حاصل ہونا بتایا ہے۔ اعمال صالحہ سرانجام دینے والے حضرات، ان کے اس Rationale پر نگاہ رکھیں گے۔ کیونکہ یہ نتیجہ بہت پرکشش ہے، اس لئے وہ اعمال صالحہ بجا لانے میں تساہل نہیں کریں گے لیکن اگر یہ نتیجہ (غلبہ و اقتدار) حاصل نہ ہو رہا ہو، تو ان کا پہلا ردعمل یہ ہوگا کہ وہ دیکھیں گے کہ مطلوبہ نتائج کیوں برآمد نہیں ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو غلبہ و اقتدار کیوں حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ رسول کریم ﷺ کی اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکامات پر عمل کرنے سے انسان کی ساری صلاحیتیں بیدار ہو جائیں (یزکیھم) آپ غور فرمائیں کہ قرآن کریم نے تعلیم کی غرض و غایت کو کس طرح متعینہ الفاظ میں، کیسے حسن و خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ تعلیم کا اولین

مقصد یہ ہے کہ انسان کی ہر خوابیدہ صلاحیت بیدار ہو کر بروئے کار آنے لگے اور یہی نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر شخص کے ساتھ پورا پورا عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم انسانوں کے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے کو عدل قرار نہیں دیتا۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس لئے اس کے نزدیک عدل صرف وہ عدل ہے جو اس کے قوانین کے مطابق حاصل کیا جائے۔ قرآن کریم کے مطابق عدل کرنے میں اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ رشتہ داری کے تعلقات' امیر و غریب کے مراتب یہاں تک کہ اپنی ذات کا خیال بھی نہیں رکھا جائے گا۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (6:152)- جب بھی کوئی بات کرو عدل و انصاف ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ اگر کوئی قوم تمہاری دشمن ہے تو اس سے عدل کرو (5:8) عدل کے علاوہ اس معاشرہ میں احسان بھی ہوگا' جس کا کوئی تصور کسی غیر مسلم معاشرہ میں نہیں ہوسکتا۔

اب جو کتاب آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے' کتاب کے اس تعارف میں اسلامی نظام کی تمام خوبیوں کا تذکرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو افراتفری ہورہی ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے کیونکہ قرآن کریم کے مطابق یہ نظام ہی **انسانیت کی آخری پناہ گاہ** ہے (18:27)-

زیر نظر کتاب خواجہ ازہر عباس صاحب کے ان مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہوتے رہے ہیں۔ قارئین طلوع اسلام کے اصرار پر ان کو کتابی شکل میں محفوظ کیا جارہا ہے تاکہ یہ آئندہ نسلوں کے کام آسکے۔ خواجہ ازہر عباس قرآنی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں' اس لئے ان کے تعارف اور ان کی قرآنی

خدمات کے متعلق کچھ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس سے پیشتر ان کی چار کتابیں قرآنی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی زندگی سے ہی تحریک طلوع اسلام سے وابستہ چلے آ رہے ہیں۔اس لئے انہیں علامہ پرویز مرحوم سے بھی استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے۔خواجہ ازہر عباس کے بیٹے خواجہ ضیاء عباس ایک مشہور بینکر ہیں۔قرآنی احباب ان کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنے والد کے لئے ہر طرح آسائش مہیا کر رکھی ہے تاکہ وہ اپنا سارا وقت قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔

جناب سلیم اختر صاحب کا بھی بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت اپنی نگرانی میں کرائی۔جناب شعیب حسین صاحب کا بھی شکریہ کہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے علاوہ اس کی پروف ریڈنگ بھی کی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر رضیہ عباس
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اور ہمارا مذہبی طبقہ نماز کو مسجدوں میں باجماعت پڑھنے پر بہت اصرار کرتا ہے ان کا خیال ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے چالیس گنا ثواب ملتا ہے۔اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس گھر میں مرد اذان کے وقت اپنے گھر میں ہی رہیں اور نماز باجماعت کے لئے مسجد کی طرف نہ دوڑیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس گھر کو آگ لگا دوں۔ یہ روایت نماز باجماعت کی اہمیت کے لئے پیش کی جاتی ہے لیکن جن حضرات کے سامنے قرآن کریم ہے انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ دین کی اساس انفرادی پرستش کے بجائے اجتماعی اطاعت پر ہوتی ہے۔ساری دنیا کے مذاہب کا انحصار ''خدا پرستی اور نیک عملی'' پر ہوتا ہے۔لیکن اسلام دین کی دعوت دیتا ہے اور صرف دینی کام ہی نیک اعمال ہوتے ہیں۔ دین کے قیام کے بغیر ''نیک عملی'' سرانجام دینا' اپنے کو اور دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے مرادف ہے۔ یہ غلط فہمی صرف اس وقت دور ہوسکتی ہے جب دین اور مذہب کا فرق واضح طور پر آپ کے سامنے آجائے۔

مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہوسکتی۔کیونکہ یہ ایک Subjective Matter ہے۔اس کا انسان کے اندرونی جذبات سے تعلق ہوتا ہے مسلمان حکماء کے علاوہ مغربی مفکرین نے بھی مذہب کی Definition بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن کسی دو مفکرین کی

تعریف Definition میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ان کے اقتباسات اس لئے نہیں دیئے جاتے کہ اس سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور مقصد کوئی بھی حاصل نہیں ہوگا۔عموماً مذہب سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے الگ کر کے' اس زندگی کو سیاسی لیڈروں کے سپرد کر دے اور آخرت کی زندگی کو پیشوائیت کے حوالہ کر دے۔یعنی خدا کی دنیا الگ اور قیصر کی دنیا الگ قیصر کو اس کا ٹیکس ادا کر دیں اور مذہبی پیشواؤں کو ان کا خراج۔حکومت وقت کی قانون شکنی جرم Crime ہوتی ہے جبکہ مذہب کے احکامات کے خلاف چلنا گناہ Sin کہلاتا ہے۔Crime یعنی جرم کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے جبکہ گناہ (Sin) کی سزا آخرت میں ملے گی۔اسی طرح حکومت وقت کے حکمرانوں کی اطاعت کے ثمرات بھی اسی دنیا میں مل جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی جزا اور اس کے انعامات میں جنت مل جاتی ہے۔یہ وہ تصور زندگی Concept of Life ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب انہیں تصورات پر قائم ہیں۔مذہب کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہوتا۔اس کا تعلق صرف اور صرف مرنے کے بعد کی دنیا سے ہوتا ہے۔اسی لئے مذہب کی صداقت اور بطلان کا کوئی معیار اس دنیا میں نہیں ہوتا۔کوئی شخص اپنے مذہب کو صحیح اور دوسروں کے مذہب کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔کیونکہ جو ضابطۂ حیات صرف آخرت کے متعلق ہو اور اس موجودہ Visible دنیا کی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو' اس صورت میں آپ اس کی صحت وسقم کا کوئی معیار قائم ہی نہیں کر سکتے۔واضح رہے کہ قرآن کریم میں مذہب کا لفظ کہیں استعمال ہی نہیں ہوا ہے۔

مذہب کے بالکل برعکس اور اس کے بالکل برخلاف دین کا تعلق براہ راست اس دنیا سے ہوتا ہے۔انسانوں کے باہمی معاملات وتنازعات کو وحی الٰہی کے مطابق طے کرنا' دین ہوتا ہے۔دین میں اطاعت کا مرجع اسی دنیا میں ہوتا ہے۔جو زندہ اتھارٹی کی شکل میں دینی نظام کو متشکل اور اس کو متمکن کرتا ہے۔دین میں جرم اور گناہ الگ الگ نہیں ہوتے' اس میں جرم اور گناہ

کا بدلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ دنیا کے وہ تمام امور جن کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے کیا جائے وہ تمام امور دینی بن جاتے ہیں۔ اگر کسی قیمتی پلاٹ پر دو فریقوں کا تنازعہ ہے۔ اسلامی حکومت اس تنازعہ کا فیصلہ ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف کر دیتی ہے۔ فریقین کا یہ جھگڑا خالص دنیاوی جھگڑا ہے لیکن جب اسلامی حکومت اس کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے کر دیتی ہے تو یہ فیصلہ دینی بن جاتا ہے اور اسکی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت بن جاتی ہے۔ ہماری معاشرت میں Sex کراہیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور بدچلنی یقیناً ایک مذموم فعل ہے لیکن اسی Sex کو جب نکاح کی حدود میں لے آئیں تو یہ وحی الٰہی کے احکامات کے مطابق ہونے کی وجہ سے دینی کام بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلافات واقع ہو جائیں تو حکومت کو لازم ہے کہ ان دونوں کی طرف سے حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا (4:35)۔ ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے مقرر کر دے۔ اسلامی حکومت ان دونوں ثالثوں سے پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ پھر یہ ثالث جو بھی فیصلہ دے دیں' ان کا فیصلہ دینی ہوگا اور میاں بیوی پر اس کی اطاعت لازمی ہوگی' اور یہ اطاعت' اللہ ورسول کی اطاعت کے مرادف ہوگی۔

جب دو مسلمان گروہوں یا حکومتوں میں تنازعہ واقع ہو جائے تو قرآنی ہدایت کے مطابق ان میں صلح کرانا ضروری ہے۔ وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (49:9)۔ اور اگر مومنین میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو۔ یہ قرآنی حکم ہے۔ اس پر عمل کرتے ہوئے دونوں گروہوں کو اس فیصلہ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ فیصلہ وحی الٰہی کے حکم کے مطابق ہوگا' اس لئے یہ خالص دنیاوی معاملہ دینی امور میں شمار ہوگا اور اس کی اطاعت اللہ کی عبادت ہوگی۔ گذارش صرف یہ کرنی ہے کہ مذہب کے برخلاف دین کا تعلق اس زندگی سے ہوتا ہے۔ دین ساری زندگی پر حاوی اور محیط ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی معاملہ دین کی

حدود سے باہر نہیں ہوسکتا۔

جو وعدے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کئے ہیں وہ سب دین کے قیام سے وابستہ ہیں۔ دین پر عمل کرنے سے وہ وعدے پورے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہر شخص کو رزق فراہم کرتا ہے۔ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِيُ الأَرُضِ إِلاَّ عَلَى اللّهِ رِزُقُهَا (11:6)- اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔ نیز فرمایا: نَّحنُ نَرُزُقُكُمُ وَإِيَّاهُمُ (6:151)- ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتے ہیں۔ اپنے بندوں سے کئے ہوئے یہ وعدے اس نظام سے پورے ہوتے ہیں۔

(1) یہاں یہ بات واضح کر دینا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ جس رزق کی تقسیم قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی وہ رزق کھانا حرام ہوتا ہے قرآن کریم نے جب یہ فرمایا: کہ جو لوگ قانون خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر' فاسق' ظالم ہوتے ہیں۔ تو ان فیصلوں میں معاشی فیصلے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو لوگ رزق کی تقسیم ان فیصلوں کے مطابق نہیں کرتے وہ ان تینوں صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی خوب ذہن نشین رکھیں کہ اگر دنیا کے تمام مفکرین و دانشور جمع ہو کر بھی ایسا معاشی نظام تشکیل دینا چاہیں جس میں معاشی نظام حیات مستقل اقدار سماوی کے مطابق ہو تو وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات ان کے بس کی ہے ہی نہیں۔ یہ نظام حیات صرف نظام ربوبیت کا ہی ہے جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ جس کی نظیر کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی اور یہی قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظام باطل پر قائم ہوگا۔ جیسا کہ آج کل ساری دنیا میں معاشی نظام ربوٰ پر قائم ہے۔ اس موجودہ معاشی نظام کا حاصل کردہ ایک ایک لقمہ ہمارے لئے حرام ہے۔ خواہ ہم اس کا احساس کریں یا نہ کریں' یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو' لیکن اس سے چشم پوشی کسی طرح بھی نہیں کی جا سکتی۔

(2) رزق کی فراہمی کے وعدے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں

صرف مسلمان ہی غالب رہیں گے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (63:8)-اس آیہ کریمہ میں لام مصر لگا کر واضح کر دیا ہے کہ عزت صرف اللہ' اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ نیز فرمایا: وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً (4:141)-اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب رہنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کے یہ قرآنی وعدے' صرف قرآنی نظام پر عمل کرنے سے پورے ہوتے ہیں۔

(3) اسی طرح انسانوں کی دعائیں بھی اللہ کے نظام کے قیام سے پوری ہوتی ہیں۔ مکہ کے مظلوم مسلمانوں پر جب کفار کا ظلم و تشدد بڑھتا چلا گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے رہنے والے اس قسم کے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی نگران اور کوئی مددگار بھیج دے (4:75)۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ ان مظلوموں کی براہ راست مدد کر کے' انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے مدینہ کی اسلامی حکومت سے کہا کہ اے جماعت مومنین تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ تم سن نہیں رہے ہو کہ مکہ کے کمزور مرد و عورتیں اور بچے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے۔ اس آیہ کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکہ والے اگرچہ خدا کو پکار رہے تھے لیکن خدا براہ راست ان کی دعا کو پورا نہیں کرتا' بلکہ ان کی دعا اسلامی حکومت کی معرفت پوری کرتا ہے۔

اس بارے میں حضرت عمرؓ کا ایک قول بھی بہت پُرمعنی اور چشم کشا ہے۔ اُن جناب نے خلافت کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں یہاں اس جگہ اس لئے بیٹھا ہوں تاکہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک جانے سے روک دوں۔ کیونکہ تمہاری ہر دعا میرے خلاف ایک شکایت ہے جس کا پورا کرنا میرا فریضہ ہے۔

(4) اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بھی اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا: إِن

تَنصُرُوا اللّٰہَ یَنصُرکُمْ وَیُثَبِّتْ أَقْدَامَکُمْ (47:7)-(ترجمہ)اگر تم خدا کے دین کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔نصرتِ خداوندی اور تائیدایزدی کے لئے یہاں شرط لگادی گئی ہے کہ اگر تم نظام خداوندی کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔اللہ تعالیٰ کی تائیداور نصرت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اعانت کرنا ہے۔

(5) اس نظام کے شرف ومجداوراس کے عالی مقام کا اندازہ اس بات سے فرمائیں کہ جو امور اسلامی حکومت سرانجام دیتی ہے' اللہ تعالیٰ ان امور کو اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورﷺ کو جماعتِ مومنین سے خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد (9:112) کی تجدید کرنی پڑی تو مجاہدین اپنا ہاتھ حضورﷺ کے ہاتھ پر رکھ کر اس عہد کی توثیق کرتے تھے۔ارشاد ہوا: إِنَّ الَّذِینَ یُبَایِعُونَکَ إِنَّمَا یُبَایِعُونَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ أَیْدِیھِمْ -(48:10)

(ترجمہ) بے شک جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ لوگ خدا سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ انکے ہاتھ پر ہے۔ یہاں خدا نے حضورﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔اسی طرح جنگِ بدر کے بارے میں ارشاد ہوا: ''ان کے خلاف جو تیر تمہاری کمانوں سے نکل رہے تھے' درحقیقت وہ تیر خدا خود چلا رہا تھا'' (8:17) ۔نیز فرمایا کہ: تم انہیں قتل نہیں کررہے تھے' انہیں خدا خود قتل کررہا تھا۔قرآن کریم کی ان آیات سے اسلامی نظام کی عظمت اوراس کی شانِ عالی کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ مثالیں جناب کی خدمت عالی میں اس بات کو واضح کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ دین کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے اور وہ ہماری ساری زندگی پر حاوی اور محیط ہوتا ہے۔اس دین کے درست اور غلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ اگر اس نظام سے اللہ کے وعدے پورے ہورہے ہیں تو یہ نظام درست' صحیح اور حق ہے' اور اگر اس کے یہ وعدے پورے نہیں ہورہے ہے تو یہ نظام درست نہیں

ہے۔ نظام کے نتائج سے اس کے درست یا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے‘ جبکہ مذہب کی صحت و سقم کا کوئی معیار اس دنیا میں نہیں ہوتا۔

یہاں تک ''خدا پرستی'' کے متعلق گذارشات و معروضات پیشِ خدمتِ عالی کی گئی ہیں۔ اب نیک عملی کے متعلق عرض ہے کہ نیک عملی بھی صرف دین میں ہی کی جاسکتی ہے اور اس نیک عملی کے نتائج بھی صرف دین میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے لئے آپ چند مثلہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اگر بالفرض کوئی آفیسر رشوت لیتا ہے اور وہ اپنے ایک دیانتدار کلرک سے خائف ہے اور اس خوف کی وجہ سے وہ اس کلرک کو کسی طرح نوکری سے برخواست کرا دیتا ہے لیکن اس کے بعد وہ کلرک پر رحم کھا کر کبھی کبھی اس کی مالی مدد کرتا رہتا ہے‘ تو کیا اس کی یہ مالی مدد 'نیک عملی' شمار کی جا سکتی ہے۔

(2) ہمارے اس ظالم معاشرے میں کچھ خواتین معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ناجائز طریقوں سے مال کماتی ہیں۔ یہ معاشرہ کا سب سے زیادہ ستم رسیدہ اور مظلوم طبقہ ہوتا ہے۔ اگرچہ راقم سطور کا اس کوچہ سے کبھی گذر نہیں ہوا‘ اس لئے براہ راست ان کی مظلومیت کا مشاہدہ نہیں کیا لیکن اردو زبان میں شورش کاشمیری کی کتاب ''اس بازار میں'' پڑھ کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں البتہ انگریزی زبان میں اس طبقہ کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔ جس سے ان کی مظلومیت کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے‘ اور اس طبقہ پر بہت رحم اور ترس آتا ہے۔ ان میں بھی خدا پرستی کے جذبات موجود ہوتے ہیں کیونکہ یہ طبقہ دوسرے طبقات سے زیادہ توہم پرست ہوتا ہے‘ اس لئے محرم کے دوران یہ اپنے سب کام ملتوی کر دیتے ہیں اور محرم میں نذر نیاز دیتے ہیں۔ یہ نیاز و نذر ان کی اس آمدنی سے ہوتی ہے‘ جو وہ چرخہ کات کر کماتی ہیں‘ اور ان کے نزدیک بالکل حلال ہوتی ہے کیونکہ ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کی دوسری آمدنی جائز نہیں ہے‘ ان کی اس تمام مظلومیت کے

باوجود کیا اس طرح کی نذر و نیاز ''نیک عملی'' گردانی جاسکتی ہے' اسی طرح بہت سے رشوت خور افسران' رشوت لینے کے باوجود مزاروں اور خانقاہوں پر دیگیں اور چادریں چڑھاتے ہیں کیا یہ رسوم نیک عملی سمجھی جاسکتی ہیں۔

(3) ایک بادشاہ ساری عمر حکومت کرتا ہے جبکہ ملوکیت خود ایک باطل نظام ہے اور قرآن کے خلاف ہے۔ وہ اس باطل نظام کو قائم کرنے میں لوگوں کو قتل بھی کراتا ہے اور عوام الناس کے حقوق بھی پامال کرتا ہے لیکن وہ خود اپنی روزی قرآن کریم کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھنے سے کماتا اور اس روزی پر گذارا کرتا ہے' کیا اس کا اس طرح کی روزی کمانا' اس کے جرائم کے ارتکاب کے مقابلہ میں ''نیک عملی'' شمار ہوسکتا ہے۔

(4) سر گنگا رام نے لاہور میں گنگا رام ہسپتال قائم کیا جس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے' لیکن یہی سر گنگا رام ساری عمر باطل نظام کا پرزہ بنے رہے اور صحیح اور درست نظام کے قیام میں مانع و حارج رہے وہ نظام خود ساری دنیا کے مریضوں کا علاج کرنا اپنا فرض سمجھتا۔ اس نظام کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ہسپتال کا قیام ''نیک عملی'' شمار نہیں ہوسکتا۔

(5) ہمارے علمائے کرام ساری عمر مذہبی رسوم سے وابستہ رہتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ پر قربانی کرتے ہیں۔ ربیع الاول کے مہینے میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ نعتوں کی محفلیں سجاتے ہیں' بائیس رجب کے کونڈے کرتے ہیں۔ شبرات میں حلوے تقسیم کرتے ہیں۔ سارے سال وعظ و تبلیغ کے جلسوں میں تقاریر کرتے' ہزاروں روپوں کی رقوم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے قیام کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان کی ساری مذہبی کدوکاوش میزانِ خداوندی میں ایک پرِکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 1857ء کے غدر کے بعد انگریزی حکومت کی نگرانی میں مختلف مذاہب کے علماء کے مابین مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں تشدد بالکل نہیں تھا اور

مناظروں کا انعقاد بھی حکومت کی زیرِنگرانی ہوا کرتا تھا۔اس لئے تمام فریق حد درجہ علمی معیار قائم رکھتے تھے، ہندو، عیسائی، آریہ، یہ تینوں مذاہب ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے معترف ہیں کہ وہ صرف مذہب ہیں، دین نہیں ہیں۔ ہمارے علماء کرام ان سے مذہب کے Lev el پر مناظرے کرتے تھے، یہ ہمارے علماء کرام کوئی معمولی عالم نہیں تھے، اس وقت کے بلند پایہ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی صاحب، مولوی رحمت اللہ کیرانوی صاحب اور دیگر اسی اعلیٰ مقام کے علماء اس میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے یہ مناظرے اب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ ان مناظروں کی روئیداد مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ یہ تمام علماء کرام اسلام کو مذہب کی حیثیت سے ہی پیش کرتے تھے۔ اگر ہمارے ان علماء کرام کے سامنے اسلام دین ہوتا تو یہ دعویٰ کرتے کہ اسلام کا نظام، جمہوریت کے نظام سے بہتر ہے اور اسلام کی برتری اور فوقیت بطور ضابطۂ حیات کے ثابت کرتے۔ کہ اسلام کس قدر مثالی معاشرہ قائم کرتا ہے۔لیکن ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ اب اس دور میں بھی Interf aith Dialogue ہو رہے ہیں۔ ان میں بھی اسلام کو مذہب کی حیثیت سے ہی پیش کیا جاتا ہے۔

اب پاکستان کے قیام کے بعد بھی ہماری پیشوائیت کے نظریہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تحریک طلوع اسلام کے زیرِاثر یہ حضرات بھی دین کا لفظ دہرانے لگے ہیں اور سلامی حکومت کا مطالبہ بھی کرنے لگے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ان کے مدارس میں وہی نصاب پڑھایا جاتا ہے جو مذہب کا داعی ہے، اس لئے ان کے ذہن میں دین کا واضح تصور نہیں آسکتا۔ وہ عجب کشمکش اور گومگو کی حالت میں مبتلا ہیں۔ تحریک طلوع اسلام کا پیش کردہ نظامِ حیات انہیں اپیل کرتا ہے، لیکن ان کا ذہن اس کے خلاف بنا ہوا ہے۔ اس بات کی وضاحت ان کے عمل سے ہوتی ہے۔ یہ ہمارے علماء کرام انفرادی صلوٰۃ کے قائل ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا ہماری باجماعت نماز بھی انفرادی نماز ہی ہوتی ہے۔ انفرادی صلوٰۃ اور اجتماعی صلوٰۃ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں صلوٰۃ بالکل

دو متضاد تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انفرادی صلوٰۃ کے معنے ذاتی پرستش کے ہوتے ہیں جبکہ اجتماعی صلوٰۃ کے معنے یہ ہیں کہ فرد کی ذات کی نشوونما اور اس کی ذات کا ارتقاء صرف معاشرے کے اندر ہوسکتا ہے۔ بغیر اسلامی معاشرے کی انفرادی طور پر ذات کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم کی اطاعت صرف معاشرے کے اندر ہی ہوسکتی ہے۔ انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ انفرادی صلوٰۃ اور اجتماعی صلوٰۃ اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے متضاد تصورات پر مبنی ہیں قرآن کریم اجتماعی صلوٰۃ کا داعی ہے۔ اس میں انفرادی صلوٰۃ (انفرادی پرستش) کا تصور نہیں ملتا۔ یہ ہمارے علماء کرام جب نماز کے پابند نظر آتے ہیں تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے سامنے اجتماعی صلوٰۃ یا اسلامی نظام کا تصور نہیں ہوتا۔

البتہ یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما صرف معاشرے میں ہوتی ہے۔ یا اجتماعی صلوٰۃ سے ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں عبادت الٰہی بھی انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی' یہ سمجھنے کی بات ہے۔ انسانی ذات کی تربیت مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور مستقل اقدار پر عمل معاشرے میں ہوسکتا ہے' گوشوں اور زاویوں میں ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ فرض کیجئے ایک آفیسر کو اپنے بیٹے کو کالج میں داخلہ دلانا ہے' لیکن اس کے پاس بالکل کوئی رقم نہیں ہے۔ وہ بالکل مجبور ہے' اسی دوران کوئی سائل اس کے پاس آیا اور اس نے اس کو اپنے کام کرانے کے عوض کچھ رقم پیش کردی۔ اب یہاں ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie آپڑتی ہے۔ اگر اس آفیسر نے رشوت لے لی اور اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرادیا' تو اس کی ذات میں اضمحلال آجائے گا لیکن اگر اس نے اپنا ذاتی مفاد پیش نگاہ نہیں رکھا اور رشوت لینے کے بجائے مستقل قدر پر عمل کیا' تو اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ ذات کی نشوونما معاشرہ میں ہوتی ہے۔ گوشوں اور زاویوں میں ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں تصادم ہی پیش نہیں آسکتا۔

اس کے برخلاف اگر آپ کسی باطل نظام میں رہ رہے ہیں۔ اس میں بھی آپ کی

ذات کی نشو ونما نہیں ہوسکتی۔ باطل نظام میں آپ لاکھ چاہیں کہ آپ ربوٰ سے بچ جائیں۔ آپ ربوٰ سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ آپ رزق کی غیر خداوندی تقسیم سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ ربوٰ کھانا' اللہ ورسول سے جنگ کرنا اور اللہ سے بغاوت کرنے کے مرادف ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول سے جنگ آزما ہے' اس کی تربیتِ ذات کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی۔ اس نظام کا باطل پر استوار ہونا اور آپ کا اس کے اندر بخوشی رہنا اور جگہ جگہ' قدم قدم پر مستقل اقدار کی خلاف ورزی کرنا' خود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس میں ذات کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اس میں عبادت الٰہی کرنے کا تصور ہی بے سود ہے۔ اس میں اجتماعی صلوٰۃ کا قیام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں صرف نمازیں ہی ادا ہوسکتی ہیں اور اس میں ''خدا پرستی اور نیک عملی'' ہی ہوسکتی ہے۔ اس میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جو اصل میں نیکی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے دین کو کلمۃً طیبۃً سے مثال دی ہے (14:24)' خوش گوار نظریۂ زندگی' بہترین ضابطۂ حیات' جس کی جڑیں مستحکم ہوں اور جس کی شاخیں فضا میں جھوم رہی ہوں۔ اس کلمۂ طیبہ (اسلامی حکومت) کے متعلق فرمایا کہ: **اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡـكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ** (35:10)- اور اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عمل صالح اس کو سہارا دیتا ہے۔ اس کلمۂ طیبہ (یعنی اسلامی نظام) کو جو چیز سہارا دیتی ہے اور رفعت بخشتی ہے وہ عمل صالح ہوتا ہے عمل صالح کے بغیر یہ کلمہ طیبہ (دین) مرجھا کے رہ جاتا ہے۔ گویا دین الٰہی کی مثال انگور کی بیل کی طرح ہے جو اگرچہ خود بھی ثمر بار ہے لیکن اس کی شادابی اور ثمر باری میں عمل صالح سے اضافہ ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اس کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ عمل جو کلمہ طیبہ (دین) کو سہارا دے اور اس کو بلند کرے' وہ عملِ صالح ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے خود اس آیت میں عمل صالح کی وضاحت فرمادی ہے کہ عمل صالح وہ عمل ہوتا ہے جو دین کی تقویت اور اس کے سہارے کا باعث بنتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ باطل نظام کے احکامات کی اطاعت عبادت نہیں ہوتی جبکہ اسلامی حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہوتی ہے۔ اسے آپ ایک آسان مثال سے سمجھیں۔ باطل نظام میں اگر آپ ٹریفک سگنل کو عبور نہیں کرتے' تو آپ حکومت کی اطاعت تو کرتے ہوتے ہیں' لیکن اللہ و رسول کے ہاں اس کا کوئی درجہ نہیں ہے جبکہ آپ نے اگر اسلامی حکومت میں سرخ سگنل کو عبور نہیں کیا تو آپ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہوتی ہے۔ اب اس مثال کو ایسی ساری زندگی پر محیط کر لیں تو اس طرح اسلامی حکومت میں آپ رات دن عبادت الٰہی میں مصروف ہوں گے اس طرح اسلامی حکومت میں آپ کی ذات کی تربیت اور نشوونما ہر وقت از خود ہوتی رہتی ہے جبکہ باطل نظام میں ایسا نہیں ہوتا' اس میں اس کا بالکل برعکس اور برخلاف ہوتا ہے کہ اس میں آپ کی ذات از خود مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ چند سطور؛ جن کو مثالوں سے حد درجہ آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ ان سے دین کے قیام کی ضرورت واضح ہو جائے اور اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے کہ ہمارے مذہبی امور دینی امور کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انبیاء کرامؑ کے اقوال واعمال خوداختیاری ہوتے تھے

اس کائنات میں ہر چیز قانون خداوندی کے مطابق عمل کررہی ہے اور کسی چیز کو بھی اختیاروارادہ کی صلاحیت عطانہیں کی گئی ہے۔اس بھری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو اختیارواراداہ اورغوروفکر کی صلاحیت سے نوازا ہے۔دیگرمخلوقات پرانسان کا شرف ومجد صرف اسی وجہ سے ہے۔اس میں اختیاروارادہ اورغوروفکر کی صلاحیت موجود ہے۔جسے یہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے‘ قرآن کریم کی تعلیم کا مرکزی نقطہ ہی قانون مکافات عمل ہے‘یعنی یہ کہ انسان اپنے ہرعمل کاذمہ دار ہے۔اگراس کواپنے اعمال پراختیاروارادہ حاصل نہ ہو‘تواس کے لئے جزاوسزا کا تصور ہی پیدانہیں ہوتا۔اور پھراس تصور کی رو سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشدو ہدایت‘انبیاءکرام کی بعثت‘اوروحی الٰہی کا نازل کرنا‘ سب بے معنی ہوکررہ جاتے ہیں جوشخص بھی قرآن کریم پرایمان لاتا ہےاسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اعمال کا خودذمہ دار ہےاوراسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ایک ایک عمل کاجواب دہ ہوناہوگا۔

قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے برخلاف ہم مسلمانوں میں ایک ایساعقیدہ چلاآرہا ہے جوقرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔اوراس عقیدہ کی رو سے یہ خیال کیاجاتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کے اقوال واعمال خوداختیاری نہیں ہوتے۔آپ کواس بات کے پڑھنے سے انتہائی تعجب ہوگا کہ جب انسان کی وجۂ فضیلت ہی یہ اختیاروارادہ ہے‘توانبیاءکرام کواس شرف سے کس طرح

محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا تعجب اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ آپ خود مستند علماء کرام کی تحریر ملاحظہ فرمالیں، صرف اس طرح آپ کی حیرت از خود دور ہو جائے گی۔ اگر چہ ہمارے ہر فرقہ کی پیشوائیت، اس مسئلہ میں پوری طرح متفق ہے، لیکن ان کے اس اتفاق کے باوجود یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس بارے میں ان کا اتفاق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ جس کے دلائل آپ کی خدمت عالی میں پیش کئے جائیں گے۔ پہلے آپ اس نظریہ کے متعلق چند مستند علماء کرام کی تحریرات ملاحظہ فرمالیں۔

(1) حضرتِ اقدس جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، علماء کرام میں ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہونے کے علاوہ وہ ''الرشید'' اور ''القاسم'' کے مدیر بھی رہے تھے۔ اس کے بعد وہ طویل مدت تک جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن (بھارت) سے منسلک رہے کئی بلند پایہ کتب کے مصنف تھے۔ ان کی ایک معروف کتاب ''تدوین حدیث''۔ علماء کرام میں بے مثال کتاب شمار ہوتی ہے اور ''منکرینِ حدیث'' کے لئے تریاق کے مانند گردانی جاتی ہے۔ یہ کتاب 624 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحہ 371 پر حضرت اقدس نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو بغور پڑھئے (اور سر دھنئے)۔ آیۂ کریمہ **وما ینطق عن الھویٰ** کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ ''یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعاً اَلْھَویٰ (پیغمبر کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ قرآن نطق ہو یا غیر قرآن نطق پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔'' تین سطروں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے ''اور ان کی ہر زبان کا ہر بول ذاتی فکر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ سب وحی ہے۔''

(2) اسی آیۂ کریمہ کے ذیل میں حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں: ''یعنی کوئی کلام تو کیا ایک حرف بھی آپ کے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ بلکہ

آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں وحی متلو کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہا جاتا ہے۔ (صفحہ 698)۔

(3) حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری' بریلوی فرقہ کے سرخیل و سرتاج شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تفسیر ان کے ہر فرقہ میں نہایت بلند پایہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں رقم فرماتے ہیں:

''بعض علماء نے ان آیات کے پیش نظر حضورﷺ کے اجتہاد کا انکار کیا ہے یعنی حضورﷺ کوئی بات اپنے اجتہاد سے نہیں کہتے بلکہ جو ارشاد ہوتا ہے وہ وحی الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔'' (جلد پنجم' ص 11)۔

(4) تفسیر ابن کثیر میں ہے:

''آپ کا کوئی قول' کوئی فرمان' اپنے نفس کی خواہش اور ذاتی غرض سے نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کی تبلیغ کا آپ کو حکم الٰہی ہوتا ہے آپ اسے ہی زبان سے نکالتے ہیں۔ جو وہاں سے کہا جائے وہ ہی آپ کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ کمی بیشی' زیادتی نقصان سے آپ کا کلام پاک ہوتا ہے۔'' (جلد پنجم' ص 179)۔

آپ نے مستند علماء کی تحریرات اور مستند تفاسیر ملاحظہ فرمائیں جن سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے علماء کرام حضورﷺ کے تمام اقوال و افعال کو من جانب اللہ خیال فرماتے ہیں۔ جن میں حضورﷺ کی ذاتی فکر اور حضورﷺ کے ذاتی اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اور علماء کرام کی یہ تمام کوششیں صرف اس وجہ سے ہیں کہ کسی طرح احادیث کو وحی خفی قرار دے دیا جائے۔ لیکن قرآن کریم تمام انبیاء کرام کے افعال واقوال کو خود اختیاری قرار دیتا ہے جس کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں:

1- قرآنِ کریم میں ارشادِ عالی ہے:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِيْنَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (7:6)-

پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے (ہر چیز کا)

سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔

آیہ کریمہ میں سوال کرنے، یعنی باز پرس' کا لفظ' پیغمبروں اور امتیوں دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ دونوں سے جواب دہی کے لئے ایک ہی لفظ آیا ہے اور جہاں تک جواب دہی کا تعلق ہے رسول اور غیر رسول سب برابر ہیں۔ انبیاء کرام کے افعال و اقوال زیرِ محاسبہ اور باز پرس کے تابع ہیں تو وہ وحی الٰہی کیسے ہوسکتے ہیں۔ ان افعال و اقوال کی باز پرس جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ وہ انبیاء کرام کے خود اختیاری افعال واقوال ہوں اور ان کے ذاتی غور وفکر کے نتائج ہوں۔

2- قرآنِ کریم میں ارشادِ عالی ہے:

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ (43:44)-

اور یہ قرآن تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے قانون ہے اور عنقریب

ہی تم سے باز پرس کی جائے گی۔

آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح تمہاری قوم سے باز پرس ہوگی، اسی طرح تمہارے سے بھی جواب دہی ہوگی۔ آیہ کریمہ میں لک کے لفظ کا اضافہ کرکے، حضور ﷺ کو اس جوابدہی میں شامل کرلیا گیا ہے کہ خود حضور ﷺ سے بھی ان کے افعال واقوال کی جوابدہی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود حضور ﷺ کے افعال خود اختیاری تھے۔

3- قرآنِ کریم میں ارشادِ عالی ہے:

قُلْ أَطِيْعُوا اللَّهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ (24:54)-

اے رسول تم کہہ دو کہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اس پر بھی اگر تم سرتابی کروگے تو رسول پر اتنا ہی واجب ہے جس کے وہ ذمہ دار کئے گئے ہیں اور جس کے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو وہ تم پر واجب ہے۔

آیہ کریمہ میں حضورﷺ کو اپنے فرائض کے لئے اسی طرح ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جس طرح دوسرے لوگوں کو ان کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ حضورﷺ کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کے بارے میں ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے:

''تمہارے معاملہ میں رسول کے اوپر صرف اتنی ذمہ داری ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر ڈالی گئی ہے''۔ (جلد 5' ص 425)۔

تفسیر نمونہ میں ہے:

''اگر تم منہ موڑ لو اور منحرف ہو جاؤ تو رسول اپنے اعمال کا جواب دہ ہے (اور اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے) اور تم بھی اپنے اعمال کے جواب دہ ہو۔ (جلد 8' ص 286)۔

حضورﷺ کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کے بارے میں شیخ الاسلام جناب عثمانی نے تحریر فرمایا:

''یعنی پیغمبر پر خدا کی طرف سے تبلیغ کا بوجھ رکھا گیا ہے۔ سو اس نے پوری طرح ادا کر دیا اور تم پر جو بوجھ ڈالا گیا ہے وہ تصدیق اور قبولِ حق کا ہے۔''

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ یہاں پر خود علماء کرام کس طرح حضورﷺ کو ان کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔

4- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

مَّا أَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَکَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن

نَّفُسِکَ (4:79)-

جب تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور تم کو جو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ خود تمہاری وجہ سے ہے۔

آیہ کریمہ میں واضح طور پر حضورﷺ کو تکلیف پہنچنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ رسول ایک بشر ہوتا ہے اس کی بشری عقل کو مدد دینے کے لئے وحی الٰہی نازل ہوتی تھی۔ لوگوں کو بھی اس وحی الٰہی سے وہی فائدہ ہوتا تھا جو رسول کو ہوتا تھا۔ ان کی بشری عقل کو وحی الٰہی سے تائید ہوتی تھی۔ بس وحی کے علاوہ رسولوں کا کام بشری عقل سے اجتہاد کرنے کا تھا اور اس میں اسی طرح غلطی کا امکان تھا جس طرح دوسرے مجتہدین کے اجتہاد میں ہوتا ہے۔

5- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡبِکَ (47:19, 40:59)-

اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم دن میں سو بار استغفار فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''حضرت رسول اللہﷺ دن میں سوسو بار استغفار کرتے'' ہر بندہ کی تقصیر اس کے درجہ کے موافق ہے اس لئے ہر کسی کو استغفار ضروری ہے۔ حضرت شیخ الہند' ص 629۔

اوپر وہ آیات درج کی گئی ہیں جن سے حضورﷺ کے اعمال کو خود اختیاری ثابت کیا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی آیات پیش خدمت عالی کی جاسکتی ہیں' لیکن مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے ان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو مزید آیات درکار ہوں وہ کتاب '' قرآن فہمی کے قرآنی اصول' ' ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں وہ آیات درج کی گئی ہیں۔

ہمارے علماء کرام حضورﷺ کے نطق کو مطلقاً وحی صرف اس لئے قرار دیتے ہیں کہ اس سے ان کے نزدیک حدیث وحی خفی ثابت ہو جاتی ہے' لیکن اس طرح حضورﷺ کے اقوال و

افعال ان کے خود اختیاری نہیں رہتے ۔اس مضمون میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ حضورﷺ کے افعال واقوال ان کے خود اختیاری تھے' اس کے ثبوت کے لئے چند عقلی دلائل بھی پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

1- جب مشرکین مکہ حضورﷺ کی دعوت کو برابر جھٹلاتے رہے تو حضورﷺ نے اتمام حجت کے طور پر ان سے کہا:

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَى وَفُرَادَى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (34:46)-

اے رسول تم ان سے کہہ دو کہ تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ تم ایک ایک دو دو کھڑے ہو جاؤ اور اچھی طرح غور کرو۔

جب حضورﷺ اپنے مخالفین کو غور وفکر کی دعوت دے رہے تھے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خود غور وفکر نہ فرماتے ہوں۔اگر بقول علماء کرام کے قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ دونوں وحی الٰہی ہیں تو پھر حضورﷺ کے غور وفکر کے خود اختیاری اقوال کون سے باقی رہ جاتے ہیں۔

2- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12:108)-

ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں' میں اور میرے پیرو' دونوں مضبوط دلائل کے ساتھ۔

علم وبصیرت کی رو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رو سے اسے ماننا' یہ حکم خداوندی اور سنت نبوی ہے اور تمام مومنین کا بھی یہی شیوہ ہونا چاہئے دین کی دعوت دینے میں جو شخص اس طریقہ کو اختیار نہیں کرتا' وہ حکم الٰہی اور سنتِ نبوی دونوں سے انحراف کرتا ہے۔اس سے ظاہر ہے

کہ حضورﷺ کے دلائل اپنے غور وفکر کے خود اختیاری نتائج ہوتے تھے۔

3- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

اِنَّ لَکَ فِیْ اَلنَّھَارِ سَبْحاً طَوِیْلاً (73:7)-

اللہ دن میں تمہیں بہت کام دیتا ہے۔

اس کے ذیل میں مولانا عثمانی نے لکھا ہے کہ:

''یعنی دن میں لوگوں کو سمجھانا اور دوسرے کئی طرح کے مشاغل رہتے تھے۔''

ظاہر ہے کہ حضورﷺ جو سمجھاتے ہوں گے وہ ان کے ذاتی فکر کے نتائج تھے۔

4- قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے:

ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُم بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (16:125)-

اے رسول تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو ایسے طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔

آیہ کریمہ کے ذیل میں بہت ہی عمدہ وضاحت تحریر کی گئی ہے' وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''خود پیغمبر علیہ السلام کو تعلیم دی جارہی ہے کہ لوگوں کو راستہ پر کس طرح لانا چاہئے۔ اس کے تین طریقے بتلائے۔ حکمت' موعظتِ حسنہ' جدال بالتی ھی احسن۔ حکمت سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل وبراہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے پیش کئے جائیں۔ جن کو سن

کر فہم وادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔ دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحی الٰہی کے بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کرسکیں۔ ''موعظتِ حسنہ'' موثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے جن میں نرم خوئی اور دلسوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص' ہمدردی اور شفقت وحسنِ اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے بسااوقات پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں۔ ایک مایوس اور پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لوگ ترغیب وترہیب کے مضامین سن کر منزل مقصود کی طرف بیتابانہ دوڑنے لگ جاتے ہیں اور جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی وفہیم نہیں ہوتے مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں ان میں موثر وعظ وپند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعے ممکن نہیں۔ ہاں دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جن کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ ونصیحت سنتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم ہو۔ بعض اوقات اہل فہم وانصاف اور طالبینِ حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدون بحث کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے وجادلھم بالتی ہی احسن فرما دیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقے سے تہذیب' شائستگی' حق شناسی اور انصاف سے بحث کرو۔''

اقتباس طویل ہو گیا۔ لیکن چونکہ یہ وضاحت بہت عمدہ ہے اس لئے اس کو پیش خدمت کر دیا گیا ہے۔ آپ یہ سطور ملاحظہ فرما کر خود اندازہ فرما لیں کہ یہ گفتگو حضورﷺ کی خود اختیاری ہوگی یا وحی خفی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کا ایک ایک لفظ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ حضورﷺ کی یہ دعوت الی اللہ ان کے اپنے غور وفکر کے نتیجہ میں ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ جس درجہ حضورﷺ اپنی کوشش اور جد وجہد میں غور وفکر سے کام لے کر دعوت الی اللہ دیں گے اسی درجہ ان کی تبلیغ کامیاب ونتیجہ خیز ہوئی ہوگی۔

ہمارے علماء کرام قرآنِ کریم کے علاوہ حضورﷺ کے تمام اقوال کو وحی خفی مانتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اقوال حضورﷺ کے بالا رادہ اقوال نہیں رہتے یہ خلاف قرآن عقیدہ صرف اس لئے وضع کیا گیا تھا تاکہ حدیث کی کتابوں سے حضورﷺ کی اطاعت کا جواز ثابت کر دیا جائے۔ لیکن وحی خفی کے عقیدہ کے باوجود علماء کرام کی یہ حسرت پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ جن کتب احادیث کو ہمارے علماء کرام اقوال رسول کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، حقیقت میں وہ کتب اقوال رسول کا مجموعہ ہیں ہی نہیں وہ تو صرف اقوال منسوب الی الرسول کا مجموعہ ہیں کیونکہ احادیث کے مجموعوں میں جو اقوال جمع کئے گئے وہ حضورﷺ کے اقوال نہیں ہیں بلکہ وہ رواۃ کے الفاظ ہیں، رواۃ کے یہ الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس جو احادیث ہیں وہ حدیث کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ احادیث کی Definition میں آتی ہی نہیں ہیں کیونکہ راویوں نے حضورﷺ کے اقوال کو خود اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ احادیث روایت باللفظ (Verbation) نہیں ہیں بلکہ روایت بالمعنیٰ (Narrated) ہیں۔ جب یہ الفاظ ہی راویوں کے اپنے ہیں تو یہ حدیث یا وحی خفی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہ بات کہ موجودہ احادیث روایت بالمعنیٰ کی گئی ہیں اس کے لئے آپ علماء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں، جو محنت سے دستیاب کئے گئے ہیں۔

1- اما الراویة بالمعنی فالخلاف فیها شهیر و لاکثر علی الجواز۔ (نزهة النظر، صفحہ 94)۔

جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن جمہور کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے۔

2- حافظ ابن رجب نے امام ترمذی کا یہ قول نقل کیا ہے:

اما من اقام الاسناد و حفظه و غیر اللفظ فان هذا واسع عند اهل العلم اذا لم یتغیر المعنی۔

(شرح علل الترمذی، جلد 1، ص 145)۔

جس راوی نے سند کو اچھی طرح حفظ کیا اور اسے برقرار رکھا، لیکن متن میں الفاظ کی تبدیلی کی تو علماء حدیث کے ہاں اس کی بڑی گنجائش ہے بشرطیکہ لفظ کی تبدیلی سے مفہوم میں تبدیلی نہ آئے۔

3- امام رازی کہتے ہیں:

یجوز نقل الخبر بالمعنی و هو مذهب الحسن البصری و ابی حنیفه۔ (توجیہ النظر، ص 300)۔

امام حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک راویت بالمعنی کی اجازت ہے۔

4- جریر بن حازم کا بیان ہے:

سمعت الحسن یحدث باحادیث الاصل واحد و الکلام مختلف۔

میں نے حضرت حسن بصریؒ سے کئی ایسی روایتیں سنیں جن کا مفہوم ایک تھا

اور الفاظ مختلف تھے۔

5- ابن عون کہتے ہیں:

کان الحسن و ابراھیم الشعبی یاتون بالحدیث علی المعانی۔

حسن بصریؒ ابراہیم نخعی اور شعبی حدیث کی روایت کرتے وقت معنی و مفہوم کو پیش نظر رکھتے تھے۔

6- سفیان کہتے ہیں:

کان عمر بن دینا لحدث بالحدیث علی المعنی۔

عمر بن دینا حدیث کا معنی و مفہوم بیان کرتے تھے۔

7- حضرت وکیع کہتے ہیں:

ان لم یکن المعنی واسعاً فقد ھلك الناس۔

حدیث کی روایت میں اگر مفہوم بیان کرنے کی گنجائش نہ ہو تو حدیث کے رواۃ کے پاس کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

8- امام بیہقیؒ نے جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ نے کہا:

انا قوم عرب نردو الاحادیث فنقدم و توخر۔ (تدریب الراوی ج 2 ص 93)۔

ہم عربوں کو طریقہ یہ ہے کہ باتوں کو دہراتے رہتے ہیں اس لئے تقدیم و تاخیر ہوتی رہتی ہے۔

9- امام بیہقیؒ شعیب بن الحجاب سے نقل کرتے ہیں۔ آپ نے کہا:

دخلت انا وعبدان علی الحسن نقلنا یا ابا سعید

الرجل یحدث بالحدیث فیزید فیه و ینقص منه۔ قال انما الکذب علی من تعمد ذلك۔

میں اور عبدان حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے آپ سے پوچھا۔ابوسعیداس راوی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو حدیث روایت کرتے وقت الفاظ میں کمی بیشی کرتا ہے۔آپ نے فرمایا' اس کا یہ عمل جھوٹ کے زمرہ میں نہیں آ تا۔جھوٹا راوی وہ ہے جو جان بوجھ کر حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کرتا ہے اور اس کے مفہوم کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

10- ابواویس کہتے ہیں:

مالنا الزهری عن التقدیم والتاخیر فی الحدیث' فقال ان هذا یجوز فی القران فکیف به فی الحدیث؟ اذا اصبت معنی الحدیث فلم تحل به حراماً ولم تحرم به خلا لًا فلا باس۔

ہم نے محمد بن شباب الزہری سے حدیث کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر کے بارے میں پوچھا۔تو آپ نے فرمایا' تقدیم وتاخیر اگر آیات میں جائز ہے تو روایات میں کیوں جائز نہیں۔اگر آپ کی رسائی حدیث کے صحیح مفہوم تک ہے اور الفاظ کی تبدیلی سے حرام حلال' اور حلال حرام نہیں ہوتا تو ایسی تبدیلی میں کوئی حرج نہیں۔

11- امام شافعی نے 'انزل القرآن علی سبعة احرف فاقروء ماتیسر منه' کو بنیاد بنا کر اس ضمن میں گفتگو کی ہے' جو آپ کے مشہور ''الرسالہ'' پر صفحہ 274 پر مرقوم ہے۔

''جب اللہ جل شانہٗ نے مخلوق پر کمال مہربانی فرما کر اپنی کتاب کو سات حرفوں میں نازل فرمایا تو اس سے بآسانی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا اس طرح (سات حروف میں) نزول تلاوت کرنے والوں کی سہولت کے لئے کیا گیا تھا۔ اگر قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے تو دیگر امور میں تو الفاظ کا اختلاف بطریق اولی جائز ہوگا بشرطیکہ معنی ومفہوم تبدیل نہ ہو۔''

امام شافعی حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ کو معلوم کر کے یقیناً حیرت ہوگی کہ صحاح ستہ کے سارے چھ کے چھ جامعین شافعی تھے۔ ان میں سے ایک بھی حنفی یا مالکی نہیں تھا۔ ہمارے علماء کرام حنفی فقہ کی سختی سے پابندی کرتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس معاملہ میں وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہم شوافع کے مجموعوں سے استناد نہیں کرتے۔

امام شافعی کا جو اقتباس ہم نے درج کیا ہے' یہ اسی ''الرسالہ'' سے لیا گیا ہے جس میں امام شافعی کے ایک مناظرہ کا تذکرہ بھی لکھا ہے' جو امام صاحب موصوف کا ایک منکر حدیث سے ہوا تھا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام صاحب موصوف حدیث کے کس درجہ حامی تھے۔ اس اقتباس میں جو دلیل امام صاحب نے دی ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم کا سات قرأتوں میں نازل ہونا درست نہیں ہے لیکن اس اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ امام موصوف روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے تھے۔ چونکہ علماء کرام خود قرآن کے سات قرأتوں میں نازل ہونے کے قائل ہیں' اور امام موصوف کا مقام بھی ان کے نزدیک بہت بلند ہے اس لئے ان کے لئے یہ اقتباس ایک دلیل قاطعہ کا درجہ رکھتا ہے' اسی لئے اس کو یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔

علماء اصول حدیث نے روایت بالمعنی کے عقلی دلائل بھی تحریر کئے ہیں۔

(1) حافظ ابن حجر اپنی تعلیق میں تحریر فرماتے ہیں:

ومن اقوی حججهم الاجماع علی جواز شرح الشریعته بلسانها للعارف به' فاذا جاز الابدل بلغة اخریٰ' فجوازه' باللغة العربيه اولی۔

روایۃ بالمعنی کے قارئین کے پاس سب سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس دلیل یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تعبیر و تشریح دوسری زبانوں میں بالاتفاق جائز ہے۔ اگر عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں شریعت کی تشریح و تفسیر جائز ہے تو عربی زبان میں متبادل الفاظ کا سہارا لے کر مفہوم بیان کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔

(2) روایت بالمعنی کے جواز میں علماء حدیث دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں مختلف علاقوں میں وہاں کے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اپنے نمائندوں کو بھیجا تھا۔ یہ نمائندے (اولی الامر) آپ کی روایات اور احکام اپنے الفاظ میں' اپنے انداز اور اسلوب میں وہاں کے عوام کو پہنچاتے تھے۔ یہ عمل دورِ رسالت میں متداول و جاری تھا۔

(3) یہی حال خطبات اور واقعات کا ہے۔جنہیں مختلف رواۃ نے مختلف الفاظ میں روایت کیا ہے۔ یہ بات اس چیز کی دلیل ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ (المستصفیٰ' جلد ا' ص 149)۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ نے غور فرمالیا ہوگا کہ ہمارے علماء اصول حدیث نے روایت بالمعنی کو جائز قرار دیا ہے اور احادیث کے یہ مجموعے روایت بالمعنی ہیں جن میں الفاظ رواۃ کے ہیں۔ یہ اقوال رسول ہرگز نہیں ہیں بلکہ یہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔

یہ بات کہ روایات میں کتنا حصہ روایت باللفظ کا ہے اور کتنا حصہ روایت بالمعنی کا ہے' اس کی وضاحت معروف عالم دین' مفسر قرآن' جناب امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب ''مبادی تدبر قرآن'' میں خود کردی ہے جبکہ انہوں نے تحریر فرمایا: ''اگر ان بیان کرنے والوں پر یہ قید عائد

کر دی جاتی کہ حضور ﷺ کے فرمان انؐ کے اپنے الفاظ میں روایت کریں۔ یعنی روایت باللفظ ہو، تو میرا خیال ہے کہ علم نبی کا پچانوے فیصد حصہ غائب ہو جاتا۔

ان مندرجہ بالا حوالہ جات اور حضرت مولانا اصلاحی صاحب کی توضیح کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ علماء کرام کے خود اپنے موقف کے مطابق ہماری احادیث کا 95 فیصد حصہ رواۃ کے اپنے الفاظ پر مشتمل ہے، جو کسی حال میں حضور ﷺ کے الفاظ نہیں ہو سکتے نطق رسول تو ایک طرف رہا، یہ تو اقوال رسول بھی نہیں ہیں۔ یہ سراسر راویوں کے الفاظ ہیں۔ اس لئے نہ تو یہ دینکا حصہ ہیں، نہ ہی ان سے اطاعت رسول ہوتی ہے۔ ان کا صحیح مقام صرف دین کی تاریخ ہے اور بس۔

فان ابی و والدتی و عرضی لعرض محمد منکم وقاء۔

(حضرت حسان رضی اللہ عنہ)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَساسِ مُحکم

نوع انسانی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی ساری تاریخ میں کوئی ایسا نظام اپنے لئے متشکل نہیں کرسکی جس میں ساری انسانیت سکون و آرام کی زندگی بسر کرسکے۔ وہ مستقل اقدار جن پر ایسے معاشرے کی تشکیل ہوسکے جس میں ساری انسانیت کی فلاح ہو' وہ اقدار دریافت کرنا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ عقل انسانی جس قدر بھی ترقی کرے اور علوم حاصل کرے وہ انسانی معاشرے کے لئے مستقل اقدار دریافت نہیں کرسکتی ارشاد ربانی ہے۔

وجعلنا لهم سمعا وابصاراً و افئدة فما اغنى عنهم سمعهم ولا ابصارهم ولا افئدتهم من شئى اذكانوا يجحدون بآيات الله...... (۴۶/۲۶)۔

چونکہ وہ آیات الٰہی یعنی وحی خداوندی کا انکار کرتے تھے اور ان کی مفاد پرستی کے جذبات ان پر غالب تھے اس لئے ان کی عقل و دانش، فہم و فراست ان کے کسی کام نہیں آئی اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے انہوں نے ہی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چونکہ ہر شخص کی عقل اپنا ہی مفاد پیش نظر رکھتی ہے اور دوسروں کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ وہی نظام بناتی ہے جو یا تو اس کے اپنے مفاد میں ہو یا اپنی قوم و قبیلہ کے مفاد میں ہو۔ ساری انسانیت کا مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوسکتا۔ علامہ اقبالؒ کی ایک مشہور رباعی اس مضمون اور مفہوم کو خوب واضح

کرتی ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ھمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ھمہ

یہ صرف اور صرف وحی الٰہی کا خاصہ ہے کہ وہ ایسا نظام عنایت فرماتی ہے کہ جس میں ساری انسانیت سکون و آرام کی زندگی گزار سکے۔ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا استحصال نہ کر سکے اور Exploitation of Man by Man کے سارے ذرائع بند کر دیئے جائیں۔ وحی کے نظام کی بنیاد ہی اس اساس محکم پر ہوتی ہے کہ اس میں حکومت صرف اللہ تعالٰی کی ہوتی ہے اور اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے کا محکوم ہوتا ہے اور نہ محتاج۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

چونکہ قرآن کریم کا اصل اور بنیادی موضوع بہترین معاشرے کی تشکیل ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کے اصول وقواعد دینے کے ساتھ ساتھ بہترین معاشرہ کی تعریف Definition بھی خود ہی کر دی' فرمایا۔ فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یعنی اگر نوع انسانی اپنے معاشرے کو وحی الٰہی کے مطابق متشکل کرے' تو اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ کسی قسم کا حزن۔ عربی لغت کے مطابق کسی واقعہ کے وقوع سے پیشتر خوف ہوتا ہے اور اس کے وقوع کے بعد جو رنج ہوتا ہے وہ حزن کہلاتا ہے۔ قرآنی معاشرے میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہوں گی۔ اسمیں جان کی تلافی' رزق ولباس کی کمی' رہائش کا نہ ہونا' تعلیم کا میسر نہ ہونا' زندگی کی لازمی ضروریات میں کمی' ان تمام چیزوں کا خوف اس معاشرے

میں نہیں ہوگا۔ اگر کسی معاشرے میں اس قسم کا خوف یا کسی قسم کا حزن موجود ہے' تو یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ اس معاشرے میں وحی کا اتباع نہیں ہو رہا ہے' خواہ زبان سے وہ قوم کتنا ہی اتباعِ وحی کا دعویٰ کرے۔

ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم نے ایسا ہی نظام عنایت فرمایا تھا اور وہ حضورؐ نے عملاً متشکل کر کے بھی دکھایا تھا لیکن وہ نظام کچھ عرصہ قائم رہا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔ قرآن کی رو سے کسی بھی نظام کو اور خصوصاً قرآن کے نظام کو قائم کرنے اور اس کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو کلیتہً جاری کیا جائے۔ آدھے نظام کو قرآن کریم کے مطابق تشکیل کرنا اور نصفِ باقی کو قرآن کے خلاف بنانے سے' قرآنی نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (۲/۸۵)۔ کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔ نیز فرمایا یٰایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافتہ (۲/۲۰۸)۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو' صدر اول میں مسلمانوں نے بھی قرآن کریم کے مطابق نظام متشکل کیا لیکن مسلمانوں کی' بلکہ ساری انسانیت کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس نظام کو علیٰ حالہ نہیں رہنے دیا گیا۔ جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی' تو اس نظام کا تصور بھی قرآن کریم کے مطابق نہیں رہا اور اس نظام کے کچھ حصہ کو برقرار رکھا گیا اور کچھ حصہ سے انحراف شروع کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ قرآنی نظام کی اساس محکم اس نظریہ پر قائم تھی کہ اس کی اطاعت سے ہی اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور اس کی مخالفت سے اللہ و رسول کی مخالفت ہوتی ہے اور اس کی اطاعت ہی مسلمانوں کا مقصود حیات تھا۔ لیکن ملوکیت کے در آنے سے یہ تصور بدل گیا اور اس تصور کی رو سے اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے نظام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے بجائے قرآن و حدیث کی اطاعت کو جو انفرادی طور پر ہر جگہ کی جا سکتی ہے۔ اطاعت خداوندی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح نظام کا تصور ختم کر دیا گیا

اور قرآنی نظام کی کوئی ضرورت اور اہمیت نہیں رہی۔ ہر نظام کو قائم کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے ایک جذبہ محرکہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کے نظام کے قیام اور اس کی بقا اور استمرار کے لئے جذبہ محرکہ ہی یہ تھا کہ اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ جب یہ عقیدہ قائم نہیں رہا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ قرآنی نظام ہے تو وہ نظام زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں انفرادی طور پر عبادت رائج ہوگئی اور جسے بھی اللہ و رسول کی اطاعت کرنی ہوتی وہ انفرادی عبادت گزاری یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں منہمک ہوگیا اور عبادت گزاری اور اطاعتِ خداوندی سے نظام اسلامی کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ملوکیت کا مقصود بھی یہی تھا اور یہ مقصد اسے اس طرح حاصل ہوگیا۔

مضمون ہٰذا میں یہ بات ثابت کی جائے گی کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے قرآنی نظام ایک لابدی چیز ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا دیا ہوا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جس کو حضور ﷺ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا اس کی اطاعت ہی اللہ رسول کی اطاعت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام حضور کے بعد بھی چلنا تھا اس لئے حضورؐ کے بعد اس نظام اور اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ یہ اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے اور قرآن کی رو سے یہ ایک اطاعت ہے اور قرآن نے اس کے لئے ضمیر واحد کی ہی استعمال کی ہے۔ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خمس، صدقات، صوم، طاغوت، سبیل المومنین وغیرہ اصطلاحات قرآن کریم کی اپنی ہیں۔ اس لئے اس نے جہاں جہاں اللہ و رسول کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے وہ نظام یا اس کی مرکزی اتھارٹی مراد ہوتی ہے۔

جنگ احد میں جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور حضورؐ بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ حضورؐ کے گرداگرد جمع ہو گئے۔ بظاہر یہ آواز حضورؐ کی تھی لیکن چونکہ یہ حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت یہ آواز دی تھی اس

لئے اس آواز کو اللہ اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

۱۔ الذین استجابوا اللہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح‘ للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم (۳/۱۷۲)۔

جن لوگوں نے اللہ ورسول کے کہنے کو قبول کر لیا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے ثوابِ عظیم ہے۔

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضورؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو خدا اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی تھی۔

☆ ذلک بانھم شاقو اللہ و رسولہ و من یشاقق اللہ و رسولہ فان اللہ شدیدالعقاب (۸/۱۳)۔

یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ تعالیٰ اس کو سخت سزا دیتا ہے۔

۳۔ اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فساد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

☆ انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا اویصلبوا (۵/۳۳)۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں۔

۴۔ ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرہ (۳۳/۵۷)۔

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور

آخرت میں لعنت کرتا ہے۔

اس آیت میں اگر اللہ تعالیٰ اور رسول سے حضور کی ذات مراد لی جائے تو بات بالکل الجھ جاتی ہے۔ رسول کو تو اذیت دی جا سکتی ہے' کیونکہ حضور انسان تھے اور اردگرد کے لوگوں کی ان تک رسائی تھی کہ ہر طرح کی تکلیف انہیں دے سکتے تھے۔ انہیں جسمانی تکلیف بھی دی جاسکتی تھی اور روحانی بھی اور عملاً ان کو تکلیف دی بھی گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ وہ انسانوں کی رسائی سے باہر ہے اسے بھلا کون تکلیف واذیت دے سکتا ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ اسے کوئی تکلیف دے سکے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دینے سے مراد نظامِ خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

۵۔ مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور قدرے استحکام حاصل ہونے کے بعد سب سے پہلے اجتماع یعنی حج اکبر میں حکومت اسلامی کی طرف سے کچھ اعلانات ہوئے اور اس حکومت کی پالیسی اور خارجی امور کے متعلق بھی اعلانات ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اعلان یہ تھا۔

☆ براءۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عھدتم من المشرکین (۹/۱)۔

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا۔

پھر تیسری آیت شریفہ میں ارشاد ہوا۔

☆ اذان من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریء من المشرکین و رسولہ (۹/۳)۔

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے

اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین کو امن دینے سے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے اور اسی حکومت کے نمائندے کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے ہیں لیکن انہیں اللہ اور رسول کے اعلانات کہا گیا ہے اور مدعا اس حقیقت کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ تمام لوگوں پر بخوبی واضح اور مبرہن کر دیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکامات حضورؐ کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں اس لئے کہ یہ نظام حکومت خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے تھے۔

۷۔ نیز سورۃ حشر میں ارشاد ہوا۔

☆ للفقراء المھجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصدقون (۵۹/۸)۔

اور ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں' اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیں۔

یہاں اللہ اور رسول کی مدد کرنے سے مراد نظام خداوندی کی مدد ہے۔ اس سے چند آیات پہلے پیشتر اسی سورت میں فرمایا گیا ہے۔

☆ ذالک بانھم شاقوا اللہ و رسولہ (۵۹/۴)۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کو تکلیف دینے سے مراد اسلامی نظام کو نقصان پہنچانا ہے۔

ایک آیت کریمہ اس بارے میں اتنی روشن و بین ہے کہ اس بات کے ثبوت میں حجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

☆ ومن یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورا رحیما (۴/۱۰۰)۔

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہوگیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کر کے جانے سے بجز اسلامی حکومت (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا اور اللہ اور رسول کی اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

اللہ اور رسول دو الفاظ ہیں لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے جس کی اوپر مثالیں دی جا چکی ہیں اس لئے اس کے لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر بخوبی واضح کر دیا ہے کہ یہ اطاعتیں دو نہیں بلکہ ایک ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

☆ یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین (۹/۶۲)۔

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اس کو راضی کریں۔

(ترجمہ اشرف علی)

یہاں اللہ اور رسول کے دو الفاظ ہونے کے باوجود ضمیر واحد آئی ہے۔ واحد ضمیر لا کر

انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے جو ایک ہے اور دو نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

☆ اغنھم اللہ ورسولہ من فضلہ (۹/۷۴)۔

انہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو اللہ اور رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے۔ اس نے انہیں غنی کر دیا ہے۔ فضلہ میں ضمیر واحد لا کر دونوں الفاظ اللہ اور رسول کو بطور اصطلاح استعمال کر کے ایک قرار دیا ہے۔

نیز فرمایا۔

☆ یٰا یھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸/۲۰)۔

اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس کا کہنا ماننے سے روگردانی نہ کرو اور تم سن تو لیتے ہی ہو۔

اس آیت کریمہ میں ولا تولوا عنہ کی واحد ضمیر واضح کر رہی ہے کہ یہ دونوں اطاعتیں ایک ہی ہیں اور دو ہرگز نہیں ہیں۔

ان تیرہ آیات کریمات پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے واضح کرنا یہ مقصود تھا کہ قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیا ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ اس سے مراد قرآن وحدیث کی اطاعت انفرادی طور پر کرنی نہیں ہے۔

سیکولر سٹیٹ اور اسلامی سٹیٹ کی ما بہ الامتیاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ سیکولر سٹیٹ کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں مذہبی رسوم اور عبادات انفرادی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص حکومت کے خلاف کوئی جرم (Crime) کرتا ہے تو وہ محض سٹیٹ کا مجرم ہے اس سے

اللہ ورسول کی کوئی نافرمانی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص گورنمنٹ کے واجبات (Revenue) ادا نہیں کرتا تو اس سے اللہ ورسول کے ہاں کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ اگر کوئی مجرم جرم کرنے سے پیشتر ہی ایسا انتظام کر لے کہ اسے جرم کی کوئی سزا نہ ملے تو اسے جرم کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتی لیکن اسلامی حکومت کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ اس میں حکومت کا ہر جرم اللہ ورسول کے ہاں قابل مواخذہ ہے۔ جس طرح اسلامی حکومت کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے اسی طرح اسلامی حکومت کی نافرمانی' اللہ ورسول کی نافرمانی ہے۔ اسلامی حکومت کے جرائم (Crime) گناہ (Sin) بھی ہوتے ہیں۔ اس میں جرم اور گناہ (Crime اور Sin) ایک ہی ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی یہی وہ اساس محکم اور العروۃ الوثقیٰ ہے جس پر اسلامی حکومت کے قیام کا انحصار ہوتا ہے اور اسی مواخذہ کی وجہ سے اس میں جرائم یا گناہ کم ہوتے ہیں اور اس مواخذہ کا تصور ختم کرنے کی وجہ سے ہی جرائم کی کوئی روک تھام نہیں ہوسکتی۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص سخت گرمی کے موسم میں روزہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے مکان میں بالکل تنہا ہے۔ ٹھنڈا پانی اس کے پاس مہیا ہے۔ پیاس کی سخت شدت محسوس کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ روزہ نہیں توڑتا۔ ایک ایک منٹ شمار کرتا ہے کہ افطار کا وقت آئے تو وہ روزہ افطار کرے۔ وہ پانی اس لئے نہیں پیتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ روزہ توڑنا گناہ ہے۔ حالانکہ کوئی حکومت اس کی نگرانی نہیں کر رہی ہے لیکن اللہ ورسول کی اطاعت اسے نافرمانی کرنے سے روکے ہوئے ہے' یہی شخص جب دفتر جاتا ہے تو وہاں غلط کام سرانجام دیتا ہے۔ اگر راشی ہے تو رشوت سے اجتناب نہیں کرتا۔ اگر یہ شخص تاجر ہے تو ہر طرح کا انکم ٹیکس چوری کرنے کا بندوبست کرتا ہے کیونکہ اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس کے ذہن نشین یہ بات ہو کہ اسلامی حکومت کی نافرمانی' اللہ ورسول کی نافرمانی ہے تو وہ جس طرح روزہ توڑنے سے اجتناب کرے گا اسی طرح وہ حکومت اسلامی کی خلاف ورزی کو بھی اللہ ورسول کی نافرمانی سمجھ کر اس سے مجتنب رہے گا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو اسلامی حکومت کی اساس محکم ہے۔ جو

شخص زکوٰۃ دیتا ہے وہی شخص لازماً حکومت کے Rev en ue ادا کرے گا۔ بس صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسلامی حکومت کے Rev en ue ہی زکوٰۃ ہوتے ہیں حکومت کے واجبات اور زکوٰۃ کو الگ الگ دومدات شمار کرنا درست نہیں ہے۔ لوگ زکوٰۃ کو مذہبی فریضہ سمجھ کر خود بخود ادا کردیتے ہیں۔ لیکن حکومت کے واجبات روک رکھنا برا نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ صرف یہی ثنویت ہے جو حکومت اور مسجد کو الگ الگ شمار کیا گیا ہے اور جس کو ختم کرنے کے لئے اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے۔ جو حجاج صاحبان حج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں وہ نہایت نیک نیتی سے حج کے سارے ارکان ادا کرتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے دھوکہ، جھوٹ کو ملوث نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جب حج کے سلسلہ میں قرعہ اندازی ہوتی ہے اور حج پر جانے کے لئے نام نکلوانے ہوتے ہیں تو وہ ہی حجاج اس میں دھوکہ اور جھوٹ سے پرہیز نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ حکومت سے کررہے ہیں اللہ ورسول سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور حج کے ارکان، اللہ ورسول کی خوشنودی کی خاطر کررہے ہیں اس لئے اس میں کسی قسم کی نافرمانی نہیں ہونے دیتے۔

دنیا کا باطنی اضطراب اور فطرت کے تقاضے انسانیت کو مجبور کررہے ہیں کہ وہ انسان کے خود ساختہ گذشتہ نظامہائے حکومت کو ترک کرے اور ایسا نظام اختیار کرے جس سے دنیا کو سکون اور امن حاصل ہو سکے۔ جن اقوام کے سامنے قرآن کریم نہیں ہے اور جو وحی الٰہی کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں ان کے پاس تو بجز اسکے کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ انہیں نظاموں میں کچھ ردوبدل کرکے ان کو ہی جاری رکھیں لیکن ہم مسلمانوں کی پوزیشن مختلف ہے۔ ہمارے سامنے اصولی طور پر دو امور بہت اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر کام کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عقلی طور پر یہ بات ثابت کی جائے کہ عقل انسانی اپنے مسائل خود حل نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ وحی الٰہی کے نور سے مستنیر نہ ہو۔ انسانیت ہزار جتن کرے لیکن وہ کوئی قابل ستائش نظام بنا ہی نہیں سکتی۔ یہ بات خود مسلمانوں کے ذہن نشین بھی کرائی جائے اور غیر مسلم اقوام کے سامنے بھی اور

دوسری بات یہ ہے کہ عالم انسانیت جن مسائل و مصائب سے آج دوچار ہے ان کی نشاندہی کر کے ان کا حل قرآن کریم سے پیش کیا جائے۔ جو بہت واضح اور قابل عمل ہو۔ قرآن کریم اپنے کمال اور کفایت کا مدعی ہے۔ اس نہج پر کام کرنے سے ان دعاوی کے دلائل فراہم ہوتے ہیں اور ان دعاوی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور ہمت طلب ہے اور ان ہی لوگوں کے بس کا ہے جنہیں موجودہ علوم پر مہارت تامہ ہو اور موجودہ دور کے مسائل و مصائب سے بخوبی واقف ہوں۔ جو شخص موجودہ دور کے مسائل سے آگاہ ہو گا وہی ان کا حل قرآن کریم سے تلاش کر سکے گا۔ جسے آج کے مسائل اور انسانیت کی مشکلات کا ہی علم نہیں ہو وہ ان کا حل قرآن سے تلاش نہیں کر سکتا۔

؎ نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

عملی طور پر اس کی مثال ربوٰ کی حرمت ہے۔ ربوٰ کی حرمت پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ ربوٰ کے نظام سے جو تباہیاں انسانیت کو ہوئیں۔ ان کو واضح کیا جائے اور اس کے بغیر معاشی نظام چلانے کا نقشہ پیش کیا جائے۔ جب تک عملاً کوئی معاشی نظام ربوٰ کے بغیر پیش نہیں کیا جائے گا قرآن کریم کے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہو گی۔

زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلمانوں کے تقریباً بیشتر ممالک میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں جو بہت خوش آئند بات ہے۔ قرآن کریم نے جو دعاوی کئے ہیں وہ دعاوی عملاً اسی نظام میں پورے ہوتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق قائم کیا جائے۔ اسی نظام کی وابستگی سے امت کی فلاح و نجات وابستہ ہے۔ لیکن اس کے قائم کرنے میں چند دشواریاں جو پیش آ رہی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی دشواری یہی ہے کہ ہم مسلمانوں کے سامنے اس کا تصور قرآن کے مطابق نہیں ہے جس جس جگہ یہ نظام قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس میں ملوکیت سے متاثر شدہ تصور کے مطابق یہ نظام قائم کیا جا رہا ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعتیں دوشمار کر کے

قرآن وحدیث کی اطاعتوں کو پیش نظر رکھا جا رہا ہے۔ یہی صورت حال ایران، سوڈان، الجیریا میں ہے اور یہی صورت حال پاکستان میں ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کے لئے قرآن کی اطاعت کر لی جائے اور رسول کی اطاعت کے لئے احادیث کی اطاعت کر لی جائے اور اس طرح عملاً رسول کا ترجمہ احادیث قرار پاتا ہے۔ حدیث کا موضوع بہت جذباتی ہے لیکن اس موقف پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ اولاً یہ بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ہم جن کتب کو احادیث کے مجموعے قرار دیتے ہیں وہ حقیقتاً احادیث کے مجموعے ہیں ہی نہیں۔ وہ روایات ہیں جو بالمعنی نقل کی گئی ہیں۔ ان کے شروع میں روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آخر میں اوکمال قال علیہ السلام اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ وہ روایات ہیں اور وہ بھی روایت باللفظ نہیں بلکہ بالمعنی ہے۔ ان کا نام احادیث رکھنا محض ان کا تقدس بڑھانے کے لئے ہے۔ نیز یہ کہ یہ سب مجموعے حضورؐ سے ڈھائی سو سال بعد وجود میں آئے اور ان مجموعوں سے پیشتر بھی اطاعت رسول ہو رہی تھی اور یہ مجموعے مختلف فرقوں کے مختلف ہیں۔ اس لئے مختلف فرقوں کی اطاعتِ رسول بھی مختلف ہے۔ جس سے آپس میں اختلاف ہوتا ہے اور فرقہ بندی تک نوبت آتی ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ اس لئے رسول کی اطاعت کا ترجمہ روایات کی اطاعت کرنا درست نہیں ہے جس سے دو اطاعتیں وجود میں آتی ہیں جو قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے جب بھی قرآنی نظام قائم کرنا ہوگا اس کا وہی صحیح تصور پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا جو سابقہ صفحات میں ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اسلامی حکومت کے حاکم اعلیٰ (مرکزی اتھارٹی) کی ہی اطاعت ہے۔

اسلامی نظام کو قائم کرنے میں دوسری دشواری فقہ کا تعین اور اس کا اجراء ہے۔ ایران میں فقہ جعفری نافذ کیا گیا ہے اور ہمارے پاکستان میں فقہ حنفی جاری کرنے کا مطالبہ ہے۔ ہم مسلمانوں میں یہ دونوں فقہیں آج سے ایک ہزار پیشتر بنی عباس کے دور میں مرتب کی گئی تھیں۔ بنی عباس کا دور ملوکیت، پیشوائیت، آمریت، کا دور تھا۔ جب یہ قوانین مرتب کئے گئے تو یہ قوانین بھی

ان حالات سے متاثر ہوئے اور ان قوانین میں ملوکیت' پیشوائیت کے حقوق کا تحفظ کیا گیا جب کہ عورتوں' اقلیتوں' مزدوروں' غریب طبقہ' کسانوں' بچوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔عقل انسانی ایک ہزار سال پیشتر جو سوچ سکتی تھی اس کے مطابق ہی قوانین وضع کئے گئے۔آج سے ایک ہزار سال پیشتر جو قوانین مغرب میں بنائے گئے تھے وہ بھی بربریت پر مشتمل تھے۔لیکن جوں جوں علوم میں اضافہ ہوا اور رواداری بڑھی' اسی قدر قوانین بھی مبنی بر عدل اور لچک دار ہوتے چلے گئے۔ ہمارے فقہ بھی انسانوں کے ہی تیار کردہ ہیں ظاہر ہے وہ بھی اسی دور سے متاثر ہیں۔اس لئے ان کا نفاذ اس موجودہ دور میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔وحی چونکہ علم الٰہی ہوتی ہے۔اس لئے وہ تو زمانہ کے اثرات سے بالکل محفوظ ہوتی ہے لیکن عقل انسانی کی یہ صورت نہیں ہے وہ اپنے دور سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔خواہ کوئی کتنا ہی بڑا عالم ہو وہ اپنے دور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے قوانین اسی وجہ سے ان ادوار سے متاثر ہیں اور ان ہی ادوار کے لئے بنائے گئے تھے۔آج انسانیت جن مسائل سے دوچار ہے وہ مسائل اس دور میں تھے ہی نہیں۔آج کے مسائل کا حل عقل انسانی' وحی الٰہی کی حدود میں رہ کر خود تلاش کر سکتی ہے۔مثال کے طور پر عرض ہے کہ ترکی کی حکومت مسلم سٹیٹ ہے' کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن وہ اسلامی سٹیٹ نہیں ہے۔اسی طرح بنی عباس کی حکومت بھی مسلم سٹیٹ تھی وہ اسلامی حکومت نہیں تھی۔بادشاہت کا ہونا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ غیر اسلامی حکومت تھی۔غیر اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی قوانین ہرگز نہیں ہو سکتے' اس لئے ہماری موجودہ فقہیں اسلامی فقہیں نہیں ہیں۔ بلکہ ملوکیت کے تیار کردہ قوانین کے مجموعے ہیں' اس لئے اسلامی حکومت میں انہیں جاری کرنا ضروری نہیں لیکن چونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت جب ہی قائم ہو گی جب وہ قوانین جاری ہوں' اور وہ قوانین آج کے دور کے مطابق نہیں' اس لئے اسلامی حکومت کا قیام مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔صحیح صورت حال یہ ہے کہ قرآن کریم نے کچھ قوانین خود عنایت فرمائے ہیں۔ان کو من و

عن جاری کرنا لازمی ہوگا۔اس کے علاوہ قرآن کریم نے اصول عطا فرمائے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر دور کے مطابق جزوی قوانین وضع کرنے ہوں گے اور ہر دور کے مطابق جزئیات طے کرنا ہوں گی۔اسی طرح ہر دور کی اسلامی حکومت وہ قوانین قرآن کریم کی حدود میں رہ کر مستنبط کر کے ان کو جاری کرے گی اوران قوانین کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہوگی۔

اس کے علاوہ جو دشواری اسلامی حکومت قائم کرنے میں ہوتی ہے وہ روزمرہ کی معاشرت اور قرآنی قوانین میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔قرآن کریم ایک خاص مقام اور ایک خاص عہد میں نازل ہوا اور اسی مقام پر اس کے احکامات وقوانین کے مطابق اسلامی حکومت قائم ہوئی۔عرب ہی اس کے اولین مخاطب تھے اور انہیں ہی بطور خمیر Nucleus استعمال کیا گیا تھا۔عربوں کی سوسائٹی بہت سادہ اور Primitive Stage پر تھی۔قرآن کریم کے قوانین وہاں رائج ہوئے۔عربوں کے جو دستور، عادات، رسم ورواج قرآن کریم کے خلاف تھے انہیں قرآن نے ختم کرادیا۔باقی رسوم عربوں میں قائم رہیں لیکن وہ رسوم دین کا حصہ نہیں تھیں۔وہ ایک خاص وضع کا لباس استعمال کرتے تھے، خاص وضع کا کھانا کھاتے تھے، ان کے طور طریقے ان کی آب وہوا اور حالات کے مطابق تھے چونکہ حضورؐ انہیں میں پیدا ہوئے اس لئے ظاہر ہے کہ وہی طرز زندگی آپ نے اختیار فرمائی۔وہی وضع قطع، وہی لباس، وہی خورونوش کے طور طریقے آپ نے اختیار فرمائے لیکن ان تمام چیزوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔حضورؐ کے ذاتی میلانات، رجحانات، ترجیحات اور روزمرہ کے معمولات کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے نہ ہم مسلمان ان کے اتباع کے مکلّف ہیں۔حضورؐ نے جو امور دین کی ترویج، توسیع، استحکام اور دین کے اتباع میں اختیار فرمائے ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے لیکن حضورؐ کے ذاتی معمولات کا اتباع ہم پر لازم نہیں۔دین کے اتباع میں حضورؐ نے جہاد فرمایا، زکوٰۃ دی، صلوٰۃ قائم فرمائی، روزہ رکھا اور دیگر امور جو دینی تھے اور حضورؐ نے سرانجام دیئے ان کا اتباع ہم پر لازمی ہے لیکن حضورؐ کے ذاتی معمولات

اور امور کا اتباع لازمی نہیں، حضورؐ اگر کسی دن چاول تناول فرماتے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ مدینہ شریف میں سب صحابہؓ اس دن چاول تناول فرماتے۔ یہ حضورؐ کا ذاتی رجحان تھا۔ ان امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں اور نہ ہی یہ سنت کے زمرہ میں آتے ہیں۔

سنت حضورؐ کے دینی امور پر مشتمل ہے۔ سورہ الممتحنہ (۶۱/۱۲) میں حضورؐ کو عورتوں کے متعلق حکم ہوا کہ اگر وہ چوری، زنا، قتل اولاد وغیرہ کے جرم کی مرتکب نہ ہوں نیز معروف میں حضور کی نافرمانی نہ کریں تو حضور ان کو بیعت کرلیں۔ یہاں حکم صرف معروف میں اطاعت کرنے کا آیا ہے۔ اسلامی حکومت کے وہ احکام جو وہ وقتاً فوقتاً جاری کرتی رہتی ہے معروف کہلاتے ہیں۔ مثلاً اگر حکومت اعلان کرے کہ دفاتر کے اوقات صبح 9 بجے سے شام 4 بجے تک ہوا کریں گے۔ تو یہ معروف کہلائیں گے۔ حکومت نے اعلان کیا کہ اس سال جہاز یا ریل کے کرایہ میں اتنا اضافہ ہوا ہے اور ہر شخص اس شرح سے ٹکٹ خرید کرے تو یہ معروف میں شمار ہوگا۔ سورہ ممتحنہ کی اس آیت میں یہ حکم ہوا کہ حضورؐ جو احکامات، یعنی معروف جاری فرما رہے ہیں اگر ان کا اتباع خواتین کریں تو حضور ان کو بیعت فرمالیں اور حضور کے ذاتی معمولات کا اتباع ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح سورہ احزاب میں حضرت زیدؓ کے واقعہ کے ضمن میں حضرت زیدؓ نے حضورؐ کی مرضی کے خلاف حضرت زینبؓ کو طلاق دی لیکن قرآن کریم نے اس کے باوجود ان کے لئے انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ (۳۳/۳۷)۔ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ حضور کی ذاتی اطاعت ان کے لئے فرض نہیں تھی۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف 'سنت' کے مفہوم میں توسیع کرنے سے دقت یہ ہوتی ہے کہ اس دور کے حالات، طور طریقے، عادات، لباس وغیرہ اپنانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی نہ صرف جامد (Static) ہوجاتی ہے بلکہ اسی طرح کی سادی اور اتنے عرصہ پیچھے چلی جاتی ہے جو اس دور میں اپنانی مشکل ہو جاتی ہے اور اسلامی حکومت قائم کرنے میں بڑی رکاوٹ واقع ہوتی ہے۔ قرآنی اقدار کے اندر رہ کر لچکدار، ترقی پسند، وسیع النظر،

تنوع پذیر Flexible معاشرہ قائم کرنا زیادہ آسان اور زیادہ ممکن ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سنت کی وہی تعبیر کی جائے جو قرآن کریم کی رو سے واضح ہے۔

سابقہ صفحات میں جو گزارشات کی گئی ہیں ان کا ملخص یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال اور بدحالی کا علاج صرف قرآنی نظام کے قیام سے وابستہ ہے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت خیال کیا جائے اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اسلامی نظام کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت شمار کیا جائے اور معاشرے کو قرآن کریم کی اقدار کے اندر رہتے ہوئے وسعت پذیر، لچکدار، آزاد رکھا جائے تاکہ اس کے قائم کرنے میں سہولت ہو۔

نیز مسلمانوں پر یہ ثابت کرنا کہ اسلامی حکومت کا قیام ہر مسلمان کے لئے فرضِ عین ہے اور حقِ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔

وھہنا منا تم الکلام

علی مصطفنا الوف سلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اتباعِ دین کا فطری نتیجہ

سنتِ الٰہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو دین ہی ملتا رہا ہے۔ شروع شروع میں چونکہ معاشرے ابتدائی حالت میں تھے اور ان کے مسائل بھی کم تھے اس لئے راہنمائیٔ خداوندی کی ضرورت بھی کم ہی تھی چنانچہ ان معاشروں کی کفایت کے مطابق ہی ان کو راہنمائی ملتی جاتی تھی۔ لیکن جب معاشرے زیادہ ترقی یافتہ ہونے لگے' اور ان کے مسائل میں بھی اضافہ ہوتا گیا' اسی نسبت سے وحی الٰہی میں بھی راہنمائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مشیت الٰہی یہ ہوئی کہ ایک جامع ضابطہ الٰہی نازل کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد مزید وحی کے نزول کی ضرورت باقی نہ رہے۔ وحی الٰہی کا مزید نازل نہ کرنا انسانیت کے بالغ ہونے کی دلیل ہے۔ انسانیت کی بلوغت کے دو واضح نتائج ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اب انسانیت آزاد ہوگئی کہ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے یہ احکام نازل ہوئے ہیں اور تم میری اطاعت کرو۔ اس طرح اب انسانیت Secure ہوگئی ہے کہ اب اطاعت صرف ان قوانین کی کرنی ہے۔ شخصی اطاعت کا دور ختم ہو گیا۔ شخصی اطاعت نے نظام کی اطاعت کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرا سبب نزول وحی کے ختم کرنے کا اور انسانیت کی بلوغت کا یہ ہے کہ اب انسانیت اس قابل ہوگئی کہ وحی کے اصولوں کی جزئیات خود مقرر کرے۔ سابقہ وحی میں ذرا ذرا سی بات کی ہدایت ملتی تھی' لیکن انسانیت کے بالغ ہونے کے بعد وحی میں صرف اصول و اقدار عطا کئے جاتے تھے' کہ اب

جزئیات خود نظامِ معاشرہ طے کرے گا۔ یہ انسانیت کے بالغ ہونے کی دوسری دلیل تھی۔

لیکن انسان ہمیشہ وحی میں آمیزش کرتا رہا جس کا نتیجہ ہمیشہ یہ رہا کہ دین مذہب میں بدلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین ملتا تھا' لیکن مفاد پرست عناصر اسے ہمیشہ مذہب میں تبدیل کرتے رہے۔ حضور ﷺ سے پیشتر تمام انبیاء کو دین ملا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی دین ملا۔ یہ دین ہمیشہ غالب آتا رہا لیکن ان کے متبعین اس کو مذہب میں بھی بدلتے رہے۔ حضور ﷺ سے کافی عرصہ پیشتر سے دین کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا تھا کہ حضور ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی اور حضور ﷺ نے دین کا نظام پھر قائم فرما دیا۔ مگر وائے بر حال ما کہ ہم مسلمانوں نے بھی پھر دین کو چھوڑ کر مذہب ہی اختیار کر لیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وحی الٰہی انسانی آمیزش سے محفوظ رہی۔ مجموعی حیثیت سے انسانیت نے دین کے نظام سے فوائد حاصل ہی نہیں کیے۔ اسی لیے ہمیں دین کے قیام کے فوائد نظر نہیں آتے۔ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ حضرات جس قدر اعتراضات کرتے ہیں وہ سب مذہب پر ہوتے ہیں' دین تو ان کے سامنے ہوتا ہی نہیں۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں ہے۔ ہمارے علماء کرام جو وحی کے متبع ہونے کے مدعی ہیں جب ان کے سامنے ہی دین کا تصور نہیں ہے تو عام Layman کے سامنے دین کا تصور کس طرح آ سکتا ہے۔ ''اتباعِ دین سے دنیاوی مفادات بھی حاصل ہوتے ہیں''۔ یہ ایک ایسا عنوان ہے کہ اس پر ہمارے ایک ہزار سال کے سابقہ لٹریچر میں کسی نے ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا اور نہ کبھی ہمارے علماء مفسرین کے سامنے یہ نظریہ آیا۔ یہ شرف صرف تحریک طلوع اسلام کو حاصل ہے کہ اس تحریک نے اس نکتہ کو اٹھایا۔ قیام پاکستان سے پیشتر بھی علماء کرام کے سامنے اس نکتہ کو رکھا مگر افسوس کہ یہ نکتہ ہمارے علماء کرام کے سر کے اوپر سے ہی گذر گیا۔ وہ اس Point کی Significance کو سمجھ ہی نہیں سکے جس کا ماحصل اس مضمون کا عنوان ہے۔ اس عنوان کی تفصیل قرآنی آیات کی تائید کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ اس موضوع کی وضاحت ہو جائے اور آپ خود اس بات سے Convince ہو جائیں

کہ یہ نکتہ صرف طلوع اسلام نے پیش کیا ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے ''مذہب'' خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی' نجی' پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق انسان اور خدا کے درمیان پرستش (Worship) سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے gauge کرنے کا کوئی خارجی معیار نہیں ہے۔ یہ خالص انفرادی Subjective احساس کا نام ہوتا ہے جو ہر شخص کو اسکی مذہبی رسوم ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو مسجد میں جو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ہندوؤں کو وہی سکون منادر میں مل جاتا ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں میں اس کی مثال واضح ہے۔ جو حضرات قبر پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں' ان کو دربار جا کر' بے حد سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے لیکن جو حضرات قبر پرستی کے منکر ہیں' ان کے لئے پیر صاحب کی قبر صرف مٹی کا ایک ڈھیر ہے وہ اس کے علاوہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مذہب میں کسی معاشرہ اور کسی حکومت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر معاشرہ اور ہر حکومت میں انسان کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کی یہ صورت نہیں ہے۔ دین اس نظام حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی و اجتماعی امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کے لئے مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کا ہونا ضروری ہے۔

مضمون کے عنوان کے ثبوت کو قیام پاکستان سے پیشتر سے شروع کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا کانگرس اور اس کی ہمنوائی میں ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ تھا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس لئے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں' لیکن چونکہ ہندو اکثریت میں تھے اور ہمیشہ اکثریت ہی میں رہے' اس لئے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت رہتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام اور محکوم بن کر رہتے اور اپنی مذہبی رسوم بھی سابقہ دور کے مطابق ادا کرتے رہتے۔ لیکن اس کے برخلاف قرآنِ کریم کا نظریہ یہ تھا (اور ہے) کہ اشتراک

دین قومیت کا معیار ہے' اس کے علاوہ قومیت کی Definition قرآن کے خلاف ہے' ہندوؤں کے نزدیک دوقومی نظریہ کی مخالفت سیاسی نوعیت کی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک تو دوقومی نظریہ کی حمایت ان کا دینی تقاضہ تھا۔ ان کا دینی تھا کہ انہیں ایک الگ ملک اس لئے ملنا چاہئے تاکہ وہ اس میں اپنا نظام اور اپنا دین قائم کرسکیں۔ اس دینی تقاضہ کو پورا کرنے سے انہیں یہ سیاسی مفاد حاصل ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کی غلامی سے آزاد ہوکر ایک آزاد ملک میں رہیں۔ اگر ان کے دین کا تقاضہ نظام کا قیام نہ ہوتا' تو وہ آزاد ملک کا مطالبہ نہ کرتے۔ یہ صرف ان کے دین کے تقاضہ کو پورا کرنا تھا کہ ان کو ایک آزاد ملک حاصل ہو۔ اس طرح دین کے اتباع سے ان کو لازم تھا کہ انہیں ایک الگ ملک ملے۔ چنانچہ پاکستان محض اتباع دین کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس طرح مسلمانوں کی دنیا دین سے وابستہ ہوجاتی ہے اور دین و دنیا الگ الگ نہیں رہتے یہ نکتہ طلوع اسلام نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس دور کے علماء کے سامنے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تائید کے ساتھ پیش کیا لیکن افسوس کہ چونکہ اس دور کے علماء دین کے تصور سے عاری اور مذہب کے پجاری تھے وہ اس نکتہ کو Catch نہیں کرسکے۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ مسلمانوں کو غالب رہنے کا حکم دیا ہے۔ اَنتُمُ الاَعْلَوْنَ اِن کُنتُم مُّؤْمِنِینَ (۳/۱۳۹) اگر تم مومن ہوگے تو تم ہی غالب رہوگے۔ وَلَن یَجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکَافِرِینَ عَلَی الْمُؤْمِنِینَ سَبِیْلاً (۴/۱۴۱) اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں دی۔ قوت اور حد درجہ قوت فراہم کرنے کا حکم دیا (۸/۶۰)۔ یہ سب امور مسلمانوں کے دین کے تقاضے ہیں مسلمان ان تقاضوں کو جس قدر پورا کریں گے انہیں دنیا میں غلبہ حاصل ہوگا۔ اور اس طرح دنیاوی مقاصد حاصل ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَاکُمْ اُمَّةً وَسَطاً لِّتَکُونُوا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُونَ الرَّسُولُ عَلَیْکُمْ شَھِیْداً (۲/۱۴۳) اور اس طرح تم کو عادل امت بنایا تاکہ تم ساری انسانیت کی نگرانی کرو اور تمہارا رسول

(اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہاری نگرانی کرے۔ اس آیہ کریمہ پر عمل کرنا دین کا تقاضہ ہے اس تقاضے کو پورا کرنے سے دنیاوی مفادات ازخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ (۱) تمام مسلمان ایک امت بنے رہیں۔ ان میں آپس میں تفرقہ نہیں ہوسکتا۔ (۲) یہ امت اپنے فائدے کے لئے وجود میں نہیں آتی بلکہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے انسانیت کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ امت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پر ہوگی اور اس طرح ان سب کی نگران (۳) تیسرا مفاد یہ ہے کہ اس کا مرکزِ ملت خود اس ملت کا نگران رہتا ہے۔ اس آیہ کریمہ پر عمل کرنے اور دین کے اس تقاضہ کو پورا کرنے سے یہ مندرجہ بالا مقاصد و مفادات حاصل ہوتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم (۸/۲۴) اے ایمان والو اللہ و رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارے تاکہ وہ پکار تم کو زندہ کر دے اللہ و رسول کی آواز پر استجابت دین کے فرائض میں شامل ہے اس کے نتیجہ میں مردہ قوم میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو دنیاوی مقاصد میں سے بہترین مقصد ہے۔ سورہ نور میں ارشاد باری ہے کہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے (۲۴/۵۵) جہاں تک معاشی مفادات کا تعلق ہے' دین کے اتباع سے ہر شخص کو روزی فراہم ہو جاتی ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کہیں دین کا اتباع کیا جائے اور کوئی شخص بھوکا رہے (۶/۱۱)۔ دین کے اتباع سے معاشرے میں خوف و حزن باقی نہیں رہتا۔ غرض اس بارے میں بے شمار آیات کریمات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے اتباع سے نہ صرف آخرت میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سیاسی و معاشی مفادات کا حصول ہے۔

ہمارے ہاں جو خالص عبادات شمار کی جاتی ہیں اور جو دین کے ارکان کہے جاتے ہیں' تو ان سے بھی مقصود دنیاوی فلاح و بہبود ہے۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے اقتدار شرط

ہے (۲۲/۴) اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا لازمی نتیجہ اقتدار غلبہ تمکن و عروج ہے۔ حج اور روزوں کی حکمت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ (۲/۱۸۳) حج کے لئے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سالانہ اجتماع امت مسلمہ اس لئے قائم کرتی ہے کہ ساری دنیا کے لوگ آ کر یہ دیکھیں کہ مسلمان ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ امور سرانجام دے رہے ہیں (۲۲/۲۸)' حج سے مقصود پرستش کی ادائیگی نہیں ہے۔ جہاد تو ہے ہی خاص اس لئے کہ اس کے ذریعے نظام خداوندی کو اس دنیا میں قائم کیا جائے تا کہ ساری دنیا میں سکون اور اطمینان کے حامل معاشرے قائم ہوں۔ غرضیکہ ان تمام عبادات کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں سیاسی و معاشی مفادات کا حصول اور ساری انسانیت کے لئے بہترین معاشروں کا قیام اور ان تمام ارکان سے مقصود انسانیت کی خدمت ہے۔

اس کے برخلاف آپ غور فرمائیں کہ کسی بھی ''مذہب'' کے اتباع سے اس دنیا میں فوائد حاصل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس مذہب کے اتباع سے انسانیت کی خدمت ہوتی ہے۔ خود ہمارے ہاں جب دین مذہب میں بدل گیا مندرجہ بالا تمام آیات کی تشریح و تفسیر اس طرح کر دی گئی کہ نہ تو ان سے دنیا کا کوئی تعلق باقی رہا' اور نہ ہی ان کے اتباع سے اس دنیا میں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ارکان عبادت کی صورت ہے' ان تمام ارکان کو صرف پرستش میں تبدیل کر دیا گیا اور ان ارکان کے ذریعے کسی قسم کی دنیاوی معاشی و سیاسی فوائد حاصل کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہا۔ ہم مسلمان اس معاملہ میں بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمارا دین اس درجہ اچھا اور قابل عمل ہے کہ اس کے اتباع سے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور یہی اس دین کے وحی الٰہی پر مبنی ہونے اور منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ سارے فوائد جب ہی حاصل ہوتے ہیں جب ہم قرآن کو بطور دین کے اختیار کریں۔ بطور مذہب کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ہماری موجودہ پوزیشن ہے۔

یہ بات خوب ذہن نشین فرمالیں کہ مذہب کا منطقی نتیجہ انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور ہے۔ جب تک ہم مذہب کے انڈر رہیں گے انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور باقی رہے گا۔ مذہب تو ہوتا ہے انفرادیت کا داعی اور اس کا متقاضی اس لئے ہم مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور چھوڑ کر نظام کی اطاعت کو اپنا مطمح نگاہ بنائیں کہ اسی کے اتباع سے دنیاوی مفادات اور اخروی درجات حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں پھر ایک بار تحدیث نعمت کے طور پر تحریر ہے کہ اس بارے میں تحریک طلوع اسلام اور اس کے محترم المقام بانی و داعی الی اللہ کو جس درجہ بھی خراج تحسین پیش کیا جائے وہ کم ہے کہ انہوں نے ایک ہزار سال بعد دین و مذہب کا فرق واضح کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اتباع دین سے دنیاوی مفادات Buy-Product بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درود کا دینی مفہوم

قرآن کریم حیات اجتماعی کا داعی ہے اور حیات انفرادی کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم میں خطاب ہمیشہ جمع کے صیغے میں یاایھا الذین آمنوا کہہ کر ہی کیا گیا ہے۔ قوانین و احکام بھی اجتماعی طور پر مخاطب کر کے ہی دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ دعائیں بھی اجتماعی ہیں ہر شخص کی الگ الگ دعا نہیں ہے۔ اجتماعیت کی یہ خصوصیت دین میں ہوتی ہے۔ مذہب میں اجتماعیت نہیں ہوتی۔ مذہب میں ہر فرد کی اپنی نجات پیش نظر ہوتی ہے اور اس تصور کے ماتحت وہ خدا سے اپنا ذاتی تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ جس قدر علائق دنیاوی سے آزاد ہوگا' اسی قدر خدا کے قریب ہوگا۔ چنانچہ وہ پہلے دنیا کو ترک کرتا ہے۔ ترک دنیا' ترک عقبیٰ' ترکِ ترک پر عمل کرتا ہے۔ وہ کسی حجرہ یا زاویہ میں گوشہ نشین ہو جاتا ہے اور دنیا کے کام کاج دنیا والوں کے سپرد کر دیتا ہے اور خود پرستش خداوندی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کی صورت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ دنیا کے معاملات و تنازعات کو وحی الٰہی کے مطابق طے کرنا دین ہے۔ دین کے لئے معاشرہ' اور وہ بھی ایسا معاشرہ کہ جس میں قوانین وحی الٰہی کا نفاذ ہو سکے ضروری ولابدی ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کے اندر رہ کر افراد معاشرہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے یعنی تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ تزکیہ نفس تجرد گاہوں میں نہیں ہوسکتا کیونکہ وحی کے سارے احکام اجتماعی ہیں اس لئے زوایا اور گوشوں میں ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں تصوف کے زیر اثر جو لوگ تنہا حظیروں اور حجروں میں تزکیہ نفس

کرتے ہیں، حقیقت میں وہ تزکیہ نفس نہیں ہوتا۔ وہ تو نفس کو مارتے ہیں۔تزکیہ نفس کوئی ایسی چیز نہیں جس کو آپ خود محسوس نہ کرسکیں۔معاشرہ کے ہرعمل کے خلاف آپ کا Sponteneous ردِعمل جس قدر صفات خداوندی کے مطابق ہوگا اسی قدر آپ کا تزکیہ نفس ہوتا چلا جاتا ہے۔ایک ہی عمل کا ردعمل ایک شریف آدمی کا اور ہوتا ہے اور ایک کمزور سیرت کا اور ہوگا۔ روزمرہ کے ردعمل سے آدمی خود اپنی سیرت کی پختگی، تزکیہ نفس کا اندازہ کرسکتا ہے۔حجروں، حظیروں، گوشوں، کونوں میں بیٹھ کر، یہ صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کو تزکیہ نفس سے کیا علاقہ؟

قرآنِ کریم چونکہ انفرادی پرستش کا قائل نہیں ہے۔اس لئے اس کے نزدیک اجتماعی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہے۔اسلامی حکومت چونکہ قرآنی قوانین جاری کرتی ہے اس لئے اس کی اطاعت قرآنی قوانین کی اطاعت اور اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔چونکہ اسلام میں انفرادی عبادت کا تصور ہی نہیں ہے۔اس لئے صلوٰۃ کا قیام بھی اجتماعی ہے۔اپنے تمام معاملات کو وحیِ الٰہی کے تابع کرنا اقامتِ صلوٰۃ ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا قائم کرنا ہے۔ ہمارے ہاں جو اجتماعات صلوٰۃ (نماز) ہوتے ہیں وہ بھی اس نظام کا جزو ہوتے ہیں اور ان سے مقصد اسلامی حکومت کو قائم کرنا اور اس کو دائم رکھنا ہوتا ہے۔وہ حکومت کے ماتحت، اس کی نگرانی میں ہی قائم ہوتے ہیں۔ محلے کے لوگوں کا چندہ جمع کرکے، ایک مولوی کو مقرر کرکے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا، اور اس کو اقامتِ صلوٰۃ سمجھنا'' حدیث بے خبراں'' ہے۔

ہم مسلمانوں میں جب دین کی اصل صورت نہیں رہی تو ہماری اطاعتِ خداوندی بھی رسوم و پرستش میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔نوافل، وتر، سنتیں، تہجد اور وظائف، درود شریف، سب شروع ہوگئے۔درود شریف پر ہمارے ہاں بہت زور دیا جاتا ہے اور اس کو بڑی اہمیت و افضلیت دی جاتی ہے۔ ہر وظیفے سے پیشتر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھا جاتا ہے۔نعت خواں حضرات بھی اعلان کرتے ہیں۔

پڑھو درود پڑھو مومنو درود پڑھو
درود سے کبھی غافل نہ ہو درود پڑھو

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

ہر مرض کی دوا ہے صَلِّ علیٰ محمد

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو درود شریف ہم پڑھتے ہیں اور جو ہمارے ہاں مروّج ہے۔اس کی کوئی سند قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔سورۂ احزاب کی آیہ نمبر 56 سے اس کو اخذ کیا جاتا ہے۔اس آیت کی تشریح تو بعد میں پیش خدمتِ عالی ہوگی۔ جو چند سوالات پیدا ہوتے ہیں پہلے ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(1) مروجہ درود کے یہ الفاظ ہیں۔

الھم صلی علی محمد وآل محمد کما صلیت علی ابراھیم
وآل ابراھیم انك حمید مجید۔
اے اللہ تو محمد وآل محمد پر رحمت بھیج جس طرح تونے ابراہیم وآل ابراہیم
پر رحمت بھیجی۔

اس میں خطاب اللہ تعالیٰ سے رحمت بھیجنے کا ہوتا ہے۔روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ اور ملائکہ خود بھی یہی درود پڑھتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام درود شریف کے فضائل میں یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ خود بھی ہمارے عمل میں شریک ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم اپنے خداوند متعال، اس خالقِ مطلق، اس ذاتِ بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ پر صلوٰۃ یعنی رحمت بھیجے۔اور وہ ہماری دعا قبول فرما کر حضور پر صلوٰۃ بھیج دیتا ہے۔لیکن یہی خدا تعالیٰ ہمارا مالک وخالق وہ ذاتِ بزرگ و برتر جب یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ یا اللہ تو محمد ﷺ پر صلوٰۃ بھیج تو وہ کس خدا سے یہ دعا کرتا ہے اس کا تو کوئی اور خدا نہیں ہے یہ بات غور کی متقاضی ہے۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں جب اپنا مشن شروع کیا تو لوگ آپ کے مشن کی صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن جو لوگ اسلام کے خلاف اور اس کے دشمن تھے وہ تو حضور ﷺ کی ایک ایک بات کو تنقید کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جو باتیں ان کے ہاتھ آ جاتیں وہ ان کو اچھالتے تھے۔ جب حضور ﷺ اپنی زندگی میں نماز کے دوران یہ درود شریف پڑھتے ہوں گے اور اپنے اور اپنی اولاد پر درود بھیجتے ہوں گے تو اس سے مخالفین کو بڑا اعتراض ہاتھ آتا ہو گا کہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ صرف اپنے کو اور اپنی اولاد کو Project کر رہے تھے۔ حالانکہ اس آیت سے قبل آیت نمبر 56 میں ہے کہ:

اللہ و ملائکہ مومنین پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

اس آیۂ کریمہ نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ بہر حال یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ جیسی بلند ترین سیرت کا انسان اس طرح اپنی اور اپنی اولاد کی تعریف کو جزو دین و جزو عبادت بنا سکتا ہے۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہم سنتیں رسول اللہ ﷺ کے نام کی پڑھتے ہیں تو حضور ﷺ فرض نماز کے بعد جب سنتیں پڑھتے تھے تو وہ کس کے نام کی ہوتی تھیں۔

ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ آل ابراہیم تو سارے یہودی ہیں ان پر درود بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر بر سبیل تنزل آپ مولوی حضرات کے درود کو درست تسلیم کر لیں تو اس آیۂ کریمہ میں تو آل کا ذکر دور دور تک بھی کہیں نہیں ہے۔ ہمارے ہاں آل کے علاوہ ازواج، اصحاب، ذریت کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔ جب قرآن سے سند کی ضرورت ہی نہیں رہی تو آپ جس کا جی چاہے اضافہ کر سکتے ہیں۔ جب آل کا اضافہ بے سند ہے، تو ان کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

ارشاد عالی ہوتا ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً o (33/56)۔

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر اے ایمان والو رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے تفسیر عثمانی میں فرمایا:

''حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہوا (یعنی نماز کے تشہد میں جو پڑھا جاتا ہے السلام علیک ایھا النبی ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ) صلوٰۃ کا طریقہ بھی ارشاد فرما دیجئے جو نماز میں پڑھا کریں۔ آپ ﷺ نے یہ درود شریف تلقین کیا'' اللھم صل علی محمد و آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم انك حمید مجید۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے جو صلوٰۃ تحریر کی ہے ہمارے ہاں صرف اس کا پہلا حصہ درود شمار ہوتا ہے دوسرا حصہ اللھم بارک سے آخر تک جو ہے وہ درود میں شامل نہیں کیا جاتا۔ معلوم نہیں کہ ہمارے علماء کرام اس کی کیا توجیہہ فرماتے ہیں۔ مختلف تفاسیر میں کچھ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ تقریباً سب نے یہی تحریر فرمایا ہے کہ صحابہؓ کے استفسار پر حضور ﷺ نے صلوٰۃ کے متعلق یہی الفاظ بیان فرمائے۔

تفقہ فی القرآن کے لئے تصریفِ آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کے کوئی اور طریقہ تفقہ اختیار کرنے کو قرآن کریم سے فرار قرار دیا گیا ہے (6/46)۔ خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کا واحد طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ اسی لئے خود حضور ﷺ کا طریقۂ تدریس

بھی یہی تھا کہ آپ تصریفِ آیات ہی سے درس قرآن دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ o(6/105)۔

اور اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا۔

(اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔ یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا۔ درود شریف کے جو الفاظ حضور ﷺ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ قرآن کی تصریف آیات کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے یہ حضور ﷺ کے کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ اب آپ کے سامنے آیت کی تشریح تصریفِ آیات کے مطابق پیش کی جاتی ہے۔

ارشاد مبارک ہوتا ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (14/1)۔

اے رسول یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمہارے پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لاؤ۔

آیۂ کریمہ میں قرآن کریم کا مقصد انسانیت کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لانا بتایا گیا ہے۔ اس آیت سے چند آیات بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (14/5)۔

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاؤ۔

آیت کریمہ نے فرعونی معاشرہ کو ظلمات سے تعبیر کیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنی قوم کو اس ظلمانی معاشرہ سے نکال کر نورانی معاشرہ میں لے آئیں۔ حضرت موسیٰؑ حکم خداوندی کے مطابق اس قوم کو فرعون کی غلامی سے نکال کر وادیٔ سینا میں لے آئے جہاں انہیں پوری پوری آزادی حاصل تھی اور جہاں انہوں نے بتدریج، آہستہ آہستہ قانون خداوندی کا نفاذ کر کے قوانین خداوندی کے ماتحت زندگی گذارنی شروع کر دی۔ اس معاشرہ کو قرآن کریم نے نورانی معاشرہ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے لیکن حضورﷺ کی بعثت ساری انسانیت کے لئے تھی اس لئے ان کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن کی تعلیم کے ذریعے ساری انسانیت کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف، یعنی طاغوتی نظام سے نکال کر قرآنی نظام تک لے آئیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلَائِکَتُهُ لِیُخْرِجَکُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (33/43)۔

وہ وہی تو ہے جو تم پر درود (رحمت) بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جائے۔

یعنی صلوا علیکم کا نتیجہ "اخراج عن الظلمات الی النور" یعنی تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آنا ہے اور آیت نمبر (15/5) جس میں حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ ہے، اس کے پیش نظر عملاً طاغوت کے اندھیرے سے قرآنی حکومت کے نور کی طرف نکل آنا ہے۔

آیت کریمہ (33/56) صلوا علیہ و سلموا تسلیماً میں سلموا تسلیما

نے خود صلوا علیہ کی تفسیر کر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اسی سلموا تسلیماً کی تفسیر (4/65) میں یہ کہہ کر کی ہے کہ تمام مومنین اپنے تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلے رسول اللہ ﷺ سے کرائیں اور ان کی پوری پوری اطاعت کریں۔ ان دونوں آیات کے ملانے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صلوا علیہ و سلموا تسلیماً کوئی خیالی یا قولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک عملی پروگرام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین رسول اللہ ﷺ کی پوری پوری اطاعت کریں اور اس طرح تمام تنازعات کے فیصلے رسول اللہ ﷺ سے کرا کر نظام خداوندی کی اطاعت کر کے ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آ جائیں۔ صلوا علیہ کوئی زبان سے ادا کرنے کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد نظام خداوندی کو قائم کر کے، رسول اللہ کی پوری پوری اطاعت کرنا ہے۔ اس سے اگلی آیۂ کریمہ نے اس کی پھر وضاحت کر دی جبکہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (33/57)۔

جو لوگ اللہ و رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظ یوذون (اذیت دیتے ہیں) کے لفظ نے سلمو تسلیماً کی کھول کر تشریح کر دی کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایذاء دینے کے مقابلہ میں قرآن سلموا تسلیماً لایا ہے۔ یعنی پوری پوری اطاعت کرنا۔

آیۂ کریمہ (33/56) جس سے درود کا مفہوم اخذ کیا جاتا ہے، تصریفِ آیات سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور ملائکہ مومنین کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ ظلمت سے نکل کر نور کی طرف آ جائیں اور اللہ اور ملائکہ کا یہی عمل خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی ہے اور مومنین کو حکم خداوندی ہے کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہی عمل رکھیں یعنی ان کی نصرت کریں اور اس کا عملاً مفہوم یہ

ہے کہ ان کی پوری پوری اطاعت کریں۔

اس وضاحت کے بعد اب آپ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر ''مفہوم القرآن'' سے ملاحظہ فرمائیں تا کہ آیت کا مفہوم بالکل صاف ہوجائے۔

(ان قوانین کی اطاعت سے تمہیں خدا کی نصرت اور اس کی کائناتی قوتوں کی تائید حاصل رہے گی 33/43) یہی تائید و نصرت' تمہارے نظام کی مرکزی شخصیت' خود رسول کو بھی حاصل ہے۔لیکن تم اس اطمینان میں نہ رہو کہ جب خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تمہارے رسول کے ساتھ شامل ہے تو تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے عمل پیہم سے' رسول کے مشن کی تقویت کا موجب اور اس کے دست و بازو بنو اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاؤ' اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دل کے جھکاؤ کے ساتھ اس کی پوری پوری اطاعت کرو (4/65, 7/157, 33/43)۔

جیسا کہ اس سے پیشتر کئی مرتبہ تحریر کیا جا چکا ہے' رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے' اسلامی نظام کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔آیۂ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم ہے اور اس پر شدید اصرار ہے۔جو صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے۔ ہمارے ہاں درود شریف کے لئے اسلامی نظام کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ مذہب میں تو درود چند الفاظ کا دہرانا ہے۔لیکن وہ آیت جس سے درود کو اخذ کیا جاتا ہے۔اس میں درود کی کوئی گنجائش نہیں بنتی بلکہ اس آیت میں حضور ﷺ کی اطاعت پر اصرار ہے اور وہ بھی اسلامی نظام کے اندر۔

ہم مسلمان آج جس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تمام عملی پروگراموں کو چھوڑ کر محض زبانی

' کلامی رسوم ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ ہمارے سامنے نہ تو قرآنِ کریم کا پیغام اپنی اصل صورت میں ہوتا ہے اور نہ ہی ہم مروجہ رسوم کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح باقی رہے گا اور ہماری حالت اسی طرح رہے گی جب تک کہ ہمارے سامنے قرآن خالص نہیں آتا۔ اور جب تک ہم غیر قرآنی نظریات و رسوم کو چھوڑ نہیں دیتے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے

لندن سے محترم جناب اکرم قریشی صاحب نے چند سوالات کئے تھے۔ اس کے بعد ان کا دوبارہ تقاضا موصول ہوا۔ چونکہ یہ سوالات اہمیت کے حامل ہیں اور اکثر حضرات کو اس قسم کے شبہات کا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے جوابات طلوع اسلام میں طبع کئے جاتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ قرآن کریم کی خالص فکر کی اشاعت اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ قریشی صاحب نے فرمایا۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم وحی الٰہی ہے اور ہمیں بھی قول رسول یعنی احادیث سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحی ہے۔ جو حضرات حدیث کو نہیں مانتے وہ قرآن پر کس طرح ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا وحی ہونا تو احادیث سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص حدیث نہیں مانتا، تو وہ نماز کس طرح پڑھ سکتا ہے۔

(۳) حدیث سے انکار کرنے کے بعد، اطاعت رسول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اطاعت رسول کی عملی شکل کیا ہوسکتی ہے۔

محترم المقام جناب قریشی صاحب کے تین سوالات/اعتراضات جناب نے ملاحظہ

فرمائے' ان کے جوابات پیش خدمتِ عالی ہیں۔

جہاں تک حدیث کے انکار اور اقرار کا تعلق ہے اس کے متعلق تو ادارہ طلوع اسلام کا جو موقف ہے وہ مضمون کے آخر میں عرض کیا جائے گا۔ شروع میں جناب محترم مستفسر کے سوالات کے جواب ملاحظہ فرمائیں۔

صدرِ اول میں' حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی سرتوڑ کوششوں کی وجہ سے مکہ و مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ حضورﷺ کی سیرت اور اسلام کی تعلیم سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ اس کے فوری بعد خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا جس میں نہایت تیزی کے ساتھ فتوحات ہوئیں اور مفتوح ممالک کے عوام مسلمان ہوتے چلے گئے۔ احادیث کے ڈھیر تیسری صدی ہجری کے بعد جمع ہونے شروع ہوئے جبکہ مسلمان مراکو اور سپین سے لے کر سندھ تک پہنچ چکے تھے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کے حلقے کا وسیع سے وسیع تر ہونے میں اس وقت تک احادیث کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ان کے ذخیرے جمع ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی نسلیں جو آتی چلی گئیں وہ نسل در نسل ''پیدائشی مسلمان'' ہوتی چلی گئیں۔ آپ اس بات کو عملاً اپنے دور میں ملاحظہ فرمائیں' آج ساری دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں' ہم میں سے کتنے مسلمان ہیں جو احادیث کے ذریعے اسلام سے متعارف ہوئے۔ شروع میں لوگ حضورﷺ اور صحابہ کرامؓ کی محنتوں کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور اس کے بعد فتوحات اور نسلی طور پر ''پیدائشی مسلمان'' ہوتے چلے گئے۔ آپ حضرات میں سے کتنے ہیں جنہوں نے بخاری شریف یا صحیح مسلم شریف کے مطالعہ سے متاثر ہو کر' قرآن پر ایمان لائے۔ بلکہ حقیقت تو اس کے بالکل برعکس ہے کہ حدیث کی پوزیشن تو اس معاملہ میں بڑی کمزور ہے۔ آپ اگر احادیث کے ذخیرے پر اس نکتہ نگاہ سے غور فرمائیں' تو ان کتب میں قرآن کریم کی جمع و تدوین کے بارے میں ایسی ایسی روایات موجود ہیں جن کے مطالعہ کے بعد' مسلمان ہونا تو کجا' اچھا خاصا

مسلمان بھی قرآن و اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔ اس قسم کا مواد ادارہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں بڑی تعداد میں فراہم کیا گیا ہے۔ اس کو دوبارہ تحریر کرنے سے وقت ضائع کرنا ہے۔ ان روایات کے مطابق قرآن کریم حضور ﷺ کے عہد کے بہت عرصہ بعد مرتب ہوا۔ اس میں چند آیات جمع ہونے سے بھی رہ گئیں' کچھ غلط تحریر کر دی گئیں' اور اسی قسم کی دیگر ہفوات جمع کی گئی ہیں کہ ان کو ایک مضمون میں درج نہیں کیا جا سکتا' اور اس کے لئے کئی مضمون درکار ہیں۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے ایک مختصر سی تمہید پیش خدمت عالی ہے۔ اس کو بالکل Un-Biased ہو کر ذرا بغور مطالعہ فرمائیں کہ یہ بات بڑی اہم ہے۔

قرآن کریم کے ہر قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے قوانین کے مطابق جس قدر بھی اعمال کئے جائیں وہ سب عبادات ہیں۔ چونکہ قرآنِ کریم انفرادی تصور حیات کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور اجتماعی تصور حیات کا داعی ہے۔ اس لئے قرآن کریم یا اسلام کے قوانین کی اطاعت صرف معاشرہ کے اندر کی جا سکتی ہے۔ تنہا' انفرادی طور پر' خانقاہوں' اور تجرد گاہوں میں قرآن کے قوانین پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ انسانی ذات کی تربیت یا اس کی نشو و نما صرف معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے۔ الگ انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم کے اتباع سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے حکم فرمایا کہ تم جب دوسروں کے گھروں میں داخل ہو تو داخل ہونے سے پیشتر گھر والوں سے اجازت حاصل کر لو۔ قرآن کریم نے غیبت کرنے سے منع فرمایا ہے کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردار بھائی کے گوشت کو کھانا ہے۔

قرآن کریم نے حکم دیا کہ جب قرض کا لین دین کرو تو اس کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔ قرآن نے حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑایا کرو۔ قرآن نے حکم دیا کہ سخت تنگی کے باوجود ایک دوسرے پر ایثار کیا کرو۔ یہ ٹھیٹ دنیاوی معاملات ہیں' لیکن ان احکامات کی اطاعت'

عبادت خداوندی ہے اور یہ عبادت صرف معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن نے زکوٰۃ و انفاق کا حکم دیا کہ اس سے تربیت ذات ہوتی ہے۔ قرآن نے فرمایا کہ جو اپنا مال دوسرے پر خرچ کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس قسم کے تمام احکامات پر عمل کرنا ایک معاشرہ کا متقاضی ہے۔ جو آدمی جنگل میں رہتا ہے یا جو شخص رہبانیت اختیار کر لیتا ہے' اسے نہ تو ان احکامات کی ضرورت ہے اور نہ وہ ان پر عمل کر سکتا ہے۔ بلکہ درست بات تو یہ ہے کہ وہ انسانیت کے Level پر زندگی ہی بسر نہیں کر رہا ہے۔ تزکیہ نفس صرف اسلامی حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اسی سے تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ عقیدہ انفرادی عبادت کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے اور جب تک مسلمانوں میں انفرادی عبادت کا تصور باقی رہے گا وہ کبھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کر سکیں گے۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف اجتماعی طور پر ہوتی ہے انفرادی طور پر الگ الگ نہیں ہو سکتی اور یہی خالص دین الٰہی ہے۔

لیکن دین کے اس تصور کے بالکل برخلاف مذہب کا تصور ہے۔ جس کی کوئی واضح تعریف (Definition) نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض ذہنی نظریہ کا نام ہے۔ یہ ایک بالکل Subjective داخلی اور پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے' اس میں چند رسوم ادا کرنی ہوتی ہیں جو ہر شخص کسی جگہ بھی ادا کر سکتا ہے۔ مذہب کو دنیا کے کسی ضابطۂ حیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' کسی ملک میں کوئی بھی ضابطۂ حیات ہو' مذہب کی رسوم ہر جگہ ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس میں خدا اور انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے' اور اسی وجہ سے اس میں انفرادی عبادت کی جاتی ہے۔

دین اور مذہب کے یہ دو الگ الگ تصورات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اجتماعی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسانی ذات کی تربیت صرف معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔ جس کی مثالیں جناب نے ملاحظہ فرمائی ہوں گی اور عبادت کا مطلب قوانین خداوندی کی اطاعت ہے جو انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ اس کے برعکس انفرادی (مذہبی) صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ تزکیہ

نفس معاشرہ کے بغیر بھی ہوسکتا ہے اس کے لئے اوراد و وظائف، تسبیح وتہلیل، مجاہدہ وغیرہ کرنا ہوتا ہے اور اس سے مقصود اللہ کی پرستش Worship ہے۔ اس تصور کی بنیاد خالص رہبانیت پر استوار ہوتی ہے۔ جو قرآنِ کریم کے تصور عبادت کے بالکل خلاف ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ خود اندازہ فرمائیں کہ دین میں انفرادی صلوٰۃ (نماز) کا کیا مقام ہوسکتا ہے۔ (نماز کے متعلق ادارہ طلوعِ اسلام کی رائے اور دیگر تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مضمون بعنوان ''نماز کی اہمیت'' جو اسی شمارے میں شائع کیا جارہا ہے۔)

تاہم، اگر اس تمہید کو آپ نظرانداز فرمادیں، تو بر سبیل تنزل عرض ہے کہ جہاں تک نماز پڑھنے کا تعلق ہے کہ احادیث ماننے کے بغیر کس طرح نماز ادا کی جائے تو یہ بھی ایک Eye-Wash ہی ہے۔ کیونکہ احادیث کو ماننے کے باوجود بھی آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ نماز کا صحیح طریقہ کیا ہے اور حضور ﷺ کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ آج بھی سب فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں۔ احادیث کے ذریعے ان کا تعین ہی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کے لئے غلبہ واقتدار شرط قرار دیا ہے (۲۲/۴۱)۔ نیز اس کے علاوہ مختلف مقامات پر خود صلوٰۃ کے ارکان کی وضاحت کردی ہے کہ اس کے بعد احادیث کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ قرآن کریم نے فرمایا: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳)۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب (۹۶/۱۹)۔ سجدہ کرو اور قرب خداوندی حاصل کرو۔ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً (۲۵/۶۴)۔ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے رب کے لئے راتوں میں سجدہ وقیام کرتے ہیں۔ ان مقامات نے نماز کے ارکان کی خود وضاحت کردی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (۵/۸)۔ عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ اسی طرح بیشتر مقامات پر حکم ہے اقیموا الصلوٰۃ، عدل فراہم کرنے میں حضور کے عہد سے لے کر آج تک بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حضور ﷺ کا دور سادہ تھا اس

لئے عدل کرنے کے طریقے بھی سادہ تھے کہ جن سے عدل حاصل کرنا بھی یقینی نہیں تھا۔ اس دور میں عدل کرنے کے طریقے بدل گئے، اور سائنٹفک طریقوں سے عدل حاصل کرنے میں زیادہ امکان ہے کہ جج صحیح صورت حال پر پہنچ جائے۔ اسی طرح صلوٰۃ کا طریقہ ہے کہ اس میں بھی اپنے اپنے دور کے مطابق تبدیلیاں کرنی ضروری ہیں۔ قرآن کریم نے انسانیت سے متعلق تمام ضروری چیزوں کی ہدایت خود مہیا کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: جب کوئی افواہ سنو تو اس کی تصدیق کر لیا کرو۔ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہو (۲۷/۲۴)۔ عائلی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کیں، یہاں تک کہ معمولی معمولی معاشرتی ہدایات بھی دی ہیں اگر نماز کی جزئیات کوئی اہمیت رکھتی ہوتیں تو قرآن کریم ان کو خود بیان کر دیتا۔ جب قرآن نے خود کوئی اہمیت نہیں دی تو اب ان کو احادیث کی کتابوں میں تلاش کرنا ہی مناسب نہیں ہے۔

اس وقت نماز ایک قومی وملی شعائر کی حیثیت رکھتی ہے، البتہ جب یہ دین کے نظام میں بطور صلوٰۃ ادا کی جانے لگے، تو یہ ارکان دین میں شمار ہوگی۔ قومی وملی شعائر اور ارکان دین میں واضح امتیاز یہ ہے کہ ارکان دین وہ نتائج ضرور برآمد کرتے ہیں جن کا وعدہ قرآن نے کیا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ارکان قرآن کریم کے موعودہ نتائج برآمد نہ کریں تو وہ ارکان دین نہیں رہتے وہ قومی وملی شعائر ہو جاتے ہیں جیسا کہ اب ہمارے ہاں نماز کی کیفیت ہے۔

جہاں تک قریشی صاحب کے تیسرے سوال کا تعلق ہے، تو اس کا جواب کئی مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ تاہم ان کے حکم کی تعمیل میں عرض ہے کہ:

یہ بات واضح رہے کہ حضور ﷺ کی اپنے عہد مبارک میں تین مختلف حیثیتیں (Positions) تھیں۔

(ا) حضور ﷺ اللہ کے رسول تھے اور یہ حضور ﷺ کی منفرد حیثیت تھی، اس حیثیت میں حضور ﷺ کے ساتھ اور کوئی شریک نہیں تھا۔ وحی کے جو احکامات حضور ﷺ پہنچاتے تھے، ان

احکامات کی سرانجام دہی میں حضورﷺ کی اطاعت کرنا ضروری تھا۔

(۲) دوسری حیثیت حضورﷺ کی ذاتی تھی۔ حضورﷺ جو ذاتی تجویز یا خواہش کسی کو پیش فرماتے' ان پر عمل درآمد کرنا ضروری نہیں تھا' اس لئے کہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت فرض نہیں تھی۔ اگر حضورﷺ کسی روز چاول تناول فرماتے' اور دوسرے صحابہؓ کو ارشاد فرماتے کہ وہ بھی چاول ہی کھائیں تو یہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ اسی طرح اگر حضورﷺ اپنے کسی صحابیؓ کو فرماتے کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی مقام پر ملازم کرا دیں' تو ضروری نہیں تھا کہ وہ صحابیؓ اپنے بیٹے کو اسی جگہ ملازم کرا دیں۔ یہ بات کہ حضورﷺ کی ذاتی 'بشری اطاعت فرض نہیں تھی' اس کے دلائل اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ دیے جا چکے ہیں ان کا بار بار دہرانا' قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ تاہم مختصراً حوالے پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(۱) اس بارے میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ حضرت زبیر نے حضورﷺ کے اصرار کے باوجود حضرت زینبؓ کو طلاق دی' لیکن پھر بھی قرآن نے ان کے نام کے ساتھ أَنعَمَ اللَّهُ عَلَيهِ وَأَنعَمتَ عَلَيهِ (۳۷/۳۳)۔ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(۲) حضرت اویسؓ بن صامت اور حضرت خولہؓ کا واقعہ جس کا ذکر سورۃ مجادلہ کی پہلی آیۂ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

(۳) مومنین کے علاوہ حضورﷺ کو خود بھی شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ کیونکہ ذاتی اطاعت میں مشورہ کو دخل نہیں ہوسکتا۔

(۴) سورہ (۶۰/۱۲) میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی اطاعت صرف معروف میں' یعنی اسلامی حکومت کے احکامات کی سرانجام دہی میں ضروری و لازمی تھی۔ وَلَا يَعصِينَكَ فِي مَعرُوفٍ (۶۰/۱۲)۔ معروف کے علاوہ' حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔

تیسری حیثیت حضورﷺ کی ایک سربراہِ مملکت کی تھی اس میں بھی پہلی صورت کی طرح

حضورﷺ کی اطاعت لازمی تھی۔قرآنِ کریم میں جہاں جہاں حضورﷺ کی اطاعت فرض کی گئی ہے۔(۶۵/۴/۶۱،۴/۵۱،۲۴/۲۴)۔وہاں حضورﷺ کی یہی حیثیت پیش نگاہ ہوتی تھی۔اس حیثیت میں بھی حضورﷺ کی ذاتی اطاعت فرض نہیں تھی، حضورﷺ کے اپنے عہد مبارک میں بھی قرآنی احکامات کی اطاعت کے سلسلہ میں، اگر مقدمات صرف اولی الامر تک ہی جاتے تھے، اور اولی الامر اپنے طور پر فیصلہ کر دیتے تھے تو ان اولی الامر کی اطاعت ہی حضورﷺ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ حضورﷺ کی یہ اطاعت ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے ہوتی تھی۔اور حضورﷺ کے انتقال کے بعد، یہی اطاعت آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہوگئی۔حضورﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت، ان کے بعد حضرت عمرؓ کی اطاعت، خود حضورﷺ کی اطاعت تھی۔اور اب بھی حضورﷺ کی اطاعت کرنے کی عملی شکل یہی ہے کہ خلافت راشدہ کا احیاء کیا جائے اور اس کے سربراہ کی اطاعت کی جائے۔کیونکہ خلیفہ راشد کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت یا عبادت خداوندی ہو گی۔سربراہِ مملکت اسلامیہ کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے جو صرف اجتماعی طور پر ادا کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک حدیث کے ماننے اور نہ ماننے کا سوال ہے تو اس دور میں جب تک دین کا عملاً کوئی قیام نہ ہو، ہر وہ حدیث جو قرآن کریم کے مطابق ہے، وہ درست ہے لیکن جو حدیث قرآن کے خلاف ہے، طلوع اسلام اس کو حدیث رسول ماننے کو تیار نہیں۔کیونکہ اس کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن کریم ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہاد کے بارے میں ایک اہم نکتہ

قرآن کریم عقل انسانی کی بڑی تعریف کرتا ہے لیکن عقل انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ غلطی کرتی ہے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ مفادات کے تحفظ اور آپس میں ٹکراؤ کی وجہ سے انسانی معاشروں میں تنازعات و اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں جو تنازعات اور فسادات انفرادی طور پر یا بین الاقوامی سطح پر واقع ہو رہے ہیں وہ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ ہر قوم اپنا مفاد پیش نظر رکھتی ہے اور دوسری اقوام کو حد درجہ Exploit کرتی ہے۔ دنیا میں جو بگاڑ عقل کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے' اس کا تدارک عقل سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز عقل کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو فساد عقل کی وجہ سے ہوتا ہے' عقل اس کا تدارک کیسے کر سکتی ہے؟ اس کا تدارک صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہو سکتا ہے جو انسانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرتی ہے۔ وحی الٰہی کے سامنے عدل مطلق ہوتا ہے جبکہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین میں عدل ایک Relative Term ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انسانی قوانین بدلتے رہتے ہیں' آج کل اس کی واضح مثال Terrorism ہے۔ آج ساری دنیا میں Terror اور تشدد عام ہو رہا ہے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس کی کوئی جامع و مانع تعریف Definition نہیں ہو سکی نہ ہو سکتی ہے۔ ایک قوم کے نزدیک جو اپنا حق و استحقاق ہے' وہی چیز دوسری قوم کے لئے تشدد اور Violence ہے۔ ساری دنیا کے مفکرین بھی جمع ہو جائیں وہ اس

کی جامع و مانع تعریف نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ سب کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ مملکت کے قوانین کی بنیاد اس مملکت کے مصالح ہوتے ہیں جبکہ دین کی اساس ضابطۂ حیات ہوتی ہے اور دین کے پیشِ نظر ساری انسانیت کا مفاد ہوتا ہے۔ دین کی بنیاد توحید الٰہی پر استوار ہوتی ہے جس کا لازمی و منطقی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ اس وجہ سے اس کے پیش نظر ساری انسانیت کا مفاد اور اس کا اکرام واحترام ہوتا ہے۔ دین یا اسلامی مملکت میں جو قوانین وضع ہوتے ہیں ان میں ساری انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ دنیاوی معیار کے مطابق ہر وہ مملکت وحکومت جس میں Law and order اچھی طرح قائم ہے۔ جس میں چوری' ڈاکہ زنی کی وارداتیں نہ ہوں وہ پرامن حکومت سمجھی جاتی ہے۔ خواہ اس میں اکثریت کے حقوق پامال ہو رہے ہوں اور نصف آبادی انسانیت سے پست سطح پر زندگی بسر کر رہی ہو لیکن قرآن کریم کے مطابق پرامن حکومت وہ ہوتی ہے جس میں امن وامان کے علاوہ ہر شخص کو وہ مواقع میسر ہوں کہ جس سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما ہو رہی ہو۔ قرآن کریم کے مطابق تو حقیقی امن وسلامتی یہ ہے کہ اس حکومت میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین جاری نہ ہوں بلکہ اس میں محکومیت صرف خدا کے لئے ہو اور کوئی انسان کسی انسان کا حاکم نہ ہو کہ یہ چیز انسانوں کی ذلت کا باعث بنتی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد عرض ہے کہ قرآنِ کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ قرآنی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ **یاایھا الذین آمنوا** کے عملی معنے ہی یہ ہیں کہ اے وہ لوگوں جو اس بات پر ایمان لائے ہو کہ قرآن کا عطا کردہ نظام' انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام سے بہتر ہے۔ وہ مسلمان کو ان القاب سے یہ سمجھ کر خطاب کرتا ہے کہ وہ اس بات پر پہلے سے ایمان لا چکے ہوئے ہیں۔ اور جو لوگ اس عقیدے کو نہیں مانتے اس کے نزدیک وہ ظالم' کافر اور فاسق ہیں۔ (۵/۴۵'۵/۴۷) وہ ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ غیر اسلامی معاشرے سے فوراً ہجرت کر جائے (۴/۹۷) اس کا غیر اسلامی یعنی طاغوت میں زندگی بسر کرنا جائز نہیں (۴/۶۰)۔ غیر اسلامی

معاشرے میں رہنے والوں کو وہ مجرم قرار دیتا ہے (۶/۱۲۳)۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے دین کا تصور بالکل معدوم ہوگیا اور ہم مذہب کی سطح پر زندگی گذارتے چلے آرہے ہیں۔ مذہب میں خدا اور انسان کا تعلق ذاتی اور پرائیویٹ ہوتا ہے جس کا کسی اجتماعی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں خدا کی پرستش کی جاتی ہے اور انسان اس کا پرستار رہوتا ہے لیکن دین میں ایک باقاعدہ نظام قائم کیا جاتا ہے اور قوانینِ خداوندی اس میں جاری کئے جاتے ہیں۔ اگر اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح صرف ایک مذہب ہوتا تو اس کو جہاد کی ضرورت ہی پیش نہ آتی لیکن چونکہ اسلام ایک دین ہے اور اس کو اپنی الگ ایک مملکت کی ضرورت ہوتی ہے' اس لئے بعض مواقع پر اس کو جہاد کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ دیگر مذاہب میں مذہب کی آزادی سے مراد چند رسوم کی ادائیگی کی آزادی ہوتی ہے لیکن اسلام میں دین کی آزادی کے معنے اس کی ایک الگ حکومت کا قیام ہے۔

اسلامی حکومت یا دین کے قیام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جو اصرار کیا ہے اس کے لئے قرآن نے جہاد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن نے جہاد کو کسی جگہ بھی لڑائی کے معنے میں استعمال نہیں کیا۔ البتہ جب دین قائم ہو جائے اور اس وقت اس کی مدافعت کے لئے جو لڑائی کی جائے اسے قرآنِ کریم نے قتال کہا ہے۔ ہمارے علماء کرام کے پیش نظر چونکہ اسلامی نظام کے قیام کا تصور ہی نہیں تھا اس لئے انہوں نے جہاد کو قتال سے تعبیر کیا ہے' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ قرآن نے جہاد کا لفظ دین کے قیام کی کوشش کے لئے استعمال کیا ہے اور چونکہ دین کے قیام کے لئے قرآن کریم کا شدید اصرار ہے' اس لئے علماء نے اس اصرار کو جہاد بمعنے قتال کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ ورنہ جہاد کا قتال سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاد کی اس غلط تعبیر سے ہمارے ہاں جہاد کا تصور بدنام بھی ہوا اور Mis us e بھی ہوا۔ یوں تو وہ آیات جہاں جہاد کا لفظ آتا ہے بے شمار ہیں لیکن اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے صرف چند آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جہاں یہ پیش کیا جائے

گا کہ ان آیات میں اسلامی نظام قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے' لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا ہے لیکن ہمارے مفسرین اور مترجمین نے اس کا مفہوم لڑائی کا ہی لیا ہے اور ترجمہ بھی لڑائی ہی کیا ہے اور وجہ اس کی وہی ہے کہ ان کے سامنے ''دین'' کا تصور نہیں تھا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور اس کو پیش نظر رکھنے سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

پوری آیات یا ان کا ایک حصہ اور ان کا مفہوم ''مفہوم القرآن'' سے دیا جاتا ہے۔ آپ ان کا ترجمہ قرآن کریم کے کسی نسخہ سے ملاحظہ فرمالیں' ان تمام آیات میں ترجمہ لڑائی یا لڑنے والے ہی کیا گیا ہے۔

(۱) إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... (۲/۲۱۸)۔ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے قیام کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو' اس سے اپنا دامن چھڑا کر آگے بڑھ جائیں حتیٰ کہ اگر اس کے لئے وطن بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دیں اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ (مفہوم القرآن' صفحہ ۸۲)۔

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا ...... (۸/۷۲)۔ یاد رکھو جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے اور اس نظام کی خاطر جس چیز کے چھوڑنے کی ضرورت پڑی اسے بلا ادنیٰ تامل چھوڑ دیا حتیٰ کہ گھر بار تک چھوڑ کر یہاں آ گئے' اور اپنے مال و جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ (مفہوم القرآن' صفحہ ۴۱۳)۔

(۳) وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... (۸/۷۴)۔ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے اور پھر اس کی خاطر سب کچھ حتیٰ کہ وطن تک بھی چھوڑ دیا اور اس کے قیام کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ (صفحہ ۴۱۴)۔

(۴) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوا مِنكُمْ...... (۹/۱۶)۔ کیا تم سمجھ رہے ہو کہ چونکہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا ہے اس لئے اب تمہارے لئے سب کچھ خود

بخو دہوتا چلا جائے گا اور تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ خیال خام ہے۔دعوائے ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظام خداوندی کے قیام واستحکام کے لئے مصروف جدوجہد رہتا ہے۔ (صفحہ ۴۱۹)۔

(۵) اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... (۹/۱۹)۔کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور خانہ کعبہ کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانین خداوندی اور حیات اخروی پر ایمان رکھے اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے مسلسل جدوجہد کرے۔ (صفحہ ۴۲۰)۔

(۶) ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوا مِن بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا ......(۱۶/۱۱۰)۔جن لوگوں کا دل ایمان پر مطمئن ہو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ انہیں سخت تکالیف پہنچائی جائیں تو بھی ان کا قدم نہیں ڈگمگاتا۔حتیٰ کہ جب ان کے ایمان اور وطن تک میں بھی تصادم ہو جائے تو وہ وطن کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ایمان کو نہیں چھوڑتے اور اس طرح کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں جو ان کے ایمان کے تقاضوں کے لئے سازگار ہو وہاں وہ نظام خداوندی کے قیام کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ نہایت پامردی اور استقامت سے کرتے ہیں۔ (صفحہ ۶۲۱)۔

(۷) وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ......(۲۹/۶۹)۔جو لوگ اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جو ہم نے ان کے لئے متعین کیا ہے ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں ۔(صفحہ ۹۲۸)۔

(۸) يَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ......(۹/۷۳)۔ اے رسول تم ان منافقین اور کفار کے خلاف (جو نظام خداوندی کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ چکے

ہیں) پوری پوری جدوجہد کرو۔ (صفحہ ۴۳۸)۔

(۹) يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ...... (۹/۶۶)۔تم منافقین کی ریشہ دوانیوں اور کفار کی مزاحمتوں کے خلاف مصروف جدوجہد رہو اور ان کے مقابلہ میں اپنے کو چٹان کی طرح مضبوط رکھو۔ان پر پوری شدت سے غلبہ حاصل کرو۔ (صفحہ ۱۳۳۴)۔

(۱۰) يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (۵/۵۴)۔وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی کی طعن وتشنیع سے نہیں ڈریں گے۔

یہ دس آیات کریمات مع مفہوم کے پیش خدمت عالی کی گئی ہیں۔آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ ہر جگہ جہاد کا مفہوم اسلامی نظام کے قیام کی کوشش ہی لیا گیا ہے اور ان کو آپ کی سہولت کی خاطر ہر جگہ Under Line کردیا گیا ہے۔

جہاں تک قتال کا تعلق ہے اس کے لئے ہمیشہ یہ بات ملحوظِ خاطر رکھئے گا کہ قتال صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے۔مختلف گروہ یا Organizations قتال نہیں کر سکتے۔قرآن کریم نے قتال کے لئے صرف چار مواقع پر اجازت دی ہے۔

(۱) اگر اسلامی حکومت پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کے لئے قتال لازمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب قریش ایک لشکر جرار لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو مسلمان بھی اپنی بقا کی خاطر میدان جنگ میں نکل آئے۔یہ پہلا موقع تھا کہ جہاں انہیں جنگ کی اجازت دی گئی تھی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ (۲۲/۳۹)۔جن (مومنوں) سے (کفار) لڑا کرتے تھے چونکہ وہ بہت ستائے گئے اس وجہ سے انہیں بھی جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے اور خدا تو ان لوگوں کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

(۲) جنگ کی اجازت کا دوسرا موقع وہ ہے جب کوئی دشمن مملکت معاہدہ توڑے اور اسلامی

حکومت کے قیام و بقا کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ قرآن کریم معاہدات کی پاسداری پر بڑا زور دیتا ہے۔ أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُلاً (۱۷/۳۴)۔(ترجمہ) عہد کو پورا کرو کیونکہ ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ نیز فرمایا: وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (۲/۱۷۷)۔(ترجمہ) جب وہ کسی سے عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں لیکن کفار و مشرکین کی حالت یہ تھی کہ: اَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْداً نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم (۲/۱۰۰)۔ جب کبھی ان لوگوں نے عہد کیا تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور اسے پس پشت ڈال دیا۔ ایسے مواقع پر جب کہ دشمن عہد توڑ دے تو جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ اِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاء اِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الخَائِنِين (۸/۵۸)۔(ترجمہ) اور اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت (عہد شکنی) کا خوف ہو تو تم بھی برابر ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو خدا ہر گز دغا بازوں کو دوست نہیں رکھتا۔ نیز ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لاَ يُؤْمِنُون (۸/۵۵)۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی ایمان لانے والے نہیں۔ (اے رسول) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تم سے عہد کیا تھا پھر انہوں نے اسے توڑا اور ہر مرتبہ عہد کر کے توڑتے رہے۔ چنانچہ ان حالات میں جنگ سے بچنا ممکن ہی نہیں تھا اور انہیں جنگ کی اجازت دے دی گئی۔

(۳) تیسرا موقع جہاں قرآن کریم جنگ کی اجازت دیتا ہے وہ ساری دنیا کے مظلوموں کی امداد ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ...... (۴/۷۵)۔(اور مسلمانو) تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان کمزور اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو (کفار کے پنجہ سے چھڑانے) کے واسطے قتال نہیں کرتے۔ جو خدا سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال۔

(۴) چوتھا موقع جہاں قرآن کریم جنگ کی اجازت دیتا ہے وہ باغیوں کی سزا کا موقع ہے۔ اس کے لئے آیت مبارکہ (۵/۳۳) میں اجازت دی جاتی ہے۔

قرآن کریم کے مطابق صرف یہ چار مواقع ہیں جہاں اس نے جنگ کی اجازت دی ہے۔اس کے علاوہ قرآن کریم نے جنگ کی اجازت کسی جگہ نہیں دی ہے۔ ہمارے ہاں جہاد کے حکم کو قتال سے خلط ملط Confuse کر دیا جاتا ہے جس سے خود مسلمانوں کو اور غیر مسلم حضرات کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام تشدد اور Terror کو جائز سمجھتا ہے اور اس کی حمایت کرتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔قرآن کریم تو امن وسلامتی کا داعی ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات السلام اور المومن بیان فرمائی گئی ہیں اور چونکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ صفات خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرے اس لئے مسلمان تو صرف امن وسلامتی کا ہی علمبردار ہوسکتا ہے۔وہ ایسا نظام قائم کرتا ہے یَھۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ (۵/۱۶)۔اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔وَ اللّٰهُ یَدۡعُوۡ اِلَی دَارِ السَّلَامِ (۱۰/۲۵)۔خدا سلامتی کے گھر کی دعوت دیتا ہے۔ نیز ارشاد ہوتا ہے: وَمَن دَخَلَهٗ كَانَ آمِناً (۳/۹۷)۔جو اس نظام میں داخل ہوگیا وہ امن میں ہوگیا۔قرآن تو امن وسلامتی اور Peace کا داعی ہے۔ اس کو تشدد اور Terror سے کوئی تعلق نہیں۔

مضمون یہاں ختم ہوتا ہے۔اصل نکتہ جس پر اس مضمون کو Focus کیا گیا ہے یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کا لفظ قرآنی نظام کے قیام کے لئے کوشش کرنے کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کو قیام نظام خدوندی کے لئے شدید اصرار ہے۔اس سے مراد قتال نہیں ہے۔اس کا سارا زور Emphasis اسلامی نظام کے قیام پر ہے۔

اس مضمون میں جہاد کی اجازت کے مواقع کے لئے تیسری شق مظلوم کی حمایت و امداد تحریر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سپین Spain کی فتح کا واقع بڑا Relevence رکھتا ہے۔

اگرچہ اس واقعہ کا کوئی براہ راست تعلق اس مضمون سے نہیں ہے لیکن اس کو قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر تحریر کیا جاتا ہے۔ روزنامہ ڈان Dawn کی مورخہ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں ایک خط ''سپین کی فتح'' کے عنوان سے طبع ہوا تھا جس کا آزاد ترجمہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

''مسلمانوں کا سپین کو فتح کرنا''

جنوبی سپین (Spain) کے ایک عیسائی سردار کاؤنٹ جولین کی لڑکی سے سپین کے بادشاہ Roderic نے زنا بالجبر کیا۔ بادشاہ سے وفاداری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے مقامی سرداروں اور گورنروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی لڑکیاں بادشاہ کے محل میں بھیجیں تاکہ وہ کچھ وقت بادشاہ کے ساتھ گذار سکیں۔ اگرچہ بادشاہ کی عمر اس وقت جولین کی لڑکی سے تین گنا زیادہ تھی لیکن اس نے تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر اس لڑکی سے زنا بالجبر کیا جب اس لڑکی کا باپ (جولین) بادشاہ کے محل میں آیا تو اس لڑکی نے اپنے باپ سے بادشاہ کے اس فعل کی شکایت کی۔ کاؤنٹ جولین نے غصہ اور شرمندگی کی وجہ سے موسیٰ بن نصیر سے رابطہ قائم کیا جو کہ اس وقت اموی حکومت کی طرف سے جنوبی افریقہ کا گورنر تھا۔ کاؤنٹ جولین نے موسیٰ کو ان تمام مظالم سے آگاہ کیا جو بادشاہ اور اس کے سردار عام عیسائیوں اور یہودیوں پر کر رہے تھے' اپنی بیٹی کے 'Rape' کے واقعہ سے بھی آگاہ کیا۔ بہت بھاری ٹیکس عوام سے وصول کیا جاتا تھا اور لوگ غلاموں اور راہبوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ اس دور کے مذہبی (عیسائی) پیشوا بھی سخت بددیانت تھے۔ جو دولت جمع کر رہے تھے اور عام عیسائیوں کو مذہبی معاملات کے بارے میں ایذائیں دیتے رہتے تھے۔

موسیٰ بن نصیر نے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سپین پر حملہ کرنے اور وہاں کی رعایا

کو سپین کے ظالم بادشاہ سے نجات دلانے کی اجازت طلب کی۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو صرف بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ کیا۔ طارق بن زیاد سپین کے ساحل جبرالٹر پر اترا اور بادشاہ کی فوج کو شکست دے دی جس کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں سپین میں مذہبی آزادی تھی۔ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ مسلم سپین میں ابن رشد، محی الدین ابن عربی، ابن طفیل، ابن باجہ، ابوبکر رازی جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے سماجی اور طبی (Medical) دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور ایسے ادارے قائم کئے جس سے یورپ نے نہایت فائدہ اٹھایا (اس کے برخلاف) جب (عیسائی) سپین نے سولہویں صدی میں وسطی اور جنوبی امریکا پر حملہ کیا تو لوگوں کو صرف دو Options دیے گئے تھے کہ یا تو وہ عیسائی ہو جائیں اور یا پھر قتل کر دیئے جائیں گے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سپین کی مسلم فتح کس طرح تیسری شق کے ذیل میں آتی ہے۔ اس مضمون میں اختصار کی وجہ سے اس تیسری شق کے بارے میں صرف ایک ہی آیۂ کریمہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مظلوموں کی امداد یا پوری انسانیت کی نگہداشت کے بارے میں قرآن کریم میں اس قدر آیات کریمات ہیں کہ ان سب کا احصیٰ یہاں ممکن نہیں ہے لیکن افسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے ان آیات کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اس سے ان کا یہ مفہوم جاتا رہتا ہے کہ ان سے مراد انسانیت کی نگرانی ہے اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان مفسرین کرام کے سامنے دین کا تصور نہیں تھا جس میں تسلط، غلبہ، قوت، اقتدار شرط ہے۔ افسوس کہ ہمارے سامنے صرف مذہب کا تصور رہ گیا ہے جس میں غلبہ و اقتدار کی بجائے عاجزی، خاکساری، انکساری، فروتنی کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک آیہ کریمہ کی تفسیر پیش کی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (۲/۱۴۳)۔ اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین

الاقوامی امت بنایا تا کہ تم تمام انسانیت کے اعمال کے نگران بنو اور تمہارا رسول تمہارا نگران بنے۔
اس آیت کریمہ میں شہادت (نگرانی) سے مراد اس دنیا میں اقوام عالم کی شہادت (نگرانی) ہے کیونکہ جب امت متوسط اس دنیا میں بنایا ہے تو لازمی بات یہ ہے کہ نگران بھی اسی دنیا میں ہی بنایا گیا ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ امت متوسط (عادل) تو اس دنیا میں بنایا جائے اور نگرانی اور شہادت آخرت کے لئے موخر کردی جائے لیکن دین کے بجائے مذہب سامنے ہونے کی وجہ سے یہ مفسرین کرام کی مجبوری تھی کہ وہ اس کو قیامت کے دن کے لئے مخصوص کر دیں۔ کیونکہ اگر وہ اس شہادت سے اس دنیا کی شہادت (نگرانی) مراد لیتے' جو فی الواقعہ مراد ہے' تو انہیں اسلام کے لئے غلبہ' اقتدار اور ایک مضبوط ریاست کا تصور اور اس کی ضرورت کو تسلیم کرنا پڑتا تھا' جو ان کے ہاں نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر تقریباً سارے مفسرین نے ایک ہی طرح کی کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''بخاری' ترمذی اور نسائی نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے اور ان سے دریافت کیا جائے گا تبلیغ کی؟ نوح علیہ السلام عرض کریں گے پروردگار میں نے بے شک تیرا پیام پہنچا دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی امت سے دریافت فرمائے گا کہ تم کو نوح علیہ السلام نے احکام پہنچائے؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی نہیں آیا۔ پھر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے۔ نوح علیہ السلام عرض کریں گے میرے گواہ محمد ﷺ اور ان کی امت ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر تم وہاں آ کر گواہی دو گے پھر آپ نے آیہ **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ** (۲/۱۴۳) (پڑھی) اور فرمایا تم تو نوح علیہ السلام کی تبلیغ کی گواہی دو گے اور میں تمہاری گواہی دوں گا'' (تفسیر مظہری' ص ۱۸۲' تفسیر ابن کثیر' ص ۲۰۷' ۲۰۸)۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ کس طرح آیہ کریمہ سے دین کا تصور محو کر کے مذہب پیش کیا جا رہا ہے اور کس طرح امت مسلمہ شہادت و نگرانی اور سیادت عالم کے درجہ سے گرائی جا رہی

ہے اور اس طرح جہاد کی اجازت کی تیسری شق سے محروم کی جا رہی ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذَلِکَ لَآیَاتٍ لِّقَوۡمٍ یَتَفَکَّرُونَ (۴۲/۳۹)۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُمس کا مذہبی اور دینی مفہوم

قرآن کریم میں خمس کا حکم صرف ایک جگہ سورۃ انفال کی آیت نمبر ۴۰ میں آیا ہے اور یہ دسویں پارے کی پہلی آیت ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں خمس کا ذکر اور کسی جگہ نہیں آیا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہاں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ خالص قرآنی نظریات کا داعی ہے اس لئے یہ ہمیشہ فرقہ پرستی سے بلند رہا ہے۔ لیکن زیرنظر مسئلہ شیعہ حضرات کے ہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ان کے ہاں "فروع دین" چھ ہیں جن میں سے ایک خمس بھی ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب بھی شیعہ حضرات ہر سال کروڑوں روپے کا خمس نکال کر پاکستان کے علماء کو دیتے ہیں یا ایران کے آیات اللہ کو ارسال کر دیتے ہیں۔ اس رسالہ میں عموماً شیعہ حضرات کے نظریات سے صرف نظر ہی کیا جاتا ہے لیکن اس مسئلہ کی نوعیت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کے نظریات کو Ignore نہیں کیا جا سکتا۔ اس رسالہ میں جو کچھ تحریر کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ سنی حضرات کے لئے ہو یا شیعہ حضرات کے لئے' اس سے مقصود خدانخواستہ ان کی تنقید نہیں ہوتی' مقصد صرف قرآن کا موقف بیان کرنا ہوتا ہے ورنہ اصولی طور پر تو اس رسالہ کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب سب غلط ہوتے ہیں' درست صرف دین ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق غور کرنے سے پیشتر ایک دوسری ضروری بات یہ پیش نظر رکھنی

ضروری ہے کہ قرآن کریم کے ہر قانون کی اطاعت عبادت ہے اور قرآن کی ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم انفرادی تصورِ حیات کے سخت خلاف ہے اور اجتماعی تصور حیات کا علمبردار ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے احکامات یا اسلام کے قوانین کی اطاعت صرف معاشرہ کے اندر رہ کر ہوسکتی ہے۔ انفرادی طور پر خانقاہوں اور زوایا میں ان کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے ہر جگہ یـاایھـا الـذین آمنو کہہ کر تمام مومنین سے اجتماعی طور پر خطاب فرما کر اجتماعی قوانین عنایت فرمائے ہیں۔ کسی جگہ انفرادی طور پر یـاایھـا الـذی اٰمن نہیں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق جب کسی مستقل قدر اور ذاتی مفاد میں Tie آ کر پڑتی ہے تو اس وقت ذاتی تصادم مقابلہ میں مستقل قدر کو ترجیح دے کر اختیار کرنا عبادت خداوندی ہے اور اسی سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ذاتی معاملہ اور مستقل قدر میں Tie معاشرہ میں ہی واقع ہوسکتی ہے۔ انفرادی زندگی میں نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ جب قرض لو یا دو تو اس کو تحریر میں لے آؤ (۲/۲۸۲)۔ اس حکم کی اطاعت معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ کسی تجردگاہ میں اس کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے حکم دیا کہ غیبت نہ کرو (۴۹/۱۲)۔ اسی طرح قرآن نے زکوٰۃ' انفاق' ایثار' حسنِ سلوک کے حکم دیئے ان سب کی اطاعت معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ معاشرہ کے باہر اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس مذہب میں ذاتی عبادت کا تصور ہے کہ عبادت انفرادی طور پر بھی ہو سکتی ہے۔ محولہ بالا نکتہ کو پیشِ نظر رکھ کر آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دین میں انفرادی صلوٰۃ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسی طرح خمس اور زکوٰۃ کی صورت ہے۔ ہمارے ہاں جو زکوٰۃ اور خمس انفرادی طور پر دیئے جاتے ہیں وہ مذہب کا تصور ہے۔ دین میں قطعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِن کُنتُمْ اٰمَنتُم بِاللّٰهِ وَمَآ اَنزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی

الْجَمْعَانِ (۸/۴۱)۔اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور رسول کے لئے قرابتداروں، یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔اگر تم ایمان رکھتے ہو اوپر اس چیز کے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلے کے دن، جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔یوم الفرقان سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے کیونکہ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَان کے الفاظ نے خود اس کی وضاحت کردی ہے اس لئے کہ وہی پہلا دن تھا جس دن مسلمانوں اور کفار کے درمیان جماعتی حیثیت سے تصادم ہوا تھا۔

عربی زبان کے مطابق مال غنیمت وہ مال ہے جو میدانِ جنگ میں مسلمان مجاہدین کو کفار سے حاصل ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے جنگ سے حاصل شدہ اموال کو غنیمت یا انفال اس لئے کہا ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ اموال جہاد کا معاوضہ نہیں ہیں۔مجاہد جو جہاد اللہ کی راہ میں کرتا ہے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے اور اس کا اجر اس کو اللہ کے ہاں سے ملتا ہے جو ابدی زندگی کی صورت میں ہوتا ہے۔باقی یہ اموال تو اس جہاد کے زوائد ہیں۔مال غنیمت کے سلسلہ میں عربوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو سپاہی جس دشمن کو قتل کرتا، اس کا مال واسباب اس سپاہی کی ملکیت قرار پا جاتا۔عربوں کے ہاں جنگ کا جذبۂ محرکہ ہی یہ تھا اور اس میں انفرادی مفاد پیش نظر ہوتا تھا۔قرآنِ کریم نے اس کی اصلاح فرمائی کہ اسے لوٹ کا مال تصور نہ کیا جائے کہ جو جس سپاہی کے ہاتھ لگے وہ اس کو لے لے، بلکہ اس کے بجائے وہ سب سامان مملکت کی تحویل میں دیا جائے گا جسے وہ مملکت حسبِ ضرورت آیۂ کریمہ کے مقرر کردہ طریقہ کے مطابق تقسیم کردے گی۔لیکن یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس کی تقسیم مملکت خود کرے گی، انفرادی طور پر اس کی تقسیم نہیں ہوگی۔اور اس حکم کی اطاعت عبادت خداوندی ہوگی۔حالانکہ یہ حکم ٹھیٹ دنیاوی زندگی کے متعلق ہے۔

مسلمانوں کے دونوں بڑے فرقے (سنی وشیعہ) اس آیۂ کریمہ کی جو تفسیر فرماتے ہیں وہ دونوں تفاسیر قرآن کے خلاف ہیں، روایات پر مبنی، مذہبی تفاسیر ہیں۔اس کی خالص قرآنی نکتہ نظر

کے مطابق دینی تفسیر پیش خدمت عالی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر مروجہ مفہوم سے الگ اور منفرد ہے' اس لئے اس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے علماء کرام جو مال غنیمت ہاتھ آتا ہے اس میں سے پانچویں حصہ پر اس آیت کا اطلاق کرتے ہیں جس میں ایک حصہ اللہ و رسول کا اور باقی حصص ذوی القربیٰ' یتامیٰ مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے ہیں۔ مال غنیمت کا ۴/۵ حصہ وہ لشکر میں خود تقسیم کرتے ہیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیتے ہیں۔ یہ ۴/۵ حصہ جو لشکر میں تقسیم ہوتا ہے وہ ان حضرات کے نزدیک آیۂ کریمہ کے Perview (احاطہ) سے باہر ہے۔ اس لئے اس حصہ پر تو کوئی بحث ہی نہیں ہو سکتی۔ البتہ جو پانچواں (۱/۵) حصہ ہے صرف اس کی تقسیم وہ اس آیت کے مطابق کرتے ہیں۔ پھر دوبارہ واضح کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک سارا مال غنیمت اکٹھا کر کے' اس میں سے پانچواں (۱/۵) حصہ اللہ و رسول کا حق نکال کر' بقیہ ۴/۵ حصہ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مال غنیمت میں سے اللہ و رسول کا حق صرف پانچواں حصہ ہے جس کے یہ حصص آیۂ کریمہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

اس پانچویں حصہ کے مصارف کی تفصیل میں سب سے پہلا حصہ اللہ و رسول کا ہے۔ اللہ کا حصہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے استعمال ہو گا اور رسول کا حق ان کی اپنی ذات پر' کیونکہ وہ سارا وقت سربراہِ مملکت کے طور پر خدمتِ ملت کے لئے گذارتے ہیں اور ان کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس مال میں ان کا حق رکھا جائے۔ اصل میں یہ حق ریاست کے سربراہ کا حق ہے جو حضور ﷺ کے بعد آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تیسرا حق ذوی القربیٰ کا ہے جس سے مراد علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے قرابتدار ہیں جن کی کفالت حضور کرتے تھے۔ چوتھا حق یتیموں' مسکینوں' مسافروں کا ہے جو ان میں تقسیم کیا جائے گا۔ چند جزوی اختلاف کو چھوڑ کر ہمارے علماء کرام کا یہی موقف اس آیت کے متعلق ہے جو تحریر کیا گیا ہے۔

شیعہ حضرات لذی القربیٰ میں حضورﷺ کے رشتہ دار مراد لے کر، خمس کو سادات کے لئے مختص کر دیتے ہیں اور جو حصص یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل کے مخصوص ہیں، ان حضرات کے ہاں، ان کے لئے بھی سیادت کی شرط لازمی ہے۔ مختصراً یہ کہ شیعہ حضرات کے ہاں سارا خمس کسی نہ کسی طرح سادات کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اس کے لئے ان کی دلیل یہ ہے جو آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

شیعہ حضرات کا موقف واضح کرنے کی غرض سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے مسلک کی وضاحت ہو جائے گی۔ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ ان کا اپنے الفاظ میں نظریہ تحریر کیا جائے، میں خود شاید اتنی وضاحت نہ کر سکتا۔ مشہور تفسیر، تفسیر القرآن کا یہ اقتباس ہے یہ تفسیر الحاج حضرت ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب کی تحریر کردہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''یہ تقسیم کا حکم جنگ بدر کی غنیمت کے وقت ہوا۔ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اللہ کا حصہ رسول کا حصہ ہے اور رسول کے بعد خدا اور رسول کے حصہ کا مالک امام منصوص من اللہ ہو گا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کا حصہ تو ان کے قربتداروں کو دیا جائے گا جو یتیم و مسکین اور پردیسی ہوں۔ یہ شرط ہے کہ قرابتدار رسول ہوں۔ یعنی یہ سب حصے رسول اور ان کی اولاد کے لئے خاص ہیں، خمس میں سہمِ امام علیحدہ کر کے دوسرا حصہ سادات کی ان صفوں میں تقسیم کیا جائے گا جن کا ذکر آیت میں ہے۔ چونکہ اولاد رسول پر غیر سید کی زکوٰۃ جو صدقہ ہے حرام ہے لہٰذا بجائے اس کے ان کا حق خمس میں باقی رکھا گیا ہے۔
>
> عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو خاندان حکمران ہو اس کی اولاد کے

لئے کچھ ایسا بندوبست کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی باعزت طریقہ سے گذار سکیں اور لوگوں کے سامنے ان کو ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے کیونکہ اس میں شاہی خاندان کی ذلت یقینی ہے۔تمام دنیا کی سلطنتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور رسول جو دین اور دنیوی دونوں حیثیت سے مسلمانوں کے بادشاہ ہیں لہٰذا قدرت کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ ان کی اولاد کے حقوق کا تحفظ نہ کیا جائے۔غیر سید کی زکوٰۃ کو اس لئے سادات پر حرام کیا گیا ہے کہ وہ صدقہ ہے۔میل کچیل ہے اس کو لے کر کھانے میں اولا د رسول کی توہین ہے۔'' اقتباس ختم ہوا۔

حضرت محترم مفسر صاحب نے پہلے ہی تحریر کر دیا کہ یہ سب کچھ نظریات انہوں نے احادیث سے اخذ کئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس اقتباس سے بنوعباس کے دورِ ملوکیت کی زینت خوب آشکارا ہو رہی ہے۔شیعہ حضرات کا فقہ' فقہ جعفری کہلاتا ہے۔حنفی فقہا کو براہ راست خلفاء بنی عباس کی سرپرستی حاصل تھی۔لیکن شیعہ فقہا کی یہ صورت نہیں تھی' خلفاء بنی عباس عموماً ان کے خلاف تھے۔لیکن فقہ جعفری' فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ اس کے ردِعمل (Re-action) میں اس کے متوازی بنتا چلا گیا۔اس کے ماخذ (Source of Law) بھی وہی قرآن واحادیث و اجماع ہیں۔ان کی احادیث جو ماخذ قانون بنتی ہیں وہ سنیوں سے الگ ہیں۔اجماع میں بھی قول معصوم کی سند کا ہونا ضروری ہے۔لیکن قیاس ان کے ہاں نہیں ہے۔ مجھے فقہ جعفری کی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس لئے میں اس کے لئے مزید لکھنا نہیں چاہتا۔ چونکہ اس کی ابتداء حضرت امام جعفر صادق نے کی تھی اس لئے یہ فقہ ان کے نام نامی واسم گرامی کی طرف منسوب ہے۔لیکن یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ جس طرح آج دنیا میں امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔اسی طرح حضرت امام جعفر صادقؒ کی بھی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ان دونوں فقہ کا انتساب ان

دونوں حضرات گرامی قدر کی طرف مشکوک وظنی ہی ہے۔

پھیر پھرا کر کسی نہ کسی طرح سارا خمس سادات کو دینے کے لئے اس آیت کے مرکب اضافی ''ذی القربیٰ'' کو اس نظریہ کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے رسول اللہ کے قرابتدار مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں ذی القربیٰ (قرابتدار) کی نسبت رسول کی طرف بیان ہی نہیں کی گئی۔ مولوی فرمان علی کا قرآن کریم کا ترجمہ شیعہ حضرات میں مستند ترین ترجمہ شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اس آیت میں ذی القربیٰ کو رسول اللہ کے قرابتدار ثابت کرنے کے لئے رسول کے الفاظ قوسین (بریکٹ) میں اضافہ کئے ہیں۔ کیوں کہ قرآن کا ترجمہ اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ الفاظ قرآنی سے رسول کے قرابتدار ثابت نہیں ہوتے اور اس ترکیب سے رسول کے قرابتدار مراد لے لئے جاتے ہیں۔ آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ رشتہ دار کس کے ہیں۔ ہماری روایات نے اس کو رسول اللہ کے رشتہ دار بنایا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے تراجم میں بھی رسول کے قرابتدار لکھ دیے گئے لیکن قرآن کی آیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ رسول اللہ کے رشتہ دار ہیں۔ اس لئے مترجمین قوسین (بریکٹ) میں اس کا اضافہ 'رسول کے' کر دیتے ہیں' جو قرآن میں کھلم کھلا اضافہ ہے۔ لیکن سنی علماء شیعہ حضرات کی اس معاملہ میں اس لئے تردید نہیں کرتے کہ ان کی اپنی حدیثوں میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

اس آیۂ کریمہ سے پہلے ۴۱ آیات کریمات میں جہاد کا ذکر چلا آ رہا ہے اور اس آیت کے بعد بھی جہاد کی آیات آ رہی ہیں۔ اس آیت کا نزول بھی جنگ بدر میں ہوا ہے جس کی شہادت یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن سے ہوتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ذی القربیٰ سے مجاہدوں کے قرابت والے مراد ہیں۔ یعنی جن خاندان والوں کے جوان اور کمانے والے افراد جنگ میں بہادری دکھا کر جام شہادت نوش کر رہے ہوں ان کے قرابتداروں' اہل خانہ' کی ضروریات زندگی کے لئے خمس کی مد سے ان کی امداد کی جانی چاہیئے تا کہ مجاہدین اس بات سے مطمئن رہیں کہ اگر وہ

قتل کردیے جائیں تو ان کے عزیزوں کی کفالت خمس سے ہوتی رہے گی۔

ہمارے علماء کرام کا یہ تسامح ہے کہ انہوں نے اس آیت کا اطلاق پورے مال غنیمت پر نہیں کیا۔ قرآن کریم کے احکامات اور آیت کریمہ پورے مال غنیمت کا احاطہ کرتی ہے علماء کرام اس آیت کا اطلاق صرف ۱/۵ پر کرکے ۴/۵ حصہ کو پھر مجاہدین پر تقسیم کردیتے ہیں جو خلاف قرآن ہے۔

آیت کی اس تفصیل اور اس کے پس منظر کے بعد آپ مفہوم القرآن کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس آیت کو کس درجہ صاف کردیا گیا ہے۔

> ''یاد رکھو میدان جنگ میں جو مال غنیمت بھی ملے گا اس میں سے پانچواں حصہ ''خدا اور رسول''۔ یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات۔ کے لئے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا۔ مثلاً (میدان جنگ میں جانے والوں اور کام آجانے والوں کے) اقرباء کے لئے یتیموں اور معاشرہ میں بے یارومددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔''

اس سلسلہ میں ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب جنگ کی وہ صورت ہی نہیں رہی۔ جزیہ کا حکم بھی قرآن میں صرف ایک جگہ ۹/۲۹ میں آیا ہے۔ جزیہ بھی جنگ سے متعلق ہی تھا جس ملک کو فتح کرلیا جائے اس کے شہری جزیہ دیتے تھے۔ جزیہ صرف اس بات کی علامت تھا کہ شہریوں نے (Surrender) کردیا ہے۔ یہ مفتوح ہونے کا ایک Token تھا اب چونکہ جنگ میں یہ صورت ہی پیش نہیں آتی اس لئے اب جزیہ کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح خمس کا معاملہ ہے۔ اب جب مالِ غنیمت ہی ہاتھ نہیں آتا تو خمس کس چیز

کا۔ نیز یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ جزیہ وخمس دونوں کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ اسلامی نظام کو ختم ہوئے صدیاں گذر گئیں جزیہ بھی اب کہیں ادا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن خمس کی رقوم مولوی حضرات موصول کر رہے ہیں۔ خمس کی ادائیگی صرف اس مال غنیمت سے ہوتی ہے جو جہاد کے بعد حاصل ہو اور جہاد صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے۔ غیر اسلامی حکومت جہاد نہیں کر سکتی اس لئے خمس کی ادائیگی کے لئے لازم ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام ہو۔ دینی نکتہ نگاہ سے اس کے علاوہ خمس کی ادائیگی کی کوئی اور صورت نہیں۔ البتہ مذہب میں خمس کا دینی طریقہ ہے جو آج کل رائج ہے کہ لوگ انفرادی طور پر مولویوں کو خمس ادا کر دیں۔

وآخر دعوانا الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اصل سبب

ٹی۔وی کے ایک مشہور چینل کے پروگرام میں اسلام کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ایک معروف پروفیسر صاحب نے یہ فرمایا کہ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام بہت خوبیوں کا مذہب ہے، لیکن دقت اور پریشانی اس وقت واقع ہوتی ہے جب اسلام کی کوئی واضح اور متفق علیہ تعبیر نہیں ملتی۔ ہر فرقہ اور ہر سیاسی پارٹی خود کو صحیح اسلام کی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور دوسرے فرقے یا دوسری سیاسی پارٹی کو اسلام سے خارج یا کم سے کم اسلام کا صحیح متبع نہیں سمجھتی۔ قارئینِ کرام کو خود بھی اندازہ ہوگا کہ یہ اعتراض کوئی نیا نہیں ہے۔ ہم خود اپنی عملی زندگی میں روزانہ اس اعتراض سے دوچار ہوتے ہیں اور خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر فرقہ اور ہر سیاسی پارٹی اپنے مسلک کی صحت پر اس درجہ اصرار کرتی ہے کہ اس سے ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں اور دوسروں کو گمراہ قرار دینے میں کوئی رعایت اور لچک ظاہر نہیں کرتا۔ بظاہر اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو درست اور کسی کو غلط قرار دے دیں۔

یہ بات واقعتاً غور کرنے کے قابل ہے کہ آخر ہم مسلمانوں کی یہ صورتِ حال کیوں ہے کہ کسی اختلاف کا حل ہی نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں صدرِ اول سے آج تک شیعہ وسنی کی نزاع چلی آرہی ہے۔ حال ہی میں گذشتہ صدی میں احمدی مرزائی فرقہ کے متعلق بہت بحث وتمحیص چلتی رہی۔ پاکستان کی تشکیل کے فوری بعد دیوبندی، بریلوی مسالک کے درمیان اختلافات کی آگ کو

ہوا دی گئی۔ دونوں فرقے کے علماء کسی تنازع میں بھی کسی متفق علیہ نظریہ پر نہیں پہنچے۔ تشکیل پاکستان سے پیشتر، علماء کی اکثریت قیام پاکستان اور اسلامی حکومت کے تصور کے خلاف تھی یہی علماءکرام یہاں آ کر اسلامی حکومت کے داعی بن گئے۔ اسی طرح سعودی عرب میں اسلام کی اور تعبیر ہے، اور ایران میں اس کی دوسری تعبیر۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی توانائیاں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف ہوتی رہیں، جس کی وجہ سے مسلمان برابر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

قرآن کریم نے اس کا ایک واضح حل دیا تھا جس کو ہم نے بالکل قابل توجہ نہیں سمجھا اور اسی وجہ سے اس پریشانی سے دوچار ہوئے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ اِلَى اللَّهِ (42:10)-

اور جب تمہارا کسی چیز میں بھی باہم اختلاف ہو، تو اس کا فیصلہ خدا کے حوالہ ہے۔

یعنی اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب سے کرا لیا جائے۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآن کا اتنا واضح حکم ہے کہ اس میں کسی تعبیر و تاویل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں نے اس اصول کو بالکل پس پشت ڈال دیا، اور اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کبھی ایک مرتبہ، کسی ایک مسئلہ میں، قرآن خالص سے فیصلہ نہیں کرایا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے روایات کو خود ہی وحی قرار دے کر، اس کو قرآن کے ہم پلہ، مثلہ معہ، قرار دیا۔ اس کے بعد الہام، کشف، علم لدنی، ان سب ذرائع کو علم خداوندی حاصل کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا۔ قرآن کریم، صحت و سقم ماپنے کا واحد ذریعہ اور معیار نہ رہا۔ اب صحیح و غلط، کو معلوم کرنے کے کئی ذرائع ہو گئے اور چونکہ ان ذرائع سے حاصل کردہ علم میں خود تضاد و تخالف تھا، اس لئے ان کے ذریعے کسی مسئلہ کا دو ٹوک جواب حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اب موجودہ صورتِ حال سے نکلنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ آپ ہر فرقہ یا سیاسی پارٹی کو خالص

قرآنی معیار پر پرکھیں، ہو نہیں سکتا کہ کسی بھی پارٹی یا فرقہ کی صحت وسقم واضح نہ ہو جائے، اس کے لئے آپ کو روایات (وحی خفی) الہام، علم لدنی کی بالکل تردید کرنی ہوگی۔

دوسرا طریقہ جو اس سے بھی واضح تر ہے کہ آپ اس فرقہ یا پارٹی کے نظریات کے مطابق اسلام کا نظام (دین) کو عملاً نافذ کر دیں۔ اس کے نتائج خود اس کے صحت وسقم کے معیار ہوں گے۔ کیونکہ قرآن کریم نے خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نظام کے نتائج اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہیں۔ فرمایا:

وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (10:39)-

اس نظام کے نتائج خود اس نظام کے درست ہونے کی دلیل ہوں گے۔

محترم قارئین کرام کے علم میں ہے کہ اس رسالہ کا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ خالص قرآنی فکر اور دین کا داعی ہے۔ اس کے نزدیک درست صرف دین ہے۔ مذہب کوئی بھی ہو وہ غلط اور خلاف قرآن ہے۔ اس کے نزدیک چونکہ شیعہ وسنی دونوں مذہب اور فرقہ ہیں، اس لئے اس کے نزدیک دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ تاہم یہ رسالہ ان دونوں فرقوں کی عزت کرتا ہے، اور شیعہ حضرات کا احترام اس لئے زیادہ کرتا ہے کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی جاتی جس سے ان کے احساسات کو رنج پہنچے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں صدر اول سے ہی ان دونوں فرقوں میں مناظرے ہوتے چلے آ رہے ہیں، لیکن یہ دونوں فرقے آج تک نہ تو کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور نہ ہی یہ پہنچ سکتے ہیں کیونکہ یہ حضرات قرآن کریم کو اپنی گفتگو کا مدار محور قرار نہیں دیتے بلکہ ان کتابوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں خود تضاد بیانی موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کتابوں سے ہر قسم کا مواد مہیا ہو جاتا ہے اور یہی مسلمانوں کو آپس میں لڑاتی ہیں۔ اس لئے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک ''مناظرہ'' یا احقاق الحق اور ابطال الباطل کا یہ طریقہ ہی غلط ہے۔ یہ طریقہ مذہب کا ہوتا ہے۔

دین کا یہ طریقہ ہے کہ آپ اس کو عملاً نافذ کر دیں۔ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف سامنے آ جائے گا۔ اس کی واضح مثال ایران کا موجودہ انقلاب ہے۔ اگر تشیع کا پیش کردہ اسلامی نظام درست ہوتا تو اس کے درخشندہ نتائج قرآن کے وعدوں کے مطابق سامنے آ چکے ہوتے۔ ایران کے انقلاب کا کامیاب نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تشیع کا پیش کردہ نظریہ نہ صرف یہ کہ درست نہیں ہے بلکہ قابل عمل ہی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کے جانشین مقرر کرنے کے بارے میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ حضور ﷺ کے قائم کردہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے اپنے میں سے ایک بہترین آدمی کو چن لیا جائے اور وہ شخص امت کے مشورہ سے اس نظام کو جاری رکھے۔ اس گروہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس عہدہ کے لئے منتخب کر لیا۔ دوسرے محترم گروہ کا خیال تھا کہ اس نظام کو چلانے کے لئے اس کا سربراہ منصوص من اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نظام کو چلانے کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ وہ اسلامی نظام ہی منقرض ہو گیا لیکن یہ بات شدید حیرانی کی ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان دونوں فرقوں نے کبھی دین قائم کرنے کی تو کوئی کوشش نہیں کی لیکن یہ اختلاف کرتے رہے کہ اسلامی نظام کا سربراہ (Head of State) کس طریقہ سے بنایا جانا چاہئے اور اس مفروضہ تنازعہ پر مناظرے اور سر پھٹول کرتے رہے۔ تیرہ سو سال کے بعد، شیعہ حضرات کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ایران میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی لیکن آپ حیران ہوں گے کہ جس بنیادی نکتہ پر انہوں نے جمہور مسلمانوں سے اختلاف کیا تھا کہ سربراہ مملکت 'منصوص من اللہ' ہونا چاہئے، اس نکتہ کو چھوڑ کر، انہوں نے جمہور مسلمانوں کے موقف کے مطابق اپنا سربراہ مملکت، انتخاب کے ذریعے خامنہ ای صاحب کو منتخب کر لیا اور اپنے اس بنیادی موقف سے کہ سربراہ مملکت منصوص من اللہ ہو، اس سے انحراف کر گئے۔

کیونکہ اس وقت ایران کا سربراہ منصوص من اللہ لانا' قابل عمل ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشیعہ کا نقطۂ نگاہ قابل عمل ہی نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تشیع میں اسلامی نظام کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ چونکہ اس رسالہ کی پالیسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس نکتہ کی وضاحت کی جائے۔ اس لئے اس مسئلہ کو یہاں ہی ختم کیا جاتا ہے۔ یہ مثال صرف اس لئے دی گئی تھی کہ دین کس طرح صحیح اور غلط کو واضح کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شیعہ رسالہ اس بات کی وضاحت طلب کرنا چاہے گا' تو اس نکتہ کی وضاحت اور ایرانی انقلاب کے ناکام ہونے کی وجوہات پیش خدمت کر دی جائیں گی۔

اس موجودہ صورت حال سے نکلنے اور مسلمانوں کو پستی و ذلت سے نجات دلانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی ہدایت کے لئے صرف اور صرف اور محض قرآن کریم ہی عنایت کیا گیا ہے۔ یہی انسانیت کا آخری سہارا ہے۔ یہی ہمارا جنم جنم کا ساتھی ہے۔ یہی ہماری آخری پناہ گاہ: وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَداً (18:27)- (ترجمہ) اور تم اس (قرآن) کے سوا کہیں کوئی پناہ گاہ نہ پا سکو گے۔ اس کے اصولوں اور قوانین پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے اقوام و ملل عالم کے موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جن زنجیروں نے انسانیت کو ظلم و ستم اور غیر خداوندی بندشوں میں باندھ رکھا ہے یہ ان تمام زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دیتا ہے (7:157)- فکر انسانیت علیٰ العموم اور فکر مغرب علیٰ الخصوص جس مقام تک پہنچا ہے۔ وہ فکر انسانی اس سراج منیر کے سامنے بچوں کا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی اور حرماں نصیبی کہ وہ اس فکر کو انسانیت کی راہ نمائی کے لئے کافی نہیں سمجھتے حالانکہ خود قرآن کریم نے اس کو پوری انسانیت کے لئے ابدالآباد تک کے لئے کافی قرار دیا ہے (29:51)- اس کتاب کے ہوتے ہوئے' الہام' وحی خفی (روایات) اور علم لدنی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ علم شمار کرنا' قرآن کریم کی کفایت سے انکار اور اس کی توہین ہے۔ قرآن کریم کی

حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے (15:9) جبکہ الہام، وحی خفی (روایات) اور علم لدنی کی حفاظت و صیانت کی کوئی ذمہ داری کسی پر نہیں ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حاصل شدہ علم صرف قرآن کریم میں محصور و محدود سمجھیں باقی اپنی طرف سے اضافہ کئے ہوئے علوم، وحی خفی، علم لدنی اور الہام کو قرآنی علم قرار نہ دیں۔

جہاں تک روایات کے وحی خفی، یعنی علم خداوندی ہونے کی بات ہے، اس سلسلہ میں کمترین راقم سطور کے آٹھ مضامین طبع ہو چکے ہیں۔ جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روایات وحی نہیں ہیں روایات کے وحی نہ ہونے کے بارے میں بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ روایات کے وحی نہ ہونے کے جو دلائل قرآن سے پیش کئے گئے ہیں وہ ان سابقہ طبع شدہ مضامین سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ چند عقلی دلائل کو تجدید یادداشت کے لئے دوبارہ تحریر کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ بہت مختصر بھی ہیں اور مفید بھی۔

(1) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم جنہیں احادیث کہتے ہیں یہ احادیث نہیں ہیں۔ یہ روایات ہیں۔ یہ اقوال رسول نہیں ہیں بلکہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔

(2) ان روایات کے بارے میں ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ یہ روایات نقل بالمعنی ہوتی ہیں یعنی ان میں حضور کے کسی مفہوم کو راویوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے یہ الفاظ راویوں کے اپنے ہیں۔ راویوں کے یہ اپنے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں؟

(3) قرآن تو وحی ہے اور اگر روایات بھی وحی ہیں تو حضور ﷺ کی اپنی سوچ اور فکر کے الفاظ و اقوال کون سے ہیں۔ قرآن حضور ﷺ کی سوچ اور فکر کی تعریف کرتا ہے، تو یقیناً حضور ﷺ اپنی سوچ اور فکر سے بھی کلام فرماتے ہیں تو حضور ﷺ کا وہ کلام کونسا ہے؟

(4) وحی سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر احادیث وحی خفی ہیں، تو ان کی اطاعت سے بھی تو اللہ کی اطاعت ہوگی۔ ان کی اطاعت سے رسول

اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وحی کے ایک حصہ سے تو اللہ کی اطاعت ہو اور وحی کے دوسرے حصہ سے رسول کی اطاعت ہو۔

(5) قرآن کریم میں جملہ مومنین کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے 12:38 ' اس عمومی حکم کی موجودگی میں حضور ﷺ کو الگ حکم ہوا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:159)۔ کاموں میں مومنین سے مشاورت کر لیا کرو۔ اگر حضور ﷺ کے اقوال وحی خفی تھے تو کیا وحی مشورہ کے بعد نازل ہوتی تھی۔ وحی میں تو مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

(6) اگر روایات وحی تھیں، تو انہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ کرانے کی ذمہ داری حضور ﷺ پر تھی۔ وحی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا اور دوسرے حصہ کو راویوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔ اس طرح تو راوی حضرات کارِ رسالت میں شریک قرار پاتے ہیں۔

(7) ہمارے علماء روایات کو وحی خفی قرار دیتے ہیں لیکن قرآن کی رو سے وحی خفی نہیں ہوسکتی کیونکہ حضور ﷺ کو حکم تھا: بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5:67)- جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا اس کو پہنچا دو۔ وحی اگر چلتی تلواروں میں بھی نازل ہوتی تھی تو رسول ﷺ کا فرض تھا کہ اس کو فوراً پہنچا دیں۔ وحی خفی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ نام ہی غلط ہے اور خلاف قرآن ہے۔

الہام کی بحث

وحی خفی (روایات) کے علاوہ دوسرا ذریعہ علم خداوندی حاصل ہونے کا الہام کو قرار دیا جاتا ہے۔ الہام کے بارے میں عرض ہے کہ الہام کا لفظ ہی قرآن کریم میں کسی جگہ نہیں آیا جس سے الہام کی سند حاصل کی جاسکتی البتہ اس مادہ سے اَلْهَمَ کا لفظ سورہ شمس میں ایک جگہ آیا ہے جس کا غلط مفہوم لینے سے ہم مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن فہمی کے سلسلہ میں

ایک بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ کے اصل Original معانی نہیں لیتے جس معنے میں وہ نزول قرآن کے وقت مستعمل تھے۔ بلکہ ہم ان کو نئے معانی پہنا کر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کا یہ اصطلاحی مفہوم احادیث اور تصوف کے زیر اثر خود ایسا متعین کرتے ہیں جس کا قرآن کے اصل مفہوم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر قرآن میں جب وہ لفظ اپنے اصل مفہوم میں آتا ہے، تو ہم فوراً اس کو اپنے اصطلاحی معنے کے لئے بطور سند پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح آیۂ کریمہ کا سارا مفہوم اپنا پیدا کردہ ہو جاتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں وسیلہ، امام، روح، محراب، توبہ، استغفار، تہجد وغیرہ الفاظ ہیں۔ الہام کے لفظ کے بارے میں بھی بعینہ یہی غلطی ہوئی ہے۔ اَلْهَمَ کا لفظ قرآن میں صرف ایک جگہ آیا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91:8)- اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ''پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ نکلنے کی''۔ صاحبِ 'تدبر قرآن' نے اس کا ترجمہ 'پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی' کیا ہے۔ ان دونوں تراجم میں الہام کا کوئی تصور نہیں دیا گیا۔ جو روایات اور تصوف کی وجہ سے ہمارے ہاں خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں الہام کے یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ جو لوگ بہت عبادت گذار ہوتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے لگ جاتا ہے اور یہ الہام ہوتا ہے۔ لیکن آیہ کریمہ میں اس بات کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس میں مومن و کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ہر نفسِ انسانی میں اچھے یا برے کام کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اب یہ اس نفس انسانی کے صوابدید پر ہے کہ وہ چاہے تو اچھے امور (تقویٰ) سرانجام دے اور چاہے تو برے کام (فجور) کرتا رہے، اس آیہ کریمہ سے مزعوم الہام کی کوئی سند نہیں ملتی۔

الہام کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الہام اور وحی میں یہ فرق ہے کہ جس شخص کو الہام ہوتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مطلب اسے کہاں سے حاصل ہوا ہے جبکہ وحی کے وقت وہ جانتا ہے کہ یہ اسے کہاں سے اور کس ذریعہ سے پہنچتی ہے۔ بعض مفسرین کرام کا یہ بھی خیال ہے کہ وحی و

الہام یہ فرق ہوتا ہے کہ وحی سے حاصل کردہ علم یقینی ہوتا ہے جبکہ الہام سے حاصل کردہ علم ظنی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ جو علم خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو وہ ظنی ہو ہی نہیں سکتا۔ مفسرین کرام نے الہام کی جو تعریف (Definition) بیان فرمائی ہے۔ وہ تعریف ہی غلط ہے۔ پھراس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ مختلف حضرات کے الہام ایک ہی مسئلہ میں مختلف بیان ہوئے ہیں۔ اس کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہو' اور اس میں باہمی تضاد ہو' یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی تردید میں جو آخری کیل گاڑی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ الہام کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ مُلْهَم (جس کو الہام ہو) کو صرف کوئی مفہوم یا خیال الہام کیا جاتا ہے۔ مُلْهَم اس خیال کو خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ ہمارے علماء کرام میں چلا آرہا تھا' لیکن اب سائیکالوجی اور فلولوجی (Phylology) کی ترقی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کوئی خیال بغیر لفظ کے آ ہی نہیں سکتا۔ زبان و خیال میں ظرف و مظروف کی نسبت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طے شدہ بات ہے کہ خیالات زبان اور الفاظ کی قید سے کسی حال میں بھی آزاد نہیں ہو سکتے بغیر الفاظ کے مضمون و خیال کا الہام ہونا ہی ناممکن شے ہے۔ فلہٰذا آیہ کریمہ کا وہی مفہوم درست ہے کہ نفس انسانی میں نیکی (تقویٰ) اور بدی (فجور) کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اب جس کا دل جو چاہے وہ تقویٰ کے کام کرے اور جس کا دل چاہے وہ بدی (فجور) اختیار کرے۔

علمِ لدُنیّ کی بحث

علم لدنی کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ یہ علم' رسول اللہ ﷺ سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ حالانکہ علم کا منبع و مصدر دماغ ہے۔ سینہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے بھی سوچ اور فکر کا مرکز دماغ کو قرار دیا ہے۔ قرآن کریم چونکہ عربوں کی روزمرہ کی زبان میں نازل ہوا تھا' اور محاورۂ عرب میں

دل کو فکر کا مرکز قرار دیتے تھے اس لئے قرآن نے ان کی زبان کے لحاظ سے سینہ کو علم کا مرکز بیان کر دیا ہے۔ ورنہ جب قرآن نے خود علم کی تعریف کی ہے تو فوادیعنی دماغ کو ہی علم کا مرکز وذریعہ قرار دیا ہے (17:36)- اگرچہ اردو کی مثال عربی پر حجت نہیں ہو سکتی لیکن اسلوب بیان اور انداز کلام تک زبانوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں علم ہوتا ہے کہ سوچ کا ذریعہ فواد (دماغ) ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہی کہتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ آج سیر کو چلو۔ ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ دماغ چاہتا ہے کہ سیر کو چلیں۔ قرآن کریم کی رو سے سوچ کا ذریعہ دماغ ہے۔ دل نہیں ہے۔ لہٰذا علم لدنی کے بارے میں یہ نظریہ کہ یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ علمی طور پر غلط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی قواعد کی رو سے بھی یہ اصطلاح درست نہیں ہے۔ یہ اصطلاح خود عربوں کی وضع کردہ نہیں ہے۔ یہ صدر اول کے بہت بعد غیر عربوں نے وضع کی ہے۔ اس لئے یہ عربی قواعد کی رو سے بھی غلط ہے۔ عربی زبان میں لَدُنَ کے معنے ہیں۔ ''طرف سے۔ ہاں سے' مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (11:1)- خدائے حکیم وعلیم کی طرف سے۔ اس لئے لَدُنّیِ کے معنے ہیں' میری طرف سے۔ علم لدنی کے لغوی معنے ہوئے' میرا دیا ہوا علم۔ لیکن اس سے مراد لیتے ہیں خدا کا دیا ہوا علم۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے ولی اللہ ہیں اور ان کو علم لدنی حاصل ہے تو عربی قواعد کی رو سے اس کے لغوی معنے یہ ہوئے کہ فلاں صاحب بہت بڑے ولی ہیں کہ ان کے پاس میری طرف سے دیا ہوا علم ہے۔ حالانکہ عربی قواعد کی رو سے یہ کہنا چاہئے تھا کہ فلاں ولی اللہ کو ''علم من اللہ'' یا ''علم من عند اللہ'' حاصل ہے۔ جس اصطلاح کا یہ حال ہو کہ وہ عربی قواعد کی رو سے ہی غلط ہو' تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔

جب اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرنے کے طریقہ کو جائز قرار دے دیا گیا تو پھر استخارہ بھی رائج ہو گیا۔ استخارہ کے معنے ہیں ''دو باتوں میں سے بہتر چیز کو طلب کرنا''۔ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا ہے تو استخارہ کر لیتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے منشائے خداوندی معلوم کرتے

ہیں۔ جب کسی بیٹی کا رشتہ آتا ہے تو استخارہ کر کے معلوم کرتے ہیں کہ اس جگہ شادی کرنی چاہئے یا نہیں۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ استخارہ کے ایجاب کے باوجود بیشتر اوقات وہ شادی کامیاب نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی لوگ اس عقیدے پر قائم ہیں۔ استخارہ کا رواج صرف عوام میں ہی نہیں ہے بلکہ حضرت اقدس جناب مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق تحریر ہے کہ جب آنجناب نے مسلم لیگ میں شرکت کی تھی تو حضرت اقدس نے جناب باری میں استخارہ کیا تھا' اور استخارہ کے ایجاب میں آنے کے بعد حضرت نے مسلم لیگ Join کی تھی' لیکن واضح رہے کہ استخارہ کے ذریعے براہ راست علم خداوندی حاصل کرنا' ختم نبوت کی تردید کرنا ہے۔

اسی طرح لوگ قرآن کریم سے تفاول بھی کرتے ہیں' مغل بادشاہ دیوانِ حافظ سے تفاول کرتے تھے۔ یہ تفاول عام معمولی باتوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ جب کسی اہم مہم پر جاتے تھے تو دیوانِ حافظ سے تفاول کر لیتے تھے۔

خوب ذہن نشین فرما لیں کہ اللہ تعالیٰ سے کسی شخص کو بھی کسی طرح سے بھی اب علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ختم نبوت کے معنے ہی یہ ہیں کہ حضورﷺ کے بعد کسی شخص کو کوئی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے' کسی ذریعے سے بھی' حاصل نہیں ہوسکتا' جو علمِ خداوندی حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور توہین رسالت اور توہین قرآن کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی تائید میں کہ حضورﷺ کے بعد کسی شخص کو بھی' کسی ذریعے سے علم خداوندی حاصل نہیں ہوسکتا۔ سورہ شوریٰ کی آیت حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس آیہ کریمہ کی وضاحت اس سے پیشتر کئی مرتبہ کی گئی ہے۔ اس کو ایک بار پھر نہایت وضاحت کے ساتھ' حد درجہ آسان کر کے' اس درخواست کے ساتھ پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے کہ جو حضرات اس نظریہ کے قائل ہیں وہ اس آیہ کریمہ کے مفہوم کو ضرور بالضرور ذہن نشین فرما لیں تاکہ وہ اس بارے میں کسی شک وشبہ میں نہ رہیں۔ یہ قرآن کریم کی اہم ترین آیات میں شمار ہوتی ہے اور یہی وہ آیہ کریمہ ہے جس کا غلط

مفہوم لینے سے تصوف، تشیع، احمدیت کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر اس کا قرآنی مفہوم اختیار کر لیا جائے تو یہ تینوں نظریات خود بخود منقرض ہو جاتے ہیں۔

ارشاد جناب باری تعالیٰ ہوتا ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَن يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِاِذْنِهِ مَا يَشَاءُ اِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (42:51)- کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر (1) وحی کے ذریعے (2) یا پردہ کے پیچھے سے (3) یا کوئی فرشتہ بھیج دے، پھر وہ جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے، بے شک وہ عالی شان حکمت والا ہے۔

اب آپ اس آیہ کریمہ کا وہ مفہوم ملاحظہ فرمائیں جو ہمارے مفسرین کرام نے لکھا ہے۔ اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ ایک ہزار سال کے عرصہ میں ہمارے علماء کرام نے غلط مفہوم لیا ہے اور سب فرقوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اس سارے عرصہ میں کسی بھی فرقہ کے، کسی ایک مفسر نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا، لیکن ان کے مفہوم میں جو غلطیاں ہیں وہ اس درجہ واضح ہیں کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور ان کی نشاندہی بھی جناب کی خدمتِ عالی میں پیش کی جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام وہ پہلی تحریک اور خالص قرآنی فکر ہے جس نے اس ایک ہزار سال سے سرزد ہوتی ہوئی متفق علیہ غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

ہمارے مفسرین کرام نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ (1) پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام الہام فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ (2) دوسرا طریقہ من ورائے حجاب ہے۔ یعنی پردے کی اوٹ سے اور یہ موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں عموماً مفسرین کا اتفاق ہے اور ہمیں بھی اس دوسرے طریقہ سے اتفاق ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کے ساتھ مخصوص تھا۔ (3) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا رسول یعنی کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم سے جو

کچھ اللہ چاہتا ہے' پیغمبر کے دل پر الہام کر دیتا ہے۔اس آیت کا یہ مفہوم ''تدبر قرآن'' سے لیا گیا ہے۔

تفسیر نمونہ ایران میں انقلابِ ایران کے بعد تحریر کی گئی ہے' اسے (غالباً) وہاں کی اسلامی حکومت کی تائید بھی حاصل تھی' اسے آٹھ علماء کرام نے تحریر فرمایا ہے جن سب حضرات کے نام کے شروع میں حجت الاسلام والمسلمین تحریر کیا گیا ہے۔ان سب ''حجج'' نے بارہ سابقہ تحریر شدہ تفاسیر سے استفادہ کیا ہے جن کے نام اس تفسیر کے شروع میں درج کر دیئے گئے ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس تفسیر نے جو مفہوم اس آیت کا کیا ہے۔سابقہ تمام بارہ تفاسیر نے بھی یہی مفہوم کیا ہو گا۔ان تمام علماء کرام نے اس آیت کی تفسیر کا عنوان یہ تحریر کیا ہے ''انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کے ذرائع'' اس کے بعد تقریباً وہ ہی تین طریقے بتائے ہیں جو ہمارے جمہور علماء بتاتے ہیں جو اوپر ''تدبر قرآن'' کے حوالہ سے تحریر کر دیئے گئے ہیں۔اس تفسیر کے سلسلہ میں ہمارا مقصد صرف اس کے عنوان کا حوالہ دینے سے ہی پورا ہو جاتا ہے کہ وہ ان ذرائع کو صرف نبیوں تک محدود سمجھتے ہیں (اس پر تبصرہ آگے آتا ہے)۔ان دو حوالوں کے علاوہ دیگر تفاسیر کے حوالے سے مضمون طویل ہوتا ہے' اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

پھر تجدید یادداشت کے لئے مختصراً پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کے مطابق اس آیت میں صرف انبیاء کرام کو وحی ملنے کی تین صورتیں بیان کی جا رہی ہیں۔پہلی صورت براہ راست وحی (الہام) دوسری قسم پردے کے پیچھے سے کلام جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مخصوص ہے اور تیسری قسم اللہ کے پیغام رساں ملک (فرشتہ) کے ذریعے جو رسول پر الہام کرتا ہے۔لیکن علمائے کرام کی یہ تفسیر ان وجوہات سے غلط ہے:

(1) ہمارے مفسرین کرام کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کو صرف انبیاء تک محدود کر دیا ہے اور باقی سب انسانیت کو Ignore کر دیا ہے۔آیہ کریمہ نے ''بشر'' کا لفظ

استعمال کیا ہے اور ساری انسانیت کو علم خداوندی حاصل ہونے کے طریقے بتائے ہیں، جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے۔ تفسیر نمونہ نے عنوان ہی ''انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کے ذرائع قرار دیا ہے۔ اس آیت کا منشاء وفحویٰ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک ان ذرائع کو پوری انسانیت پر محیط نہ کیا جائے اور جب تک یہ طریقے ساری انسانیت کو Cov er نہ کرلیں۔ اگر آیہ کریمہ میں **وما کان لنبیٍ** ہوتا کہ کسی نبی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ان طریقوں سے تو علماء کرام کی تفسیر درست ہوجاتی کہ اس آیت میں انبیاء سے کلام کرنے کے طریقے بتائے جارہے ہیں لیکن یہ آیت پوری انسانیت کو علم دینے کے ذرائع کا احاطہ کر رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو پوری انسانیت کو علم دیا ہے اور پوری انسانیت کو **یاایھا الذین آمنوا** اور **یاایھا الناس** کہہ کر خطاب کیا ہے۔

(2) دوسری غلطی مفسرین کرام کی یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں رسول کے معنے رسول ہی درست ہیں۔ محض ایک خلاف قرآن نظریہ کو زبردستی آیت میں داخل کرنے کے لئے یہاں رسول کے معنے فرشتہ کئے گئے ہیں۔ جب کوئی لفظ اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوسکتا ہے تو وہ اصل معنے لینا ہی ضروری ہے۔ یہاں رسول کے معنے فرشتہ کرنے کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اصلی معنے چھوڑ کر، مجازی معنے لینا مناسب نہیں۔

(3) کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ پیغام ارسال کرنا، خود پہلی قسم **وحیاً** میں داخل ہے۔

(4) وحی کی پہلی صورت کا مفہوم الہام کیا گیا حالانکہ یہاں الہام کا دور دور کوئی تعلق نہیں ہے۔ الہام کی بحث طویل ہے۔ اس جگہ اس کو دہرانا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات اتنی واضح ہے کہ جس نبی کو وحی مل رہی ہو اسے الہام سے کیا فائدہ۔ اگر الہام کوئی چیز ہے بھی تب بھی الہام کے قائلین کے نزدیک وحی اور الہام میں سورج اور چراغ کی نسبت ہے۔ جب وحی مل رہی ہے تو الہام

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(5) انسان کے خدا سے تعلق ہونے کے یہ تین طریقے ہیں، جس کی رو سے صلصلۃ الجرس، گھنٹیوں کی آوازیں، خواب، مبشرات، اور باقی کئی طریقے جو ہمارے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں سب خارج از امکان ہو جاتے ہیں۔

اب آیہ کریمہ کا درست مفہوم خدمتِ عالی میں پیش کیا جاتا ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیہ کریمہ میں صرف انبیاء کرام کو نہیں بلکہ پوری نوعِ بشر تک اللہ کی ہدایت وصول ہونے کے طریقوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تو رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوعِ بشر۔ زیرِ نظر آیہ کریمہ میں پہلے دو طریقے رسولوں کو ہدایت ملنے کے بتائے جا رہے ہیں۔ ایک وہ وحی ہے جو جبرئیل لاتے تھے۔ جیسا کہ حضور ﷺ پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعے جس کی بابت ارشاد ہے: فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ (2:97)۔ اور دوسرا طریقہ من ورائے حجاب، فرشتے کے بغیر براہ راست۔ اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کی طرف وحی ہوئی تھی جس کا ذکر سورہ طٰہٰ میں ہوا، یہ طریقہ صرف حضرت موسیٰ سے مخصوص تھا۔ یہ مذکورہ بالا دو طریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔

اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام نوعِ بشر مشتمل ہے اور جو رسول کے زمرہ میں نہیں آتی ان کے ساتھ کلام خداوندی کرنے کا طریقہ یہ تھا اور ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول بھیجتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام تمام انسانوں کو پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ وذریعہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا تھا اور وحی الٰہی یعنی علم خداوندی بھی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ تمام انسانوں کو خدا کی وحی

صرف انبیاء کرام کی معرفت ہی ملتی تھی۔

آیہ کریمہ کا جو درست مفہوم پیش خدمت عالی کیا گیا ہے' اس سے اگلی آیت نے اس مفہوم کو مزید واضح کر دیا ہے جبکہ حضور ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا کہ: وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (42:52)۔ہم نے اسی طرح جس طرح کہ ہم رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے تھے تیری طرف بھی عالم امر سے وحی کی ہے۔ آیت کے اس حصہ تک تو خدا کے اس کلام کا ذکر ہوا جو اس نے حضور کے ساتھ بذریعہ وحی کیا۔اس کے بعد ارشاد ہوا: وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (42:52)۔اور اے رسول تو یقیناً لوگوں کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے اور اس طرح عام عالم بشریت کو کلام الٰہی پہنچاتا ہے۔

اس مضمون میں حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ آیت کا مفہوم خوب روشن اور واضح کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ آیت بڑی اہم اور بنیادی ہے۔محترم المقام جناب پرویز صاحب نے اس آیت کی تفسیر مختلف مقامات پر تحریر کی ہے۔ان میں سے چند مقامات نقل کئے جاتے ہیں تا کہ اس آیت کا مفہوم جناب کے خوب ذہن نشین ہو جائے۔آیت آپ اپنے ذہن مبارک میں سامنے رکھیں۔ جناب پرویزؒ نے تحریر فرمایا:''اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسانوں میں خدا کی ہم کلامی کے تین طریقے ہیں۔ پہلے دو طریقے انبیاء کرام کے ساتھ ہمکلامی کے ہیں اور وہ ہیں بذریعہ وحی یا پس پردہ گفتگو۔اور تیسرا طریقہ عام انسانوں (انبیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں) سے ہم کلامی کا۔یہ طریقہ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی طرف وحی کرتا ہے اور وہ نبی اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیتا ہے جس طرح آج ہم سے خدا قرآن کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔''(برقِ طور' صفحہ 183)۔

مطالب الفرقان جلد سوئم' صفحہ 22 پر تحریر ہے۔ خدا انسان سے کلام کرتا ہے کس طرح؟ اِلّا وحیاً' وحی کے ذریعے اور من ورائے حجاب یا پردے کے پیچھے سے'(جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا) یہ دونوں طریقے حضرات انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے باقی رہے دوسرے

لوگ (یعنی غیراز نبی) سوان کے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا طریقہ یہ ہے: أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (42:51)۔ ان کی طرف خدا کا رسول بھیجا جاتا تھا جو ان تک خدا کے وہ احکام پہنچاتا تھا جنہیں خدا اپنے قانون مشیت کی رو سے' اس رسول کو دیتا تھا۔ یعنی غیراز نبی انسانوں سے خدا براہ راست کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام' انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ وحی کے معنے' کسی کے حکم کو کسی کی طرف پہنچانے کے بھی ہیں''۔

لغات القرآن' صفحہ 1494 پر مرقوم ہے:

''اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے۔ بشر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰ کی صورت میں ہوا) باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے' اس کے باہر اور کہیں نہیں۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (ینزل علیکم) (3:71, 2:105)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے۔''

مفہوم القرآن میں اس آیت کا مفہوم یہ تحریر ہے:

''(خدا ہر انسان سے براہ راست ہم کلام نہیں ہوتا) اس کی ہم کلامی کے تین طریقے ہیں۔ دو طریقے انبیاء سے مخصوص ہیں اور تیسرا طریق عام انسانوں کے لئے۔ انبیاء سے خدا کی ہم کلامی کا طریق یہ ہے کہ کبھی خدا

کی بات نبی کے دل میں ڈال دی جاتی ہے (2:97)، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پس پردہ خدا کی باتیں کان تک پہنچ جاتی ہیں جیسے حضرت موسیٰ کے ساتھ (2:253 ,4:164) یہ دونوں طریقے انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ باقی رہے غیر انبیاء (عام انسان) سو ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے جو ان تک وحی پہنچاتا ہے جسے خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اس رسول کو دیتا ہے (کوئی غیر از نبی خدا سے براہ راست ہم کلام نہیں ہو سکتا۔) یہ انتظام اس خدا کی طرف سے ہے جو علم کی انتہائی بلندیوں کا مالک ہے اور جس کا ہر فیصلہ اور انتظام حکمت پر مبنی ہے۔''

آپ نے اس آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں 4 اقتباسات جناب محترم پرویز صاحب کے ملاحظہ فرمائے۔ امید ہے کہ اب اس آیہ کریمہ کا مفہوم جناب کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی منع ہے

قرآن کریم نے مسلمانوں کوایک ایسی قوم قرار دیا ہے کہ جو تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران ہواور ان کی مرکزی اتھارٹی اور حاکم اعلیٰ ان کا نگراں ہو چنانچہ فرمایا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (2/143)-

اوراس طرح ہم نے تمہیں امت وسطیٰ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پرنگران بنو اور پیغمبرتم پرنگران بنے۔

قرآنِ کریم امت مسلمہ پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ پوری دنیا میں تمام اقوام کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے پاس اتنی قوت وطاقت ہو کہ وہ ہر قوم کو عدل وانصاف پر قائم رہنے پر مجبور کرے اوراس طاقت کے ذریعے ظلم وزیادتی کرنے سے روک دے۔ یہ قوت وطاقت اور یہ بلند مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان خود آپس میں اتحادواتفاق رکھیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو إِخْــوَةٌ قرار دیا ہے۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (49/10)۔ یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اوران کا فرض ہے کہ آپس میں بھائیوں کی طرح پیش آئیں۔ اگران میں آپس میں دوفریقوں میں کوئی اختلاف ہوجائے تو باقی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کا اختلاف دورکرا کران کے مابین صلح کرا

دیں (49/9)۔

قرآنِ کریم مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اوراس اختلاف کے واقع نہ ہونے کا واحد طریقہ قرآن کریم سے تمسک قرار دیتا ہے۔ وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ (3/103)۔اورسب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور فرقے نہ بننا۔ اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کو تاکیدی حکم ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنا اور فرقہ نہ بنانا۔ آیت کے الفاظ واضح اور بہت موثر ہیں۔ آیت کا پہلا حصہ موجبہ اور دوسرا سالبہ ہے۔ یعنی پہلے حصہ میں یہ امر ہے کہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور دوسرے حصہ میں نہی ہے کہ فرقہ نہ بننے دینا اس طرح آیت کے مفہوم کو بہت Forcef ully بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقہ نہ بنانا۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ فرقہ بنتا ہی اسی وقت ہے جب اللہ کی رسی (قرآن) ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ جب تک اللہ کی رسی ہاتھ میں رہے گی فرقہ نہیں بنے گا فرقہ صرف اسی صورت میں بنتا ہے جب اللہ کی رسی (قرآنِ کریم) کو چھوڑ دیں۔ آیت سے واضح ہے کہ فرقہ بندی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب قرآن کریم کو ترک کرنا ہے اور فرقہ پرست کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں رہتا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد عالی ہے: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30/32)- اور مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے بن گئے اور سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو ان کے پاس ہے نیز ایک اور آیۂ شریفہ میں قرآن کریم میں ارشاد ہوا: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُواْ دِيْنَهُمْ وَكَانُواْ شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (6/159)۔ جن لوگوں نے اپنے دین میں کئی فرقے بنا لئے اے نبی تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق

باقی نہیں رہتا۔ ان تین آیات کریمات 3/103 ,30/32 ,6/159 سے علیٰ الترتیب ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ قرآن سے رہتا ہے اور نہ ہی اللہ و رسول سے۔ فرقہ بندی کرنے والے اور کسی ایک فرقہ کو اختیار کرنے والے اپنے زعم میں وہ کتنا ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار قرار دیں لیکن قرآن کریم کی رو سے ان کا کوئی تعلق بوجہ شرک اللہ، رسول یا کتاب سے برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کریم ان قطع علائق ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ مزید ارشاد ہوتا ہے:

وَلاَ تَكُونُواْ كَالَّذِينَ تَفَرَّقُواْ وَاخْتَلَفُواْ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُوْلَـئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (3/105)۔ (ترجمہ) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے بنا لئے اور احکام آنے کے بعد ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے۔ اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کے خلاف واضح احکام آنے کے بعد بھی اگر فرقہ بندی کی گئی تو فرقہ بندی کرنے والوں کے لئے عذاب عظیم ہے۔ قرآن کریم نے عذاب الٰہی کی یہ مختلف شکلیں بھی خود ہی شمار کرا دی ہیں۔

(1) دنیاوی زندگی میں ذلت اور خواری اللہ کا عذاب ہے (20/134)۔

(2) بھوک اور خوف اللہ کا عذاب ہے (16/112)۔

(3) برکات سماوی و ارضی کے لئے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (7/96)۔

(4) گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (6/65)۔

(5) باہمی اختلاف عذاب ہے (3/104) اور عذاب کا دور ہونا رحمت ہے (11/118)۔

یہ عذاب الٰہی کی چند شکلیں ہیں اسی طرح قرآن کریم نے ان تمام مصائب و نوائب و بلیات کو جو قوم فرعون اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر کرتی تھی عذاب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے (20/47) قرآن کریم نے مندرجہ بالا آیۂ کریمہ (3/105) میں آگاہ کر دیا ہے کہ جو قوم بھی

فرقہ بندی کرے گی اس کے لئے عذاب عظیم ہے اور قرآن کریم نے عذاب عظیم کی مختلف شکلیں خود بیان فرمادی ہیں جو فرقہ بند قوم پر وارد ہوتی ہیں اور عملاً ہماری قوم فرقہ بندی کی وجہ سے عذاب کی ان تمام کیفیتوں میں مبتلا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم میں اب تک اس کا احساس نہیں ہے۔

انسان کی آخری حالت موت کے وقت ہوتی ہے جس وقت ہر فرقے والے کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا پروردگار' اس کا رب کریم (رحیم) اس سے خوش و راضی ہو۔ اس عین موت کے وقت کے لئے فرمایا: وَلاَ تَمُوتُنَّ اِلاَّ وَاَنتُم مُّسلِمُونَ (3/102) ۔ اور تم مرنا تو صرف مسلمان ہی مرنا۔ اس آخری حالت میں صرف خالص مسلمان ہی ہونا چاہئے' کسی بھی فرقہ کے نام سے منسوب ہونے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو اور انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ حضورﷺ نے خود کو بھی اول المسلمین فرمایا تھا۔ اس لئے ہمیں بھی قرآن کے حکم اور حضور کے اتباع میں خود کو مسلمان کہنا اور کہلوانا چاہئے اور جو لوگ اتباع سنت کا ادعا بہت جوش و خروش سے کرتے ہیں ان کے لئے تو از بسکہ لازم ہے کہ وہ صرف مسلمان کہلائیں اور کسی بھی فرقہ سے منسلک نہ ہوں۔ فرقہ بندی کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں قرآن کریم کا موقف اور حکم بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم فرقہ بندی کی کس درجہ مذمت کرتا ہے' لیکن حیرت و تاسف کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں فرقہ بندی نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر عالم' ہر مسجد' ہر جامعہ' ہر مدرستہ العلوم کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ منسوب ہوتا ہے اور جس قدر بڑا عالم ہوتا ہے' اسی نسبت سے وہ اپنے فرقہ میں غالی اور متشدد ہوتا ہے اور ان تمام واضح آیات کریمات کے باوجود جو درج کی گئی ہیں' فرقہ بندی سے اعراض (بچاؤ) نہیں کرتا۔ عموماً کہا یہ جاتا ہے کہ فرقہ بندی کے خلاف تو کوئی اعتراض نہیں ہے' البتہ اعتراض اس بات پر ہے کہ فرقے آپس میں تنازعات کریں۔ اور انہیں چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آئیں۔ لیکن یہ بات قرآن

کریم کے بھی خلاف ہے اور عملاً بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ فرقہ بننے کے بعد ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ خود درست ہے اور دوسرا فرقہ باطل پر ہے۔ اس لئے فرقہ بندی کرنے کے بعد رواداری بالکل ممکن نہیں ہے۔ غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ فرقہ بنتا کیسے ہے اور فرقہ بندی کا تدارک کیا ہے اور فرقہ کی تعریف Def inition کیا ہے۔

قرآن کریم چونکہ ایک ابدی اور عالمگیر کتاب ہے۔ اس لئے جو نظام حیات وہ پیش کرتا ہے اس میں اس نے بہترین معاشرے کی تشکیل کے لئے صرف اصول بیان کئے ہیں۔ جن کی جزئیات ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنے اپنے دور اور ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ صدر اول میں حضور ﷺ کے دور میں' اور خلافت راشدہ کے دور میں اس کی جزئیات حکومت کی طرف سے متعین و مقرر ہوتی رہیں اور ان کا اجراء و نفاذ ہوتا رہا۔ انسانیت کی بدقسمتی سے وہ نظام منقرض ہو گیا اور ملوکیت کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس میں دنیاوی امور بادشاہ خود طے کرنے لگے اور دینی امور دینی ماہرین یعنی علماء کرام سے مخصوص ہو گئے۔ چونکہ مختلف حضرات نے اپنی اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی جزئیات مقرر کیں' اس لئے ان میں وقت و مقامات اور ذاتی میلانات و رجحانات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان جزئیات میں بھی اختلاف ہوا۔ یہ جزئی قوانین جو ان حضرات نے وضع فرمائے تھے یہ اس دور کی فقہ و شریعت تھے۔ یہ شریعت و فقہ ابدی حیثیت کے حامل نہیں تھے نہ ہی ان کے مدون کرنے والوں کا یہ خیال تھا۔ ابدیت' سرمدیت' ہمیشگی واستقلال تو صرف قوانین الٰہی کے لئے مخصوص و مختص ہیں اور ہم صرف اسی کے اتباع کے مکلّف ہیں۔ اتَّبِعُواْ مَا اُنزِلَ اِلَیْکُم مِّن رَّبِّکُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِہِ اَوْلِیَاء (7/3)- جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اس کے علاوہ سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ یہ مختلف فقہیں اور شریعتیں جن کی اتباع کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوتی ہے یہ سب بنو عباس کے دور میں مدون ہوئی تھیں اور وہ حکومتیں صرف مسلم حکومتیں تھیں ان میں

بادشاہت کا موجود ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ملوکیت کے تابع مسلم حکومتیں تھیں۔ اسلامی حکومتیں ہرگز ہرگز نہیں تھیں۔ جس طرح آج ترکی، مراکش، مصر، وغیرہ کی حکومتیں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، مگر اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوعباس کی حکومت مسلم حکومت تو تھی، اسلامی حکومت نہیں تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے وضع کردہ قوانین، اسلامی قوانین نہیں ہوسکتے اور اس دور کی حکومت کے قوانین کی پابندی اس دور کے لوگوں کے لئے ضروری تھی۔ ہم اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اس دور کی شریعت ہوتے ہیں۔ ہم غلطی سے ان سابقہ وضع کردہ قوانین کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ فقہ مختلف حضرات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے ہم میں مختلف اماموں کی طرف انتساب کرنے کی وجہ سے فرقہ بندی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہم اب اسلامی حکومت قائم کر کے اپنی ضروریات کے مطابق قرآن کریم کی جزئیات خود مقرر کرتے ہیں اور وہ بطور قانون جاری کرنے لگیں تو فرقہ بندی از خود ختم ہو جائے گی۔

مثلاً قرآن کریم نے روزے کے متعلق فرمایا: اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (2/187)- روزے کو رات تک پورا کرو۔ آج کل مختلف فقہ میں رات کو مختلف وقت سے شروع کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے روزہ افطار کرنے کا ایک وقت نہیں رہا۔ اور اس بارے میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے۔ اس دور کی اسلامی حکومت خود رات کے شروع ہونے کا تعین کر دے کہ رات فلاں وقت سے شروع ہوتی ہے اور سب باشندے اور شہری اس مقررہ وقت پر افطار کریں، تو اس طرح یہ اختلاف رفع ہو جائے گا۔ اسی طرح قرآن کریم نے چور کی سزا قطع ید قرار دی ہے لیکن نہ تو چور کی وضاحت فرمائی کہ چور کس قدر مال چرانے سے چور بنتا ہے اور نہ ہی ہاتھ کی تعریف فرمائی کہ قطع ید کس جگہ سے ہو۔ اس لئے مختلف فرقوں میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ اسلامی حکومت ان دونوں امور کی خود وضاحت کر دے گی۔ اسلامی حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ اس

طرح اختلافی مسائل حل کر دے۔ ہمارے ہاں اختلاف جزئیات کے مختلف تعین کی وجہ سے ہوا ہے جس کی وجہ سے مختلف فقہ وجود میں آئے۔ صرف ان مختلف جزئیات کی وجہ سے فرقہ بندی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا واحد حل اسلامی حکومت کا قیام ہے اور وہ حکومت خود قرآن کریم کے اصول و احکامات کی جزئیات مقرر کر دے، وہی اس دور کی فقہ ہوگی اور اس طرح فرقہ بندی ختم ہوسکتی ہے۔ خوب ذہن نشین فرمالیں کہ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے دین میں تو فرقہ بندی کا امکان ہی نہیں ہے۔ جس کی وضاحت سابقہ سطور میں کر دی گئی ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی الفاظ کے مذہبی اور دینی مفاہیم

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات ہے۔اس کے جاری کردہ نظام کا نام دین ہے۔قرآنِ کریم کے الفاظ واصطلاحات کا مرکزی محور دین ہے اور دین کے عملی نفاذ کے گرد ہی اس کے الفاظ گردش کرتے ہیں۔ جب دین نے مذہب کی شکل اختیار کر لی تو قرآنِ کریم کے الفاظ واصطلاحات کے معانی ہی بدل گئے۔اب ان الفاظ کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ ان کو ایک مذہبی تقدس (Sanctity) حاصل ہو گیا اور ان تمام الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم ومنطوق پرستش و پوجا کے لئے مختص ہو گیا۔خود قرآنِ کریم کو ایک قانون اور دستور حیات خیال کرنے کے بجائے صرف تلاوت اور ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دے دیا گیا۔اس کو پڑھنے کے لئے پہلے وضو کرنا مستحب قرار دیا گیا۔حالانکہ ایک ایسا ضابطۂ حیات جس کو ہروقت سامنے رکھنا ہو اور ہر قانون دان، وکیل، بیرسٹر، سینئر جج، کے پاس ہر وقت موجود ہو، ان سب کو ہروقت باوضو رہنا مشکل ہوتا ہے۔قرآنِ کریم پرستش کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ پرستش مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں عملاً اس ضابطۂ حیات کی اجتماعی طور پر اطاعت ہوتی ہے اور یہی اطاعت عبادت خداوندی ہے۔

ہمارے ہاں مذہب میں ان الفاظ کے مفاہیم کو اس درجہ تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کا دینی مفہوم اب بالکل مخفی ہو گیا ہے۔ یہ تمام الفاظ اطاعت کے بجائے پرستش کے گرد گردش کرنے

لگے۔ ان میں سے ایک ایک لفظ‘ اطاعت کی تردید اور پرستش کی حمایت میں استعمال کیا جانے لگا۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ ایک ہزار سال سے چلا آرہا ہے اور ہمارا سارا لٹریچر خصوصاً تفاسیر و احادیث پرستش کے نقطۂ نگاہ سے ہی تحریر کی گئی ہیں۔ فرقہ اہل قرآن کے طبقۂ اولیٰ کے سامنے بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی فقہ کو قرآن کے مطابق کرنے‘ اور وحی خفی کی تردید کرنے میں ہی اپنی کوششیں صرف کرتے رہے۔ وہ مذہب کی سطح تک ہی رہے۔ دین کی بلند سطح تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ مجد اور شرف تحریک طلوع اسلام کے حصہ میں آیا کہ اس تحریک نے قرآن کریم کو دین کی حیثیت سے پیش کیا۔ ہمارے ایک ہزار سال کے لٹریچر میں یہ پہلی کوشش ہے کہ اسلام کو دین کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس تحریک کے بانی اور داعی قرآن و اسلام‘ علیہ الفَ الفَ تحیتہً و سلام‘ کو اللہ تعالیٰ اعلیٰ درجات عنایت فرمائے کہ ان کی قرآنی بصیرت نے مذہب اور دین کے امتیاز کو نہ صرف Detect کیا بلکہ اس امتیاز کو خوب خوب واضح طور پر پیش کیا۔ ان کی ساری عمر کی مساعی جمیلہ اسلام کو بحیثیت نظام اور دستور حیات ثابت کرنے پر ہی مرتکز رہیں۔

ایک ہزار سالہ تاریک دور کے بعد قرآن کریم کے الفاظ کو خالص دینی مفہوم میں پیش کرنا‘ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام بہت ژرف نگاہی کا متقاضی ہے۔ کیونکہ سابقہ تمام تفاسیر میں اس بارے میں نہ تو کوئی روشنی ملتی ہے اور نہ ہی کوئی راہنمائی۔ اس بارے میں ایران کے اسلامی انقلاب کے ساتھ بہت امیدیں وتوقعات وابستہ تھیں۔ وہاں کے علماء کرام کا مبلغ علم بھی بہت بلند مرتبہ ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی (Privilege) یہ ہے کہ وہ علماء کرام موجودہ علوم اور مغربی زبانوں سے بھی خوب واقف ہیں اور چونکہ انہوں نے اسلامی انقلاب برپا کرنے میں سخت جدوجہد کرنے کے علاوہ بڑی بڑی قربانیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس لئے ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ وہ علماء کرام بھی دین کے تمکن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں لیکن ان کی دو باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کے وہ تمام الفاظ جو دین کا تصور پیش کرتے ہیں انہوں

نے ان سب کو مذہب کا ہی رنگ دیا ہے۔ ان کی موجودہ دور کی تحریر کردہ تمام تفاسیر سابقہ دور کی تحریر کردہ تفاسیر کا چربہ ہیں۔ انہوں نے سابقہ تفاسیر سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام یا دین کے قیام کے بعد بھی انفرادی پرستش کے قائل ہیں۔ یہ بات خوب ذہن نشین فرمالیں کہ دین کا قیام اور انفرادی پرستش دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یا دین ہوگا یا انفرادی پرستش ہوگی۔ دین کے نظام کے اندر پرستش نہیں ہوسکتی' اس میں تو صرف احکامات خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف ایرانی علماء نے اسلامی حکومت کی اطاعت کو اطاعت خداوندی قرار نہیں دیا۔ تاہم ان کی یہ عملی صورت کہ انہوں نے اسلامی حکومت قائم تو کی ہے' یقیناً قابل ستائش ہے۔ لیکن علمی دنیا میں وہ اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں اسلامی فکر ایک ہزار سال پیشتر کھڑا تھا۔ اور یہ بات واقعاً تعجب کی ہے کہ قرآن سے فکری راہنمائی لئے بغیر انہوں نے اتنا بڑا عظیم انقلاب کیسے برپا کردیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کے فکری انجماد کا سبب قرآن خالص کا سامنے نہ ہونا ہے۔ ان کا فکر احادیث کے Parameter سے باہر ہی نہیں نکلا احادیث (شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے سُنیوں کے صحاح ستہ سے مختلف ہیں) نے ان کے فکر کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ طلوع اسلام چونکہ خالص قرآنی فکر کا داعی ہے' اور فرقہ بندی کے خلاف ہے' اس لئے ہم احتیاطاً ایرانی انقلاب پر تبصرہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسکی خامیاں اور اس کے ناکام ہونے کی وجوہات تحریر کر سکتے ہیں۔ ایرانی علماء کرام کے لئے جو کچھ یہاں تحریر کیا گیا ہے' وہ ان کی تعریف ہی کی گئی ہے۔ البتہ اگر کوئی شیعہ جریدہ ایرانی انقلاب پر تبصرہ کا خواہش مند ہوگا تو اس کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

ان دشواریوں کے باوجود اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے دینی مفاہیم پیش کئے جائیں۔ اس مضمون میں یہ بالکل ابتدائی کوشش ہے۔ صرف ایک Pattern قائم کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے قارئین کرام کو یہ کوشش پسند آئی' تو ان کے حکم کی تعمیل

میں بے شمار الفاظ کا دینی مفہوم پیش خدمت کر دیا جائے گا۔

(2+1) صلوٰۃ و زکوٰۃ: یہ قرآن کریم کی انتہائی اساسی اصطلاحات ہیں۔ یہ قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مرکز و محور ہیں۔قرآن کریم کی ساری فکر ان دونوں اصطلاحات کے گرد گھومتی ہے۔ ان کا مذہبی مفہوم آپ سب حضرات کے سامنے ہے۔ ہر مسلمان ان مذہبی مفاہیم کے مطابق عمل کرر ہا ہے اور ان کا مذہبی مفہوم اس طرح مسلمات کے طور پر چلا آ رہا ہے کہ آج تک کبھی نہ تو ان مفاہیم کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کبھی کسی نے کچھ تحریر کیا ہے۔آپ ایک ہزار سال کا لٹریچر ملاحظہ فرمالیں ان دونوں اصطلاحات کے یہی مفاہیم ہر جگہ ملیں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق صلوٰۃ کے مروجہ مفہوم کو سب سے پہلے محمد احمد بٹلہ نے چیلنج کیا تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پیشتر ہی چند صفحات پر مشتمل کچھ مواد طبع کرایا تھا جو مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔محمد احمد بٹلہ دہلی کی مشہور برادری ''قوم پنجابیان سوداگرن'' سے متعلق تھے۔ وہ مبروص تھے انہوں نے خود اپنے حالات میں تحریر کیا تھا کہ وہ کثیر المال اور کثیر العیال تھے۔ وہ دھاگہ کا بزنس کرتے تھے اور ''گھاٹ مارکہ'' انکا ٹریڈ مارک تھا۔ دہلی میں قطب روڈ کے قریب ان کا بزنس سنٹر تھا۔تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی تشریف لائے تو انہوں نے پھر چند صفحات پر مشتمل کتابچہ یہاں بھی طبع کرایا اور وہ اس کو مفت تقسیم کراتے تھے۔محمد احمد بٹلہ مرحوم کے بعد تقریباً تیس سال تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر اس کے بعد نماز کے متعلق کئی اصحاب نے تحریر کرنا شروع کیا۔اب تک تو اس بارے میں کافی کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن کا علم آپ سب حضراتِ باوقار کو ہو گا۔

نماز کے متعلق تحریر کردہ موجودہ لٹریچر سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ مروجہ نماز کا قرآنی صلوٰۃ سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے اور قرآنی لفظ صلوٰۃ کا مروجہ نماز پر کُلّی اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ (1) اقامت صلوٰۃ کے لئے اپنے ملک میں اقتدار شرط ہے۔مغلوب ومحکوم قوم صلوٰۃ قائم نہیں کرسکتی۔ (2) صلوٰۃ صرف پڑھنے' یا پرستش کی چیز نہیں ہے بلکہ عملاً قائم کرنے کی چیز ہے۔

قرآن کریم کے مطابق مذہب کی بنیاد پرستش پر ہوتی ہے جبکہ دین کا سارا دار و مدار عملاً اطاعت پر ہوتا ہے۔ دین میں انفرادی پرستش کا کوئی تصور نہیں ہوتا لیکن نماز انفرادی پرستش کے زمرہ میں آتی ہے۔ (3) احادیث کی رو سے نماز معراج شریف میں فرض کی گئی ہے۔ جو ہجرت نبوی سے چند ماہ پیشتر ہوا ہے لیکن مکی آیات میں بھی اقامت صلٰوۃ کا حکم موجود ہے' جو معراج شریف سے پیشتر نازل ہوئی ہیں۔ جب نماز معراج میں فرض ہوئی ہے تو ان مکی آیات میں نازل شدہ صلٰوۃ کے احکامات کا کیا مفہوم ہے۔ (4) صلٰوۃ فحشا و منکر سے روکتی ہے جبکہ نماز کے لئے یہ شرط نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے ایک بجے دو پہر کو رشوت لی ہے اور دو بجے نماز پڑھتا ہے' اس کی نماز ہوگئی' خواہ اس کے بعد وہ پھر رشوت لے لے۔ رشوت لینا مبطلاتِ نماز میں کسی فقہ کی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ چنانچہ

نماز عصر پڑھی کاٹ کے سرِ شبیر
حَرم کو لُوٹ کے مغرب کی پھر کہی تکبیر

سرِ شبیر کاٹنے اور حرم کو لوٹنے سے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (5) نظامِ صلٰوۃ میں اپنے اموال اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کر سکتے (القرآن 11/87) لیکن نماز میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

ان پانچ آیاتِ کریمات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ مروجہ نماز صلٰوۃ کا ایک جز و یا حصہ تو ہو سکتا ہے' صلٰوۃ نہیں ہے لیکن یہ کہ پھر صلٰوۃ سے صحیح قرآنی مفہوم کیا ہے' اب تک کے تحریر کردہ موجودہ دور کے لٹریچر سے یہ دوٹوک طور پر واضح نہیں ہوتا۔ ہمارا گزشتہ سابقہ لٹریچر کیونکہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے اس لئے اس سابقہ لٹریچر میں کوئی روشنی یا راہنمائی نہیں ملتی۔ صلٰوۃ کے موضوع پر کام کرنے والے علماء و سکالرز بھی کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کچھ جدید حلقوں میں نماز کے خلاف لٹریچر کی بے حد پذیرائی ہو رہی ہے۔ جس کی

وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ نماز سے قرآنی موعودہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں' اس لئے لوگوں کی رغبت و میلان نماز کی طرف نہیں رہا۔ اس مضمون میں صلوٰۃ کے متعلق جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے وہ صرف میری ذاتی سوچ ہے۔ اس کے تحریر کرنے سے صرف یہ مدعا ہے کہ یہ سوچ آپ کے زیرِ غور آ جائے۔

(2-1) قرآنِ کریم میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے الفاظ جہاں کہیں بھی اکٹھے ساتھ استعمال ہوئے ہیں' تو اس سے مراد اسلامی نظام ہوتا ہے (22/41) جو نظام قرآنِ کریم کے احکامات و حدود نافذ کرتا ہے۔ یہ نظام ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے کہ جس میں سب افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما از خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق صرف مال و دولت و اجناس سے نہیں ہے انسان کی ساری صلاحیتوں سے اس کا تعلق ہے۔ ازواج مطہرات کو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم تھا (33/33) جبکہ ان کے پاس اتنی دولت ہی نہیں تھی کہ علماء کرام کے مقرر کردہ نصاب کی رو سے ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہو۔ سمجھنے کی خاطر اس صلوٰۃ کو آپ صلوٰۃ تمکنہ سے موسوم کر سکتے ہیں۔

دوسری طرح کی صلوٰۃ' صلوٰۃ موقت ہے (4/103 ,5/6) یہ وہ اجتماعات ہیں جو ہماری نماز کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس صلوٰۃ کے اوقات قرآن میں نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی جزئیات قرآن کریم نے مقرر فرمائی ہیں۔ جب قرآن کریم نے خود ان کی جزئیات کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی' تو پھر انکی جزئیات قرآن سے کس طرح نکالی جاسکتی ہیں۔ اس میں زمانہ کے ساتھ ردوبدل ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا: اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (5/8)۔ عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب ہے۔ حضور ﷺ کے دور ہمایوں میں عدل کرنے کے طریقے نہایت آسان تھے۔ مسجد میں ہی نماز کے بعد عدل کر دیا جاتا تھا (5/106)۔ اب عدل کرنے کے طریقے بالکل مختلف ہیں۔ گواہوں کے علاوہ دستاویزات' فوٹو سٹیٹ کاپیز' انگوٹھے کے نشانات' DNA وغیرہ

سے عدل کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔جس طرح اعدلوا کا حکم ہے بالکل اسی طرح اقیموا الصلوٰۃ کا حکم ہے۔ جب عدل کے طریقے برابر بدلتے چلے جار ہے ہیں تو اقیموا الصلوٰۃ میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن یہ تبدیلی صرف اسلامی حکومت‘ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہی کرسکتی ہے۔قرآن کریم کی رو سے صلوٰۃ موقت وہ اجتماعات ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں اسلامی نظام قائم کرنے کی تدابیر زیرغور لائی جاتی ہیں اوران پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔اس میں ہماری بزموں کے درس بھی شامل ہوسکتے ہیں اور جب اسلامی نظام قائم ہوجاتا ہے تو یہ ادارے اس نظام کورواں دواں رکھنے کے کام آتے ہیں۔اگر ہماری موجودہ نماز میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوششیں شامل کردی جائیں تو یہی نماز صلوٰۃ میں منتقل ہوسکتی ہے اور یہ صلوٰۃ موقت قرار پاسکتی ہے (4/103)۔

(3) ذکر کا مذہبی مفہوم درود پڑھنا اور تسبیح پھیرنا ہے۔ذکر کی محفلیں سجائی جاتی ہیں جن میں حق اللہ‘ ھو اللہ‘ قسم کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ دین کی رو سے ذکر خود قرآن کریم ہے (16/44)۔ یہ ذکر اسلامی حکومت کا دستور Constitution ہوتا ہے‘ اسلامی حکومت کے اس دستور پر عمل کرنا اور اس کے تمام احکامات کو ہر وقت پیش نگاہ رکھنا اوران کو عملاً جاری کرنا ذکر ہے۔ طاغوت کے نظام کو اکھیڑ کر نظام خداوندی قائم کرنا ذکر ہے (20/34 ,20/42) اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔

(4) رکوع۔ مذہب میں رکوع نماز کا ایک رکن ہے لیکن دین میں اسلامی حکومت کے احکامات کی عملاً اجتماعی طور پر اطاعت کرنا رکوع ہے۔ وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (2/43)۔(مفہوم) اسلامی نظام قائم کرو جس میں ہر فرد کی نشو ونما کا انتظام کرو‘ اورتم بھی ان میں شامل ہوکر‘ اسی طرح اسلامی حکومت کی اطاعت کرو۔ مومنین اسلامی حکومت قائم کرکے سب کی نشو ونما کا انتظام کرتے ہیں‘ اور ہمیشہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرتے

رہتے ہیں۔ (5/55)۔

(5) **سجدہ۔** مذہب میں نماز کا ایک رکن ہے، لیکن دین میں اسلامی حکومت کے احکامات کی اطاعت سجدہ ہے۔ اور وہ مقامات، جہاں سے اسلامی حکومت کے احکامات جاری ہوں وہ مساجد کہلاتی ہے۔ مساجد وہ عمارات نہیں ہیں کہ جن میں صرف نماز ادا کی جائے بلکہ وہ مقامات اور وہ مراکز ہیں جہاں سے اسلامی احکامات کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔

(6) **عبادت۔** مذہب میں اس سے مراد پرستش ہوتی ہے۔ دین میں اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق ادا کیا جائے، عبادت ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے عبادت اور عام دنیاوی امور میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے لئے نہ کسی الگ مکان یا جگہ ہے اور نہ ہی اس کے اوقات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی حکومت کے احکامات کی اطاعت ہر وقت کی جاسکتی ہے، اور اس کی اطاعت سے ہر وقت عبادت خداوندی ہوتی رہتی ہے۔

(7) **الٰہ۔** مذہب میں اس سے مراد وہ ذات ہے جس کی پرستش کی جائے۔ پرستیدہ کو الٰہ کہا جاتا ہے۔ لیکن دین میں الٰہ کے معنے حاکم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا: **لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَهاً غَيْرِيْ لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِيْنَ** (26/29)۔ اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو الٰہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا، تو یہاں الٰہ کے معنے حاکم کے ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح، **أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ** (25/43)۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنالیا ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: **وَهُوَ الَّذِيْ فِيْ السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِيْ الْأَرْضِ إِلَهٌ** (43/84)۔ وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی حاکم ہے اور پستیوں میں بھی۔ لا الٰہ الا اللہ کے معنے ہی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔

(8) **تقویٰ۔** مذہب میں پرستش کی انتہائی شکل سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، اس کا مفہوم

پرہیزگاری بھی لیا جاتا ہے' جبکہ دین کی رو سے تقویٰ کے معنے اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ سورہ مائدہ میں تقویٰ کے مقابلہ میں عدوان کا لفظ آیا ہے (5/2) عدوان کے معنے ہیں سرکشی لہٰذا تقویٰ کے معنے قانونِ خداوندی کی ہمہ جہت اطاعت ہے۔ دین کی رو سے اسلامی حکومت کی اطاعت تقویٰ ہے۔ پرہیزگاری اور پرستش تقویٰ نہیں ہے' جس قدر اسلامی حکومت کی اطاعت گذاری کی جائے گی' اس درجہ تقویٰ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

(9) **شعائراللہ**۔ مذہب میں' نذر' نیاز' مزادات' تعزیہ' ذوالجناح' شعائراللہ ہیں۔ دین میں اسلامی مملکت کی محسوس علامات اور اس کے ظواہر شعائراللہ ہیں۔ اسلامی مملکت کا جھنڈا' اس کی کرنسی' اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب شعائراللہ ہیں۔ دوسرے ممالک کی حکومتیں' اسلامی مملکت کے ان شعائر کا احترام کریں گی۔ اگر کوئی حکومت اسلامی مملکت کے ان شعائر کی توہین کرے گی' تو یقیناً اسلامی مملکت اس بارے میں ان سے احتجاج کرے گی کیونکہ حکم خداوندی ہے کہ: **لاَ تُحِلُّواْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ**(5/2)۔ شعائراللہ کی بے حرمتی نہ کرو۔

(10) **ولی اللہ**۔ مذہب میں ولی اللہ مجذوب' مختل' مخبوط الحواس' اور بہت ''پہنچے ہوئے'' کو کہتے ہیں لیکن دین میں ولی اللہ وہ ہوتا ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے۔ ولی' عدوٗ کی ضد ہے جس کے معنے دشمن کے ہیں۔ قرآن کریم نے اسلامی نظام کے دشمنوں کو عدو اللہ کہا ہے (60/1, 80/60) لہٰذا اسلامی نظام کے دوست اور اس کے مددگار ولی اللہ ہوں گے۔ قرآن کی رو سے اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ **أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَاء اللّٰهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُوْن** (10/63)۔ آگاہ رہو کہ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف وحزن نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ہر وہ شخص جو ایمان لاتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے' اس آیہ کی رو سے ولی اللہ ہے۔

(11) **استغفار۔** مذہب میں استغفار، دعا درود اور تسبیح پھیرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن دین میں استغفار اسلامی حکومت کے قوانین کی پناہ میں آنا ہوتا ہے۔ یہ حفاظت طلبی اور عفوخواہی خدا اور بندے کے درمیان انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ درمیان میں پڑے اور وہ بحیثیت صدر مملکت، اس کے لئے حفاظت طلب کرے، بشرطیکہ اس کی یہ حفاظت اور عفوخواہی اسلامی حکومت کے قوانین کے مطابق ہو۔اور حکومت کے قوانین میں اس کی عفوخواہی کی گنجائش ہو۔

(12) **تہجد۔** مذہب میں رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنے کو تہجد کہتے ہیں۔تہجد کا لفظ اضداد میں سے ہے۔اس کے معنے سونا اور جاگنا دونوں ہوتے ہیں۔یہ لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ (17/79)۔"اور رات کے ایک حصہ میں قرآن کے ساتھ جاگو۔یہ صرف تیرے لئے ہے۔" دوسری جگہ اسی کو قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً (73/2)۔رات کو قیام کر مگر تھوڑا عرصہ چھوڑ کر۔دن میں حضور ﷺ کو بہت کام ہوتے تھے۔ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحاً طَوِيلاً (73/7)۔اس لئے حضور ﷺ کو حکم تھا کہ وہ رات کو قرآن کریم پر غوروفکر کر کے نظام کے قیام کی تدابیر سوچیں اور دن کو ان تدابیر کو عمل میں لائیں۔قرآنی انقلاب کے اولیں مراحل میں پروگرام اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔تہجد سے مراد رات کی نماز نہیں ہوسکتی۔

(13) **نذر۔** مذہب میں نذر اور نیاز کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔نذر اللہ اور نیازِ حسین عموماً کہا جاتا ہے، نیاز تو فارسی لفظ ہے جس کے معنے محبت کے ہیں۔اللہ نذر سے مراد حلوہ پوری، کچوری وغیرہ پر کچھ دعائیں پڑھ کر خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا ہوتا ہے۔آج کل یہ عموماً Social gathering کے کام بھی آتی ہے۔جبکہ دین میں یہ لفظ واجبات کی ادائیگی کے لئے آتا ہے۔قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں (76/7) میں آیا ہے یعنی وہ امور جو آپنے خود

اپنے پر واجب قرار دے لئے ہوں۔ اگر کسی گاؤں میں بچوں کا سکول نہیں ہے تو اس گاؤں کے لوگ حکومت سے درخواست کریں کہ حکومت ان کے گاؤں میں ایک سکول کھول دے اور گاؤں کے وہ لوگ پچاس فیصد اخراجات اس سکول کے خود برداشت کرلیں گے اور حکومت سے مالی تعاون کریں گے۔ حکومت سے یہ مالی تعاون نذر ہے اور قرآن کریم کی رو سے اس مالی تعاون کو پورا کرنا ضروری ہے۔ دین کی رو سے تعاون کے واجبات ادا کرنا نذر پوری کرنا ہوتی ہے۔ حلوئے پراٹھے کھانا اور علماء کو کھلانا نذر پوری کرنا نہیں ہے۔

(14) **توبہ۔** مذہب میں کسی برے کام کرنے کے بعد اللہ سے دعا مانگنا کہ اللہ ان برے اعمال کی گرفت نہ کرے توبہ ہے۔ دین میں توبہ ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کو Undo کیا جاتا ہے۔ (1) آپ غلط راستے پر چلے گئے معلوم کرنے پر آپ کو احساس ہوا کہ آپ کا راستہ غلط ہے اور درست راستہ دوسری سڑک پر جاتا ہے۔ اب آپ کو اس صحیح راستہ تک جانے کے لئے واپس آنا ہوگا۔ آپ کا غلط راستہ چھوڑ کر' صحیح راستہ پر آ جانا توبہ ہے۔ (2) آپ نے کسی شخص سے بدسلوکی کی اس کی رقم واپس نہیں لوٹائی۔ جب آپ کو اپنے اس غلط کام پر شرمندگی ہوئی تو آپ فوراً اس کی رقم ادا کردیں' اس شرط کے ساتھ کہ آپ آئندہ کبھی' اس کی یا کسی اور شخص کی رقم کو زبردستی نہیں ہتھیا لیں گے۔ تو یہ آپ کی توبہ ہوئی۔ اسلام آباد میں زلزلہ کی وجہ سے جو ٹاور گر گیا تھا۔ اس کے بعد اہالیان علاقہ نے مجموعی طور پر توبہ کی تھی لیکن یہ مذہبی توبہ تھی۔ جن اہالیان علاقہ نے اجتماعی توبہ کی ان کا اس ٹاور کے گرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا' اس توبہ کا تعلق صرف ان Contractor سے تھا جنہوں نے اس ٹاور کی تعمیر میں سستا میٹریل استعمال کیا تھا۔ دینی توبہ یہ ہے کہ اس ٹاور کو تعمیر کرنے والے سخت ندامت محسوس کریں اور آئندہ عمارات کی تعمیر میں درست میٹریل استعمال کریں اور سستے میٹریل کے استعمال سے اجتناب کریں لیکن اگر وہ Contractors اور وہاں کے سارے رہائشی حضرات زبانی توبہ کریں اور توبہ کی تسبیح پھیریں' لیکن عمارات میں میٹریل اسی

طرح کا استعمال کرتے رہیں تو یہ توبہ نہیں ہے۔

(15) **درود شریف** ۔ مذہب میں درود شریف چند الفاظ کو چپکے چپکے یا بلند آواز سے پڑھنا ہوتا ہے۔ عام مذہبی جلسوں خصوصاً مجالس میں مقرر یہ کہتے ہیں کہ ''آویں درود دیاں چھالاں'' جس سے مراد ہوتی ہے کہ مجمع بلند آواز سے درود شریف پڑھے چنانچہ مجمع بلند آواز سے درود پڑھتا ہے۔ مذہبی کتابوں میں اس کے بہت فضائل لکھے ہوئے ہیں۔ میلاد اکبر میں ہے۔

پڑھو درود پڑھو مومنو درود پڑھو
درود سے کبھی غافل نہ ہو درود پڑھو

لیکن دین میں اس کے معنے (1) اللہ اور کائناتی قوتوں کا مومنین کی حوصلہ افزائی کرنا ہے (33/43)۔ خدا کا قانونِ مکافات عمل اور اس کے ملائکہ نبی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' اے مومنو تم بھی نبی کی حوصلہ افزائی کرو اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے وسلمو تسلیماً اس کی اطاعت کرو (33/56)۔ درود کی عملی شکل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔

(16) **صدقہ** ۔ مذہب میں کسی مصیبت کو ٹالنے کے لئے جو رقم خیرات کی جائے' یا جو بکرا ذبح کر دیا جائے وہ صدقہ کہلاتا ہے' لیکن دین میں ہر وہ چیز جو خدا کی راہ میں خرچ کی جائے صدقہ کہلاتی ہے۔ صدقہ واجب نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی خواہش سے دیا جاتا ہے جبکہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اگر کسی اسلامی حکومت کی' کسی ملک سے لڑائی ہو جائے' یا کوئی ارضی وسماوی آفت واقع ہو جائے' تو زکوٰۃ کے علاوہ جو رقوم مملکت کے باشندے' بطور مدد کے اس مملکت کو دیں وہ مد صدقہ کہلاتی ہے۔ لیکن یہ صدقہ اجتماعی طور پر وصول کیا جاتا ہے' اور اجتماعی طور پر ہی خرچ کیا جاتا ہے۔ (9/103, 6/60)۔

(17) **ثواب** ۔ مذہب میں ثواب کے معنے واضح نہیں ہیں۔ مختلف حضرات کے سامنے اس کا مختلف مفہوم ہے۔ مجموعی طور پر تاثر یہ ہے کہ ایسے کام جن کے کرنے سے آخرت کی زندگی اچھی

ہوتی ہے ان کے سرانجام دینے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اس ثواب کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ ثواب صرف آخرت میں کام آتا ہے لیکن دین میں ثواب کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی حکومت کے قوانین کے اتباع سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ اس کا ثواب ہیں۔ قرآن کریم نے قرآنی نظام زندگی کے نتائج کو ثواب الدنیا کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً (28/80)۔ جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد ایسے کام کئے جو انسانی معاشرہ میں ہمواری کا سبب بنیں تو ان کے لئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔ ان نتائج کا نام ثواب الدنیا والآخرۃ ہے۔

(18) **تسبیح**۔ تسبیح پھیرنے سے مراد دانوں پر خدا کا نام پڑھنا ہوتا ہے اس کو تسبیح فاطمہ یا تسبیح زہرا بھی کہتے ہیں۔ چونکہ روایات کے مطابق تسبیح کے اس طریقہ کی تلقین حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ الزہرا علیہا السلام کو کی تھی اس لئے یہ تسبیح ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب ہے۔ جن حضراتِ عالی مقام کو سو دانوں کی تسبیح سے تسلی نہیں ہوتی' اور ''عبادتِ خداوندی'' کے لئے مزید کچھ تشنگی محسوس فرماتے ہیں' وہ ''ہزارا'' استعمال کرتے ہیں' جس میں ایک ہزار دانے ہوتے ہیں۔ لیکن دین میں تسبیح کے معنے سرگرمِ عمل رہنا' اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرنا ہوتے ہیں۔ کائنات میں ہر شئے خدا کی تسبیح کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر شئے اپنے اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے (61/1, 62/1, 59/24) سورج کی صلوٰۃ دھوپ فراہم کرنا' اس دھوپ سے فصل پکانا اور بخارات اٹھانا ہے۔ سورج کا اپنے ان فرائض مفوضہ یعنی صلوٰۃ کو تسلسل سے ادا کرتے رہنا' اس کی تسبیح ہے۔ جب تک سورج اپنی روشنی سے فصل پکا رہا ہے' بخارات اٹھا رہا ہے وہ اپنی تسبیح ''پڑھ'' رہا ہے۔ باقی ہم مسلمانوں میں جو حضرات تسبیح یا ہزارا پڑھتے ہیں' تو ان کے لئے گزارش ہے کہ نزول قرآن کے وقت تو عربوں میں دانوں کی اس تسبیح کا تصور ہی نہیں تھا' تسبیح تو گوتم بدھ کی ایجاد ہے۔ پھر یہ عیسائی راہبوں میں آئی۔ ان سے یہ ایرانیوں

میں آئی۔ان ایرانیوں نے ہی اس کو داخل اسلام کیا۔ ورنہ قرآن میں تو تسبیح پھیرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے قرآن میں تو خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں انتہائی جدوجہد کرنے کا نام تسبیح ہے۔

(19) **شرک۔** مذہب میں بتوں کو پوجنا شرک ہے۔لیکن دین میں یہ قرآن کریم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے۔دین میں اس کے معنے غیر خدائی قوتوں کو خدا کے برابر سمجھنا ہے جو اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں دوسروں کو ان کا حامل سمجھنا شرک ہے۔خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا شرک ہے۔کسی شخص کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص سے اپنی اطاعت کرائے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے احکامات کی اطاعت کرنا شرک ہے۔شرک کرنے سے انسان خود اپنی ذات کو ذلیل کرتا ہے۔قرآن کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اس کا صحیح مقام چھین لیتا ہے (31/13) ' اسلامی نظامِ حکومت میں احکام الٰہی کا سرچشمہ صرف قرآنِ کریم ہوتا ہے۔قرآن کے علاوہ کسی اور قانون کا اضافہ کرنا شرک ہوتا ہے۔

(20) **حدود اللہ۔** مذہب میں حد کسی جرم کی اس سزا کو کہتے ہیں جسے خود قرآن نے متعین کر دیا ہو۔لیکن دین میں قرآن کریم کے تمام اصول وقوانین' احکامات' اوامر ونواہی' سب حدود اللہ ہوتے ہیں یہ حدود غیر متبدل اصول ہیں۔جن کے تابع جزئیات' ہر زمانہ کی اسلامی حکومت' اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق خود مرتب کرے گی۔البتہ یہ اصول غیر متبدل رہیں گے۔

ان بیس الفاظ کے مذہبی و دینی مفاہیم پیش خدمت عالی کئے گئے ہیں۔اگر جناب نے ان کو پسند فرمایا تو اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا اور اس طرح اس دینی مفاہیم کی ایک الگ فہرست تیار ہو جائے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرکِ خفی کا نادانستہ ارتکاب

قرآن کریم کے نزدیک شرک بدترین گناہ اور قبیح ترین جرم ہے۔شرک جلی بہت واضح ہوتا ہے۔ بتوں کو پوجنا شرک جلی ہے اور ہر شخص کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بت پرستی شرک ہے لیکن شرک خفی کی نوعیت ہی مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھیس بدل بدل کر سامنے آتا ہے اور اس کے مرتکب کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے خصوصاً زوال پذیر اقوام اس میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں۔ جب کسی قوم کو زوال آتا ہے تو وہ اپنے بزرگوں' انبیاء و اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں شریک کر لیتی ہے اور یہی شرک ہوتا ہے۔ کسی شخص کو صفات خداوندی سے متصف کرنا شرک ہے۔

جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ بیمار خواہ غریب ہو اور خواہ امیر ہو وہ ڈاکٹر سے ہی رجوع کرے گا۔ڈاکٹر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر' اس مریض کا علاج کرے گا' لیکن ضروری نہیں کہ وہ مریض صحت مند ہو جائے۔ ممکن ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو سکے۔اس ساری حالت میں بیمار ڈاکٹر کے علاج کی طرف ہی توجہ کرتا رہے گا لیکن شفاء کے لئے دعا صرف اللہ تعالیٰ سے کرے گا کوئی مریض ڈاکٹر سے شفاء حاصل کرنے کے لئے دعا نہیں کرے گا اگر کوئی شخص' اللہ کو چھوڑ کر' ڈاکٹر سے شفا حاصل کرنے کی دعا کرے گا تو وہ شرک کا مرتکب ہو گا۔

اسی مثال کے مطابق دیگر تمام معاملات مثلاً تجارت' سفر' مقدمات ان تمام چیزوں میں

ہم دوسروں سے مدد حاصل کرتے ہیں لیکن دعا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی کرتے ہیں۔ انسانوں کا آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا تو نہایت ضروری چیز ہے لیکن وہ مدد جو صرف تصرف الٰہی سے حاصل ہوتی ہے اس کو کسی اور سے چاہنا' خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنا ہے۔

وحی اور عقل میں بھی یہی فرق ہے۔ آپ اپنی مدد کے لئے کسی حکیم' دانا' دانشمند سے مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کسی سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ وہ وحی الٰہی حاصل کر کے آپ کے کسی مسئلہ کا حل وحی کی روشنی میں پیش کرے۔ اسی طرح کسی شخص کا اختیاری اقوال کو وحی قرار دینا' اس کو دوسرا خدا تسلیم کرنا ہے' وحی الٰہی خاص خدائی اختیار و تصرف میں ہوتی ہے۔ وہ کسی بشر کے اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ کسی بشر کے عقلی و اختیاری افعال و اقوال کو وحی کا درجہ دینا' اس کو خدا بنا دینا ہے اور یہ شرک خفی کے مرادف ہے۔ ہمارے علمائے کرام حضور ﷺ کے ذاتی' اختیاری اقوال کو وحی خفی قرار دیتے ہیں تو وہ اسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کہ انبیاء کرامؑ کے اقوال و افعال ذاتی' بشری ہوتے ہیں اور ان سے غلطی و لغزش کا امکان بھی ہوتا ہے' سابقہ مضامین میں کئی مرتبہ کر دی گئی ہے' اسی بارے میں قرآن کریم نے حضرت داؤد و حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بھی اپنی دفتین میں محفوظ فرما دیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کے اقوال بشری و ذاتی ہوتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں میں غلطی بھی کر سکتے تھے۔ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام دونوں رسول اور نبی تھے۔ دونوں نے ایک ہی مقدمہ کا فیصلہ مختلف دیا جس سے از خود واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نبی کا فیصلہ درست تھا اور دوسرے کا غلط تھا۔ آپ اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وداؤد وسلیمٰن اذ یحکمٰن فی الحرث از نفشت فیہ غنم القوم و کنا لحکمھم شھدین ففھمنا ھا سلیمان و کلا اتینا

حکما و علما (۹/۲۱)۔

اور داؤد و سلیمان جبکہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں جب لوگوں کی بھیڑیں اس پر رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھنے والے تھے۔ تو ہم نے اسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا۔

اس مقدمے کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمائی ہے کہ:

''حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آ گھسیں۔ کھیتی کا نقصان ہوا۔ حضرت داؤد نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا یہ فیصلہ کیا بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ میرے نزدیک کھیتی والا بکریاں اپنے پاس رکھے اور دودھ پیئے اور بکریوں والے کھیت کی آبپاشی اور تردد کریں جب کھیتی جیسی تھی ویسی ہو جائے تو بکریاں لوٹا دیں اور کھیتی لے لیں اس میں دونوں کا نقصان نہ ہوگا۔ حضرت داؤد نے بھی یہ فیصلہ سن کر تحسین فرمائی اور اپنے اجتہاد سے رجوع کیا''۔ (صفحہ ۴۳۷)

تفسیر فصل الخطاب میں ہے کہ:

''جناب داؤد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں مالک کو دے دی جائیں مگر ان کے فرزند جناب سلیمان نے کہا کہ انصاف کی رو سے فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ بھیڑوں کے مالک زراعت کو دوبارہ درست کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت

پر آئے اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ ان بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آ جائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے۔ یہی فیصلہ تھا جسے خالقِ کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔''

اس آیہ کریمہ کے ذیل میں مقدمہ کی جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں وہ تمام تفاسیر میں تقریباً کچھ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک جیسی ہی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم نے ان تفاصیل میں سے کسی بات کا کوئی ذکر نہیں کیا' کیونکہ اس کا مقصد تو ایک اصول بیان کرنا تھا' اس کو مقدمہ کی تفاصیل سے کوئی غرض نہیں تھی۔

قرآن کریم سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کے ریوڑ نے کسی کھیت کو رات کے وقت چر لیا۔ وہ شکایت لے کر حضرت داؤد کے پاس آئے۔ حضرت داؤد نے اس کا فیصلہ فرما دیا۔ لیکن وہ فیصلہ کسی وجہ سے' یا تو انہیں غور کرنے کے لئے وقت کم ملا یا انہیں معاملہ کی پوری تفاصیل حاصل نہیں ہو سکیں۔ وہ معاملہ کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکے اور فیصلہ غلط فرما دیا لیکن حضرت سلیمان نے اس کا فیصلہ صحیح فرما دیا۔ یہ سوال کہ پدر گرامی نے کیا فیصلہ کیا' اور فرزند نے کیا فیصلہ کیا خارج از بحث ہے اور مفسرین نے اس معاملہ کی جزئیات فراہم کرنے میں صرف وقت ضائع کیا ہے۔ اس مضمون میں صرف اس قدر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ دونوں حضرات نبی تھے اور دونوں کا فیصلہ ایک دوسرے کے خلاف تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء کرام جو فیصلے مقدمات کے کرتے تھے وہ وحی پر نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ان کے غور و فکر اور تدبر و تفحص کا نتیجہ ہوتے تھے۔ وحی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور اسی وجہ سے ان میں صحت و سقم دونوں صورتوں کا امکان ہوتا تھا۔ انبیاء کرام کے ذاتی' بشری اقوال کو وحی کا درجہ دینے سے ان کو خدائی کا درجہ دینا ہوتا ہے۔ جو شرک خفی کے مرادف ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وجود باری تعالیٰ کے دلائل

میرے محترم جناب عبدالصمد صاحب نے لندن سے ای میل پر اطلاع دی کہ جب وہ اپنے بیٹے کو کہتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ تو ان کا بیٹا یہ اعتراض کرتا ہے کہ کائنات کو تو خدا نے پیدا کیا' لیکن خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے' اس سلسلے میں وہ وجودِ باری تعالیٰ کے دلائل کے خواہشمند ہیں۔

قبل اس سے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے عبدالصمد صاحب کے صاحبزادہ کے اعتراض کے متعلق عرض ہے کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصود جواب حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ محض مخاطب کو لاجواب کرنا اور الجھانا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب صدر اسلام کے بعد بحث مباحثوں کا دور شروع ہوا' تو اس میں اسی طرح کے لاطائل سوالات کئے جاتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے' کیا اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات سے باہر نکال سکتا ہے' کیا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا پتھر بنا سکتا ہے کہ خود بھی اس کو نہ اٹھا سکے۔ اس نوعیت کے بے شمار سوالات ہمارے علمِ الکلام کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ جن کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا اور یہ محض Mental Gymnas tic ہی ہے۔ اسی قسم کا سوال جناب عبدالصمد صاحب کے صاحبزادے کا ہے۔ اس کا علمی جواب تو بعد میں آتا ہے سرِ دست صرف الزامی جواب پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو ایک نہ ایک چیز کو خود وجود میں آنا تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو لوگ کائنات کا از خود پیدا ہونا تسلیم کرتے ہیں وہ

وجودِ باری کے منکر ہیں لیکن جب آپ کائنات کے لئے یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ وہ از خود پیدا ہوسکتی ہے اور Life خود بخود وجود میں آ گئی، تو آپ یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ خدا خود وجود میں آ گیا۔ خدا کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ ذات جو خود وجود میں آ جائے۔ اب اس کے علمی جواب کی طرف آتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود تو ہر مذہب کے پیرو تسلیم کرتے ہیں۔ مذہب کا تو سارا دار و مدار ہی اللہ تعالیٰ کے وجود سے وابستہ ہے۔ اس لئے وجودِ باری تعالیٰ کے دلائل مہیا کرنا صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ سارے مذاہب نے اس بارے میں دلائل فراہم کئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ پر ایسے مسکت دلائل جو انسان کو بالکل مطمئن کر دیں عقل کے بس کی چیز نہیں ہے کیونکہ اعتراض بھی عقل ہی کرتی ہے۔ عقل کے اعتراضات کا مداوا عقل سے نہیں ہوسکتا۔ عموماً جس قدر بھی دلائل اس بارے میں دیئے گئے ہیں وہ محرک اول یا علت العلل پر جا کر منتہیٰ و منتج ہوجاتے ہیں اور اسی پر آ کر ان کی تان ٹوٹتی ہے۔ ہمارے ہاں مسلمانوں نے عقلی دلائل کو نا کافی گردانا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی شریف میں لکھا کہ:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود
گر بہ استدلال کارے دین بُدے
فخرِ رازی راز دار دین بُدے

عقل کی اس خامی اور کمزوری کی وجہ سے مسلمان مفکرین نے تصوف کی راہ اختیار کی۔ ہمارے صوفیائے کرام کا یہی خیال ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے عقلی دلائل کافی و حتمی نہیں ہوتے اور معرفت باری تعالیٰ صرف طریقت کے راستے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ شریعت کے بس کا کام ہی نہیں ہے لیکن اس میں دقت اور خامی یہ ہے کہ جو مشاہدات Religious Experiments

صوفی کو حاصل ہوتے ہیں، وہ ان مشاہدات میں دوسروں کو شریک نہیں کرسکتا اور یہ ؎

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی

کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ان کے نزدیک کائنات کی ہر شے میں وجود باری تعالیٰ کی دلیل موجود ہوتی ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید
وحدہٗ لا شریک می گوید

لیکن یہ صورت معرفت الٰہی حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

یورپ جب ازمنہ مظلمہ Dark Ages سے نکلا تو ان کے ہاں بھی وجودِ باری تعالیٰ پر سوچ بچار کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے ہاں زیادہ پریشانی یہ ہوئی کہ ان کی مذہبی کتابیں توریت و انجیل عقل کا بالکل ساتھ ہی نہیں دے رہی تھیں، ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد عقلِ انسانی ان کو وحی الٰہی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اس دور کی پیشوائیت Ecclesiatical order علم سے تہی ہونے کے علاوہ سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی بہت پست معیار پر تھی، اور نہایت تنگ نظر اور متعصب تھی، جس نے مذہب کی گرفت اس قدر سخت کر دی تھی کہ غور و فکر کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں کے مفکرین مذہب کے بالکل خلاف ہو گئے لیکن ان آزاد خیال مفکرین کی کمزوری یہ تھی کہ وہ وجودِ باری تعالیٰ سے انکار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی پرورش ہی ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی کہ وہ وجودِ باری تعالیٰ سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی راہ Deism میں نکالی۔ اس تحریک کا نظریہ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کو تو مانتے تھے، لیکن وحی کے منکر تھے۔ اس زمانے کے مفکرین نے اس تحریک میں پناہ لی۔ اگر کسی صاحب کو اس تحریک سے متعلق مزید معلومات درکار ہوں تو وہ Google پر جا کر Deism تلاش کر لیں۔ ان کے لئے ایک نئی دنیا وا ہوگی اور بہت تفصیل سے اس تحریک کا تعارف مل جائے

گا اوراس کے پیروؤں کی فہرست بھی معلوم ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ اس دور میں کچھ مفکرین اپنے آپ کو Agonistic یعنی ''لاادریہ'' کہتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حضرات نہ خدا کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار۔ مشہور فلسفی مفکر برٹرینڈ رسل Agnonistic تھا۔ وہ ایک مرتبہ جب امریکہ گئے تو وہاں کے جوان پروفیسروں نے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں یا نہیں تو انہوں نے یہی کہا کہ میں Agnonistic ہوں' خدا کا انکار تو نہیں کرتا' لیکن اس کو مانتا بھی نہیں کیونکہ اس کے لئے Sufficient Evidence نہیں ہے'انہوں نے یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔

ہمارے نزدیک وجودِ حضرتِ باری تعالیٰ ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر قرآن کریم کو وحی الٰہی ثابت کر دیا جائے تو وجودِ باری تعالیٰ ازخود ثابت ہو جاتا ہے اور یہ نسبتاً آسان راستہ ہے۔ اگر کسی نے ضد ہی اختیار کر لی ہو تو یہ دوسری بات ہے ورنہ قرآنِ کریم کو وحی الٰہی ثابت کرنا قطعاً کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ گذشتہ زمانہ میں جب علومِ انسانی کو اس درجہ ترقی نہیں ہوئی تھی' اس وقت قرآن کا وحی الٰہی ثابت کرنا' اس درجہ آسان نہیں تھا' جس درجہ آج آسان ہے۔ یہ تو سامع وقاری کے مبلغ علم پر منحصر ہے۔ سامع یا خوانندہ کا مبلغ علم جس درجہ اعلیٰ ہو گا' اسی قدر اس کے سامنے قرآن کو وحی ثابت کرنا آسان ہو گا۔ میرا ایک مختصر سا مضمون 'اعجاز القرآن' طبع ہوا تھا جس میں قرآن کریم کو وحی الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کا Response بھی بہت اچھا آیا تھا اگر کسی صاحب کو قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل مطلوب ہوں تو ان کے حکم پر ان دلائل کو پیش کر دیا جائے گا کیونکہ اس مضمون کا یہ موضوع نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت کا دوسرا طریقہ قرآن کریم کے نظام کو عملاً جاری کرنے سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ طریقہ چونکہ فکری ونظری نہیں ہے بلکہ عملی ہے اس لئے اس سے بہتر ثبوت اور

کوئی نہیں ہوسکتا۔ علمی وفکری ثبوت صرف چند لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں، لیکن ایسا عملی ثبوت جو سب کے سامنے عملاً موجود ہو وہ ہر شخص کو متاثر کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے نظام کے کچھ نتائج برآمد ہونے کے دعاوی کئے ہیں۔ اگر اس نظام کے وہ دعاوی برآمد ہو جائیں تو اس نظام کے منجانب اللہ ہونے کا اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ اس نظام کے ذریعے ہر شخص کو رزق ملے گا (6/151, 11/6) اگر اس نظام میں ہر شخص کو رزق مل جائے تو یہ نظام یقیناً منجانب اللہ ہے۔ قرآن کریم نے وعدہ فرمایا کہ اگر تم اس نظام کو جاری کرو گے تو تمہیں غلبہ حاصل ہو گا۔ (3/149, 58/21, 3/141, 24/35) قرآنِ کریم نے فرمایا کہ تم اس نظام پر عمل کرنے سے ایک ایسی امت بن جاؤ گے کہ تم تمام انسانیت کے نگران ہو گے اور تمہارا مرکزی نظام تمہاری نگرانی کرے گا 2/143 اس نظام پر عمل کرنے کی وجہ سے تم وہ قوم ہو گے جو اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گی 28/22، یہ چند وعدے جو تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار وعدے قرآنِ کریم نے فرمائے ہیں۔ اگر وہ تمام وعدے اس نظام کے ذریعے پورے ہونے لگیں تو یہ نظام یقیناً منجانب اللہ ہو گا اور اس سے وجودِ باری تعالیٰ از خود ثابت ہو گا اور یہ نظام خود اپنی زبان سے آپ کو جناب باری تعالیٰ کے وجود کی شہادت دے گا اور اس نظام کی ہر شق اپنی زبان سے پکار رہی ہو گی:

و فی کُلِّ شئیٍ لَہ‘ آیۃ‘
یَدُلُ علی اَنَّہ‘ واحد

(مفہوم) (نظامِ خداوندی کی) ہر ہر شق میں اللہ کے وجود کی نشانی موجود ہے، اور اس کا نظام ہی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ واحد ہے۔

قرآنی نظام کے علاوہ وجود جنابِ باری تعالیٰ کے ثبوت کے لئے جس قدر دلائل ہیں وہ سب نظری وفکری ہیں، جو دلائل اس درجہ مستحکم نہیں ہیں جو عملی طور پر نظام کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اقرار سے ایک حقیقت ثابتہ کا اقرار ہوتا ہے اور اس کے انکار سے ایک حقیقت کا بطلان ہوتا ہے۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے سے یا نہ ماننے سے فائدہ یا نقصان کیا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے ماننے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ماننے والا وحی کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ Deist حضرات کو اللہ تعالیٰ کے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود وحی کو نہیں مانتے۔ ہمارے صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ اور وحی کو مانتے ہیں لیکن وہ وحی کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کے قائل ہیں اور اپنے دعوے کے مطابق انہوں نے علم حاصل کیا بھی۔ہم سب جمہور مسلمان اللہ تعالیٰ کو ماننے کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کے بھی قائل ہیں اور اس وحی پر انفرادی طور پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔مذہب میں وحی کی اطاعت انفرادی طور پر ہوتی ہے۔اس لئے اس کے نتائج سامنے نہیں آتے۔ مذہب کی سطح تک، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو، وحی اخلاقیات تک ساتھ دیتی ہے۔ کیونکہ وحی کے بغیر اخلاقیات کی کوئی بنیاد قائم نہیں ہوسکتی اگرچہ مذہب کی سطح تک وحی اس کام آجاتی ہے لیکن وحی سے جو بھرپور فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ صرف دین کی سطح پر ہوتے ہیں، دین کی سطح پر اس وحی کے اجتماعی اتباع کے نتائج بھی سامنے آجاتے ہیں، اور اس سطح پر وحی پر عمل بھی اجتماعی طور پر نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ دین میں وحی دنیاوی اور دینی دونوں مقاصد حاصل کرتی ہے۔وحی کے اتباع کا یہ نتیجہ کہ اس دنیا میں غلبہ واقتدار حاصل ہوجائے وحی کے اتباع کا یہ نتیجہ کہ رزق فراوانی سے مہیا ہو جائے، اتباعِ وحی کے یہ سارے نتائج یہ دنیاوی مقاصد کا حصول دین میں حاصل ہوتا ہے۔ مذہب میں نہیں ہوتا۔ جوں جوں وحی کے اتباع کے دعاوی پورے

ہوتے جائیں گے، وجودِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کے دلائل از خود مہیا ہوتے جائیں گے۔

صاف آئے گی نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ، آئینۂ فطرت کے سِوا

وآخردعوانا ان الحمدلله رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زکوٰۃ کی ادائیگی کا مسئلہ

میرے ایک محترم عزیز جو بہت بڑے انڈسٹریلیسٹ (Industrialist) اور تاجر ہیں، اور اللہ و رسول کی اطاعت کے دل سے پابند ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کی خطیر رقم ادا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں چند سوالات کئے ہیں۔ موجودہ دور میں زکوٰۃ کس کو دیں تاکہ حکمِ خداوندی کی تعمیل ہو جائے۔ یہ سوال چونکہ اکثر حضرات کو پریشاں کئے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں چند گذارشات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

صلوٰۃ وزکوٰۃ اسلامی نظام کی دو بنیادی اصطلاحیں ہیں اور آپس میں اس درجہ مربوط اور لازم وملزوم ہیں کہ ان میں سے ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور ان دونوں ارکان پر اسلامی نظام کے قائم ہوئے بغیر کسی طرح بھی عمل نہیں کیا جاسکتا چونکہ یہ بیان کردہ بات عام مسلمانوں کے عمل کے خلاف ہے اس لئے ہر شخص اس بات کو سن کر متعجب وحیران ہو جاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اس بارے میں سورہ حج کی اکتالیسویں آیہ کریمہ حجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ اہم ہے، اور قطعاً نامانوس ہے، اسی لئے اس آیہ کریمہ کے مستند تراجم پیش کئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کا التباس واشتباہ نہ رہے۔ پہلے آیہ کریمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۲۲/۴۱)۔ اب اس آیہ کریمہ کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) قدیم ترین اور مستند ترین ترجمہ جو تحت اللفظ بھی ہے اس میں ارشاد ہے۔

''وہ کہ اگر ہم ان کو مقدور دیں ملک میں' کھڑی کریں نماز اور دیں زکوٰۃ۔'' (ترجمہ شاہ عبدالقادر)۔

(۲) حضرت اقدس جناب شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ ہے:

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ۔''

(۳) معروف شیعہ ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب کا ہے' اس میں ارشاد ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دیں تو وہ (بھی) یہ لوگ پابندی سے نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔''

چونکہ آیت کے ترجمہ سے مسلمانوں کے عمل کی تصویب نہیں ہوتی' اس لئے مترجمین اس ترجمہ میں قوسین میں اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہیں۔ اس ترجمہ میں بھی لفظ بھی اور پابندی مترجم کا ذاتی اصافہ ہے ترجمہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اپنے فکر و نظریہ کی تصویب کی خاطر ان دو لفظوں یعنی بھی اور پابندی کا اضافہ کیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی اقتدار کا Pre-requis te ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری' مشہور اہل حدیث عالم و معروف مناظر نے ترجمہ کیا ہے:

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو حکومت دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں گے۔''

ترجمہ اس درجہ واضح ہے اور اقامتہ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کے لئے حکومت کو اس درجہ شرط قرار دیا ہے کہ مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی نہیں چھوڑی۔

(۵) مشہور تفسیر ''تدبر قرآن'' میں ارشاد ہے:

''اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔''

خط کشیدہ الفاظ 'اگر اور تو' کس طرح اقتدار کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے لئے شرط قرار دے رہے ہیں۔

(۶) انگریزی معروف ترجمہ Pickthall کا ہے۔ اس میں درج ہے:

"Those who, if we give them power in the land, establish worship and pay the poor-due."

(۷) ایران سے طبع شدہ ترجمہ میں ہے:

''آکسانیکہ اگر اقتدار دھیم ایشانرا در زمین برپاد ارند نماز را و بدہند زکوٰۃ را۔''

(۸) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فتح الرحمٰن میں یہ ترجمہ درج کیا ہے:

''آناں را کہ اگر دست رس دھیم ایشانرا در زمین برپا دارند نماز را و بدہند زکوٰۃ را۔''

(۹) اس کی تفسیر میں ملا واعظ کاشفی تفسیر حسینی میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر جائے دہیم ایشانرا در زمین و دستگاہ و اختیار پابند بپائی دارند نماز را۔ بجیت تعظیم من و بدہند زکوٰۃ مال را بجیت مساعدت بندگان من۔''

(۱۰) تفسیر ابن کثیر میں مرقوم ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری

پابندی سے نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں۔"

(۱۱) تفسیر جلالین درسی کتاب ہے۔ علمائے کرام جب اپنے درس میں قرآنِ کریم کا ترجمہ یا تفسیر کرتے ہیں تو اس سے ہی مدد لیتے ہیں۔ اس میں ملاحظہ فرمائیں کہ وہ ترجمہ کے علاوہ کس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ اقتدار ان دونوں ارکان کی ادائیگی کے لئے کس درجہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دیں (دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرکے) تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔"

اس کے بعد جو تحریر ہے اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان مکنا میں جو شرط تھا اقاموا الصلوٰۃ اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے"۔

یہاں آپ غور فرمائیں کہ جلالین شریف نے بات کس قدر واضح کر دی ہے کہ تمکن فی الارض یعنی اقتدار شرط ہے اور اس شرط کا جواب اقامتہ الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ مناطقہ کا مشہور اصول ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط. اگر شرط پوری نہ ہو تو مشروط ساقط ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر اقتدار حاصل نہ ہو تو اقامتہ الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ ممکن نہیں ہے۔

آپ کے سامنے گیارہ مستند ترین اور معتبر ترین تراجم پیش خدمت کئے گئے ہیں۔ یہ تراجم اس درجہ واضح اور حتمی ہیں کہ ہمارے علمائے کرام اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔ اس ترجمہ کے آگے وہ اس قدر مجبور ہیں کہ اس سے انکار ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہوگئی کہ جس ملک میں مسلمان مغلوب ومحکوم ہیں وہاں وہ زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ، یورپ، امریکہ کے مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جہاں مسلمان حاکم ہیں اس بارے میں عرض ہے (اگرچہ قرآن کی رو سے تو آزادی

کے معنے یہ ہیں کہ اس ملک میں حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو)۔

(۱) قرآن کریم نے طاغوت میں زندگی بسر کرنے کوحرام قرار دیا ہے۔ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ (۴/۶۰)۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کوحکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کردیں۔ اس آیہ کریمہ نے طاغوت کو خود Define کردیا ہے کہ ہر وہ ملک جس میں فیصلے وحکومت اللہ کے قانون سے سرکش باغی کی ہو اس معاشرہ میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ اس معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے اللہ سے باغی اور اللہ کے مجرم ہیں (۶/۱۲۳)۔ مجرموں' سرکشوں اور خدا کے باغیوں کو زکوۃ دینے سے کیا تعلق۔

(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جو قانون خداوندی کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر' فاسق و ظالم ہیں۔ (۵/۴۴' ۵/۴۵' ۵/۴۷) ان میں عدالتی وعائلی فیصلوں کے ساتھ ساتھ معاشی فیصلے بھی شامل ہیں۔ اگر کسی ملک کا معاشی نظام' اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام کے خلاف ہے' تو اس ملک کے رہنے والے ظالم' فاسق وکافر ہیں۔ اس نظام میں زکوۃ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۳) ہمارے اس دور میں ساری دنیا میں' ہر طرف اور ہر جگہ سودی نظام جاری ہے۔ پاکستان میں بھی ہماری معیشت سود یعنی ربوٰ پر قائم ہے۔ سودی منافع میں سے زکوۃ کس طرح ادا کی جاسکتی ہے۔

(۴) قرآن کریم نے ملکیت زمین کو ناجائز قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ صرف ملکیت زمین حرام تھی بلکہ اس کی خرید وفروخت بھی حرام تھی۔ بلکہ حدیث میں تو مکابرہ بھی حرام ہے' لیکن امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں امام محمد اور امام ابو یوسف نے' ملوکیت کے زیر اثر ملکیت زمین جائز قرار دے دی۔ چونکہ امام ابو یوسف اپنے دور میں قاضی القضاۃ تھے' اس لئے ان کا فتویٰ ساری مملکت میں جاری ہو گیا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں فیوڈل سسٹم جاری ہے۔ جاگیرداری اور زمین

داری کی آمدنی ناجائز ہے۔ حرام آمدنی سے زکوٰۃ ادا کرنی جائز نہیں ہے۔

قرآن کریم کی رو سے زکوٰۃ کا نہ تو کوئی نصاب ہے اور نہ ہی اس کے مصارف کا بیان ہے۔ ہمارے علمائے کرام زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن کریم میں بیان کردہ بتاتے ہیں وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں ہیں بلکہ وہ صدقات کے مصارف ہیں۔ قرآنِ کریم کے مطابق اسلامی حکومت کے کل Revenues جن کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے خرچ کیا جائے زکوٰۃ ہیں' اس نشوونما میں جسمانی اور انسانی زندگی دونوں کی نشوونما شامل ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس آیہ کریمہ میں کی گئی جبکہ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ مومنین وہ ہیں جو نوع انسانی کی نشوونما کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آیہ کریمہ میں دینے یا عطا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے ہمارے علماء کرام نے بھی اس کا ترجمہ ''اور جو زکوٰۃ کیا کرتے ہیں'' کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زکوٰۃ کوئی صرف Coin میں دینے کی ہی چیز نہیں ہے۔ ہمارے علماء کا یہ تسامح ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کو صرف روپوں اور Coins میں حصر کر دیا ہے۔ ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: وَآتِيْنَ الزَّكَاةَ (۳۳/۳۳)۔ اور (اے ازواج نبی) زکوٰۃ دیا کرو' ظاہر ہے کہ ازواجِ مطہرات کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی کہ ان پر زکوٰۃ کے موجودہ نصاب کے مطابق زکوٰۃ فرض ہوتی۔ انہیں یہی حکم تھا کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اور جو کچھ علم و تربیت انہیں خود حضورﷺ سے حاصل ہوا' اس کو بروئے کار لا کر معاشرہ کے افراد کی تربیت و نشوونما کر۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (۲/۱۷۷)۔ (اصل نیکی اس کی ہے جو) اس کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں اور غلام آزاد کرانے میں صرف کرے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: وَاَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ایتائے زکوٰۃ مال و دولت دینے کے علاوہ بھی

کچھ ہے اور دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ایتائے زکوٰۃ صرف نظام صلوٰۃ میں ہی ہوسکتی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پیشتر ایک واقعہ محض حکایتہً تحریر کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث (Recter) شیخ الکل فی الکل' جناب قاری طیب صاحب وقتاً فوقتاً لاہور تشریف لاتے تھے۔ ان کی ذات خود صفات اعلیٰ کی حامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ مولانا نانوتوی کے نبیرہ تھے۔ اس وجہ سے لاہور میں ان کا بڑا استقبال ہوتا تھا۔ ہفتہ وار چٹان نے سرورق پر ان کی تصویر شائع کی اور اس تصویر کے نیچے علامہ اقبالؒ کا مشہور مصرعہ تحریر کیا ''قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن''۔ اس سے زیادہ ان کی تعریف ممکن نہیں تھی۔ قاری صاحب کی آمد پر ظاہر ہے کہ ان کی چند تقاریر بھی ہوتی تھیں' ایک تقریر میں قاری صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے تین دانت مصنوعی لگے ہوئے تھے۔ ان مصنوعی دانتوں کو' اصلی دانتوں سے پیوستہ کرنے کے لئے Dentist نے ایک سونے کا تار لگایا ہوا تھا۔ اس سونے کے تار کی وجہ سے وہ دانت حضرت کے دہن مبارک میں ٹکے ہوتے تھے۔ حضرت اقدس اپنی سالانہ آمدنی میں سے زکوٰۃ ادا فرماتے تھے تو دانتوں میں پیوستہ سونے کے اس تار کی زکوٰۃ بھی ادا فرماتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت کو یہ تردد رہتا تھا کہ چونکہ اس تار کا اصل وزن معلوم نہیں تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اس تار کی زکوٰۃ پوری ادا نہ ہو رہی ہو۔ تقریر کے دوران قاری طیب صاحب کے اس بیان پر مولانا تھانوی صاحب کے لئے تعریف و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں اور چند ضعیف العمر حضرات آبدیدہ بھی ہوگئے۔

حضرت تھانوی نے بے شمار کتب تحریر فرمائی ہیں جو بار بار طبع ہوئی ہیں۔ آپ ان ساری کتب کو خوردبین لگا کر مطالعہ فرمائیں' کہیں ایک لفظ طاغوت کے خلاف یا اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد پر نہیں ملے گا۔ اس کو کہتے ہیں اونٹ کو نگل جانا اور مچھر کو چھان کر پینا۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مملکتِ مدینہ

ہمارے ہاں انبیاء کرام (علیہم السلام) کا تصور ایک بہت بڑے صوفی یا ایک بہت بڑے پیر جیسا پیش کیا جاتا ہے۔ جو خود بھی عبادت میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں اور اپنے متبعین کو بھی عبادت کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود بھی وظائف و اوراد میں مشغول رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اس میں مصروف رکھتے تھے چنانچہ اسی تصور کے پیش نظر حضور ﷺ کے لئے بتایا جاتا ہے کہ حضور ﷺ بھی قبل از نبوت کئی کئی دن غار حرا میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے حالانکہ عبادت کے لئے کسی ملک، کسی مقام کی کوئی شرط نہیں ہے۔ عبادت ہر ملک اور ہر معاشرہ میں ہوسکتی ہے، مختلف اقوام و مذاہب میں عبادت ہر ملک اور ہر معاشرہ میں ہوسکتی ہے، مختلف اقوام و مذاہب میں عبادت کے مختلف رسم و رواج ہوتے ہیں، لیکن عبادت کرنے میں ایک کا دوسرے سے کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ مسلمان ہندوستان اور امریکہ میں عبادت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی، مسلم ممالک میں عبادت کر سکتے ہیں۔ عبادت کی آزادی ہر جگہ ہوتی ہے۔ البتہ دین کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دین کی آزادی یہ ہے کہ اس معاشرہ میں قرآن کریم کا نظام بحیثیت مجموعی نافذ ہوتا ہے۔ اصل ٹکراؤ اور تصادم دین کے نظام سے ہوتا ہے۔ دین کی آزادی کے لئے کوئی قوم تیار نہیں ہوسکتی۔

حضور ﷺ اپنے ساتھ دین لائے اور ساری عمر اسی دین کی دعوت حضور ﷺ نے دی۔

دین کی دعوت اور اس کی اشاعت و توسیع کی وجہ سے مکہ میں ٹکراؤ، تصادم ہوا۔ مکہ کی فضا اور وہاں کا ماحول دین کے قیام کے لئے مساعد نہیں تھا لیکن چونکہ انبیاء کرام کے لئے دین کا قیام اور اس کا استقلال ضروری اور لازم ہوتا ہے، اس لئے حضور ﷺ نے حکم خداوندی کے ماتحت وہاں سے ہجرت فرمائی (17:1) اور مدینہ منورہ کو اپنی مملکت کا مرکز قرار دیا۔ چونکہ ہمارے تمام مورخین ''مذہب'' کے پیرو تھے، اور ان کے سامنے دین کا واضح تصور نہیں تھا، اس لئے انہوں نے حضور ﷺ کی سیرت بھی ایک ''مذہب'' کے داعی کے طور پر تصنیف کی ہے۔ مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے تصنیف نہیں کی البتہ قرآنِ کریم نے جو معلومات مدینہ کی مملکت کے متعلق فراہم کی ہیں، اس مضمون میں ان نے استفادہ کیا جائے گا۔

حضور ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی تو مدینہ میں بروز جمعہ 12 ربیع الاول 1 ہجری مطابق 27 ستمبر 622 عیسوی کو بنونجار کے یہاں حضرت ابوایوب انصاری کے مکان کے سامنے قیام فرمایا۔ پھر آپ چندروز میں ہی حضرت ابوایوب کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

اس کے بعد حضور ﷺ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ آپ نے مسجد کی تعمیر شروع کی۔ اس زمین کے مالک دو یتیم بچے تھے۔ آپ نے یہ زمین ان سے قیمتاً خرید فرمائی اور اس کی تعمیر میں خود بنفس نفیس حصہ لیا اور اینٹ پتھر ڈھونے میں شریک رہے۔ مسجد کی تعمیر کی جلدی اور اس کی اہمیت یہ تھی کہ یہ مسجد آج کل کی ہماری مساجد جیسی نہیں تھی۔ یہ ایک مرکز تھا جہاں سے اس نوزائیدہ ریاست کا سارا نظام چلایا جاتا تھا۔ یہاں سے ہی مسلمان قرآنی تعلیمات اور ہدایات کا درس حاصل کرتے تھے۔ مختلف اطراف میں جو وفود بھیجے جاتے تھے، وہ یہاں سے ہی روانہ کئے جاتے تھے۔ اس کی حیثیت ایک پارلیمنٹ جیسی تھی، اس میں مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ چونکہ عربوں میں قبائلی عصبیت بہت تھی۔ اس لئے حضور ﷺ نے فوری طور پر مواخاۃ کا سلسلہ جاری کیا۔ حضرت انس بن مالک کے مکان میں مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی

چارہ کرایا گیا۔کل نوے (90) آدمی تھے۔آدھے مہاجرین اور آدھے انصار۔حضرت ابوبکرؓ کو خارجہ بن زید کا۔حضرت عمرؓ کو عتبان بن مالک کا۔عبدالرحمٰن بن عوف کو سعد بن الربیع کا۔زبیر بن العوام کو سلمہ بن سلامہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کا۔حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا۔ان تمام ناموں کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔بھائی چارے کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوں گے۔مواخاۃ کے چند دنوں کے بعد حضورﷺ نے مواخاۃ ہی کی طرح مسلمانوں میں ایک عام عہد و پیمان کرایا جس کے ذریعے ساری جاہلی کشاکش اور قبائلی کشمکش کی بنیاد ہی ڈھا دی اور دورِ جاہلیت کے رسم و رواج کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔یہ تمام تدابیر اسلامی حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے کی جارہی تھیں۔اس عہد و پیمان کی پندرہ (15) شقیں تھیں۔مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر صرف چند شقیں تحریر کی جارہی ہیں۔

(1) اللہ کا ذمہ (عہد) ایک ہوگا۔ایک معمولی آدمی کا دیا ہوا ذمہ سارے مسلمانوں پر لاگو ہوگا۔

(2) مسلمانوں کے درمیان جو بھی اختلاف رونما ہوگا' اسے اللہ عزوجل اور محمد رسول اللہﷺ کی طرف پلٹا جائے گا۔

(3) سارے راست باز مسلمان اس شخص کے خلاف ہوں گے جو ان پر زیادتی کرے گا یا اہلِ ایمان کے درمیان ظلم' گناہ اور زیادتی اور فساد کا جو یا ہوگا۔

(4) حضورﷺ نے جب ہجرت کے بعد مسلمانوں کے درمیان ایک قرآنی نظام کی وحدت کے ذریعۓ ایک نئی اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈال دی' تو اس کے بعد غیر مسلموں کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔اب آپ کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ ساری انسانیت امن و سلامتی کی سعادتوں اور برکات سے فائدہ اٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ مدینہ اور اس کے اطراف کا علاقہ ایک مرکز کے ماتحت آ کر'

ایک وفاقی وحدت میں منظّم ہو جائے' آپ نے رواداری اور کشادہ دلی کے ایسے قوانین نافذ کئے' جن کا اس سے پہلے کوئی تصور نہیں تھا۔

مدینے میں سب سے قریب تر لوگ یہود تھے۔ اگر چہ یہ درپردہ مسلمانوں کے دشمن تھے۔ لیکن اب تک انہوں نے کوئی جھگڑا یا تنازعہ نہیں کیا تھا مملکت کی ضروریات کی وجہ سے آپ نے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں انہیں مذہب اور جان و مال کی مطلق آزادی دی گئی تھی۔ معاہدہ کا عنوان تھا۔

ھٰذا کتاب من محمد (صلعم) بین المومنین والسلمین من قریش و یثرب ومن تبعھم فلحق به وجاھد معھم۔

(ترجمہ) یہ تحریر ہے محمد (صلعم) کی قریش و یثرب کے مومنین و مسلمین اور ان لوگوں کے بارے میں جو ان کے اتباع ہیں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔

(1) ان المومنین بعضھم موالی بعض من دون الناس۔ سب مومنین ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں۔

(2) مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

(3) کوئی آدمی اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہیں ٹھہرے گا۔

(4) قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(5) اس معاہدے کے فریقوں میں کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا اندیشہ ہو' اس کا فیصلہ اللہ اور محمد الرسول اللہ فرمائیں گے۔

اس معاہدے کی باقی شقیں ملا کر یہ معاہدہ تیرہ (13) ' نکات پر مشتمل تھا۔ جس کی

تفصیل سیرتِ ابن ہشام میں دی گئی ہے۔

اس معاہدے کے طے ہو جانے کے بعد مدینہ اور اس کے اطراف ایک وفاقی حکومت بن گئی جس کا دارالحکومت مدینہ تھا' اور جس کے سربراہ خود رسول اللہ ﷺ تھے اور جس میں قرآن کریم کے احکام نافذ ہو رہے تھے۔ امن و سلامتی کے اس دائرہ کو زیادہ وسعت دینے کے لئے حضور ﷺ نے کچھ عرصہ بعد دوسرے قبائل سے بھی حالات کے مطابق اسی طرح کے معاہدات کئے جن کے حوالے سیرت کی کتب میں موجود ہیں۔

سیاسی مدبرین نے حکومت کی یہ تعریف کی ہے کہ حکومت وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے فرماں روا اور رعایا کے درمیان ایک واسطہ کا نام ہے۔ یہ واسطہ حکومت کا لازمی عنصر ہے۔ اگر یہ واسطہ نہ رہے تو حکومت ختم ہو جاتی ہے۔ حکومت کی یہ تعریف (Def inition) اسلامی اور غیر اسلامی سب حکومتوں پر صادق آتی ہے لیکن اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومتوں سے ممیّز ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت مسلمانوں کی وہ جماعت ہوتی ہے جو قانونی استحقاق کی بنا پر قرآنی احکام کو نافذ کرتی ہے۔ اس تعریف کی اساس پر جو حکومت قرآنی قوانین کا نفاذ نہ کرے بلکہ انسانوں کے اپنے وضع کردہ قوانین جاری کرے وہ اسلامی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ناقص خیال میں اسلامی حکومت وہ حکومت ہوتی ہے جو قرآن کریم کے احکامات کو نافذ کرتی ہے اور چونکہ وہ اللہ کے عطا کردہ قوانین نافذ کرتی ہے اس لئے اس کی اطاعت' اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ ہمارے مسلم سیاسی مفکرین اور فقہائے کرام نے بھی ہزاروں ہزار کتابیں اسلامی قوانین و فقہ کے بارے میں تصنیف کی ہیں لیکن ان سب کی تعریف مذہب کی رو سے کی گئی ہے کیونکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے طویل عرصہ میں کسی فقہ یا سیاسی مفکر نے بھی اسلامی حکومت کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار نہیں دیا ہے' اور یہ سب حضرات انفرادی پرستش کے ذریعے ہی عبادت الٰہی کرتے آ رہے ہیں' خوب اچھی طرح واضح رہے کہ انفرادی پرستش اور اسلامی حکومت ایک دوسرے کی نقیض ہیں' اس لئے ان سب فقہاء

کی تعریف، قرآن کی رو سے درست نہیں ہے۔ یہ تو صرف تحریک طلوع اسلام کو اس کا شرف حاصل ہوا ہے کہ اس کے پیش نظر ہمیشہ حکومت کی قرآنی تعریف ہی رہی ہے۔ چونکہ حکومت کا قیام انبیاء کرام کے مشن کی اساس ہوتا تھا، اس لئے حضورﷺ نے بھی مدینہ میں پاؤں جمانے اور یہود سے معاہدے کرنے کے بعد، اسلامی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مدینہ میں عدالتیں قائم کر دی گئیں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَن تُؤَدُّوا الاَمَانَاتِ اِلَی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُم بَیْنَ النَّاسِ اَن تَحْکُمُوا بِالْعَدْلِ (4:58)۔

بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اسی سورۃ مائدہ میں وصیت کے معاملات ومسائل کو حل کرنے کے لئے عدالتوں کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا 5:106۔ سورہ نور میں جرم زنا کے مرتکب کے بارے میں سزا مقرر فرما کر، حکم دیا کہ عدالت زانی کو سزا دلوائے اور اس سزا میں کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے اور یہ سزا لوگوں کی موجودگی میں دی جائے (24:2)۔ یہ تمام عدالتیں مدینہ میں قائم ہوگئی تھیں جن میں حضورﷺ خود فیصلے فرماتے تھے (5:48-49)۔ قرآن کریم نے تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا کہ اپنے مقدمات کے فیصلے صرف رسول اللہ سے کرائیں اور جو کوئی بھی اپنے فیصلے حضورﷺ سے نہ کرائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا (4:65)- اور چونکہ مملکت کی حدود برابر وسیع ہوتی جارہی تھیں، اس لئے حضورﷺ نے اپنے مقامی حکام (موجودہ اصطلاح کے مطابق، تحصیلدار، ڈپٹی کمشنر، گورنر وغیرہ) تمام اہم مقامات پر مقرر فرما دیئے اور قرآن نے واضح حکم دیا کہ ان مقامی حکام کی اطاعت ایسی ہی اطاعت تھی، جیسے رسول اللہ کی اپنی اطاعت تھی (4:83) قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبویہ میں بھی یہ حکم واضح کر دیا گیا ہے جبکہ حضورﷺ نے فرمایا کہ: ومن یطیع الامیر فقد

اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی (بخاری،مشکوٰۃ)۔ترجمہ،جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی،اس نے میری اطاعت کی۔اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔اس طرح دس لاکھ مربع میل پر وسیع وعریض مملکت کا انتظام حضور نے اپنے مقامی حکام کے ذریعے کرایا۔چونکہ عام مسلمانوں اور خود حضورﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا(3:159, 42:38)اس لئے مدینہ میں خود اور مدینہ سے باہر کے حکام کے لئے مجالس مشاورت قائم کی گئیں۔

اس مختصر سے مضمون کا مقصد صرف مذہب کے اس تصور کا بطلان کرنا ہے جس کی رو سے حضورﷺ ایک صوفی یا پیر کی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں کہ جو رات اور دن صرف نماز،روزہ اور تکبیر و تحلیل میں مصروف رہتے تھے اور غار حرا میں کافی عرصہ گذارتے تھے۔قرآن کے مطابق یہ بات درست نہیں ہوسکتی۔حضورﷺ نے خود اپنے دور میں حکومت قائم فرمائی تھی۔اس مملکت کی بنیاد ان مستقل اقدار پر تھی جو صفات خداوندی کا دوسرا نام ہیں اور اس مملکت میں ان صفات نے ایک محسوس شکل اختیار کرلی تھی،جس کے عملی نمونے سارے صحابہ کرامؓ تھے۔اس مملکت میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما ہوئی کہ ان کا ہر فرد اصحابی کالنجوم کا مصداق قرار پایا۔افسوس کہ یہ مملکت بہت مختصر عرصہ قائم رہی اور بہت جلد منقرض ہوگئی۔یہ مملکت اتنی جلدی کیوں منقرض ہوگئی،اس کی وجہ اب ملاحظہ فرمائیں۔

اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ حضورﷺ کا یہ قائم کردہ نظام صرف حضورﷺ کے دور تک کے لئے محدود نہیں تھا بلکہ اس کو آگے جاری رہنا تھا۔حضورﷺ نے اس نظام کو اپنے صحابہؓ کی مدد سے،اپنی عقلی اور انتظامی بصیرت اور صلاحیت کے زور پر اتنے کم عرصہ میں قائم فرمادیا تھا۔اس میں حضورﷺ اور صحابہؓ کی ان تھک کوششیں شامل تھیں۔اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کی اس کوشش کو سراہا ہے اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحاً طَوِیۡلاً (73:7)۔(ترجمہ)دن میں تو

تمہارے پاس اور بہت بڑے بڑے کام ہیں۔ اس لئے رات کو قرآن کریم پر غور و خوض کر کے سکیمیں تیار کرو (17:79) اور دن میں ان کو Implement کرو۔ یہود و دیگر قبائل سے جو معاہدات کئے تھے وہ اپنی عقلی و انتظامی صلاحیت کی رو سے کئے تھے۔ حضورﷺ نے جو احکامات اپنی حکومت کو چلانے کے لئے جاری فرمائے تھے وہ ان کے اپنے وقت کے لئے تھے۔ وہ نظام و حکومت تو دائمی و سرمدی تھی لیکن اس میں Law & Order قائم کرنے کے جو احکامات حضورﷺ جاری کر رہے تھے۔ ان کی اطاعت' رسول اللہﷺ کی اطاعت تھی' لیکن وہ احکامات' حضورﷺ کے اپنے جاری کردہ احکامات صرف اپنے دور کے لئے تھے اور آنے والے ادوار کے لئے نمونہ تھے۔ ہماری پیشوائیت کی یہ ایک بڑی تباہ کن لغزش ہے کہ انہوں نے رسول اللہﷺ کی عقلی' انتظامی اطاعت کو وحی قرار دے کر' عقلی اطاعت اور انتظامی فرمانبرداری کو کوئی قدر نہیں کی اور اس سے بالکل صرف نظر کر لیا۔ ان حضرات کے نزدیک رسول اللہ کی عقلی و انتظامی اطاعت نہ فرض ہے نہ واجب۔ لہٰذا یہ اطاعت جو آپ کے بعد آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہونی تھی' اس کا پتہ ہی کٹ گیا اور اس طرح اسلامی نظام کا تصور بالکل محو ہو گیا۔

ہمارے علماء کرام نے رسول اللہﷺ کی اس انتظامی و عقلی اطات کو بھی ان کی عقلی اطاعت کے بجائے' وحی کی اطاعت قرار دے دیا۔ ان کا خیال ہے کہ حکومت چلانے میں رسول اللہﷺ اپنی عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ اس حکومت کا انتظام وحی کے ذریعے کرتے تھے۔ جو معاہدات حضورﷺ نے یہوداور دیگر قبائل سے فرمائے۔ ان معاہدات کے الفاظ ان کے اپنے نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ الفاظ بھی وحی کے ہوتے تھے۔ میرے مطاع و محترم استاد جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب مرحوم سرخیل علماء و سرتاج مفسرین تھے۔ وہ جامعہ اشرفیہ لاہور' میں مدتوں شیخ الحدیث رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی معروف و مقبول کتاب 'حجیتِ حدیث' میں تحریر فرمایا ہے۔ ''جس طرح ٹیلیفون خود نہیں بولتا بولنے والا پس پردہ کوئی اور ہوتا ہے' اسی طرح نبی کی زبان

سے جو نکلتا ہے۔ وہ درحقیقت اللہ کی آواز ہوتی ہے'' صفحہ 39 ' اپنی تائید میں انہوں نے مولانا روم کا یہ شعر بھی تحریر کر دیا۔

گفتۂ او گُفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم غیر اللہ بود

اس مشہور شعر کا ترجمہ ان ہی کی تحریر میں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کی گفتگو اللہ کی گفتگو ہوتی (ہے۔ راقم) اگرچہ بظاہر وہ اللہ کے بندے (نبی کریم) کی زبانِ مبارک سے ہو رہی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں مولانا روم کے بعد اس بارے میں کسی اور کا حوالہ دینے کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح یہ حضرات حضورﷺ کے ہر قول و فعل کو وحی قرار دے کر' حضورﷺ کی اطاعت کو' حضورﷺ کے بعد' حضورﷺ کے خلفاء کی بجائے' کتبِ احادیث کی طرف منتقل کر دیتے ہیں کہ حدیث کی کتابوں کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام اور ہماری قابل احترام مذہبی پیشوائیت کا بنیادی اختلاف ہی یہ ہے کہ تحریک طلوع اسلام رسول اللہﷺ کے انتظامی امور کو عقلی امور قرار دے کر' رسول اللہﷺ کی اطاعت کو خلفاء کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام رسول اللہﷺ کے افعال کو وحی قرار دے کر رسول اللہﷺ کی اطاعت کو احادیث کی کتابوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اور کتابوں کی اطاعت کے لئے کسی نظام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ یہ اطاعت مذہب کا رنگ اختیار کر کے' صرف پرستش کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ اور صرف یہی بات مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب ہے۔

خوب یاد رکھیں اور خوب دل نشین فرمالیں کہ جب تک ہم رسول اللہﷺ کی عقلی و انتظامی اطاعت کو خلفاء کی طرف منتقل کر کے' نظام قائم نہیں کریں گے۔ کبھی تباہی سے نہیں نکل سکتے۔

مضمون اندازہ سے زیادہ طویل ہو گیا۔ یہ بات کہ قرآن کی رو سے یہ اطاعت حدیثوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی، کسی دوسرے مضمون میں پیش خدمت عالی کر دی جائے گی۔ قرآن کی رو سے اطاعت کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا لازمی ہے۔ اطاعت کے لغوی معنے ہی زندہ اتھارٹی کی اطاعت ہے۔ اور اس اطاعت کے لئے سماعت بھی لازمی ہے۔ آیات اگلے کسی مضمون میں پیش کی جائیں گی۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالمی فقہ کی تجویز

اخبارات کی اطلاع کے مطابق' انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی' اسلام آباد کے شعبہ اسلامی ریسرچ انسٹیٹیوٹ (I.R.I) کے زیر اہتمام اسلامی فقہ کے متعلق ایک تین روزہ سیمینار یکم اگست 2009ء سے منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے بہترین دانشوروں اور علماء کرام نے شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر فتح محمد ملک صاحب نے کہا کہ اس سیمینار میں علامہ اقبال کے فقہی تصورات کی وضاحت کر دینی چاہیئے۔ ڈاکٹر قاسم زماں صاحب جو Princeton یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں انہوں نے فرمایا کہ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ گذشتہ صدیوں میں ہندوستان کے علماء نے اجتہاد جاری رکھا اور اسلامی فقہ پر بڑا عمدہ لٹریچر فراہم کیا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری' مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور علامہ اقبال کے کام کا تذکرہ کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اجتہاد کے بارے میں ہندوستان کے علماء نے عرب ممالک کے علماء سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا۔ معروف دانشور اور عالم جناب محمود غازی صاحب نے فرمایا کہ اب حنفی و جعفری فقہ کا دور ختم ہو گیا ہے اور اب ہمیں ایک عالمی فقہ وضع کرنا ہو گا۔ مختصر یہ کہ اس سیمینار میں تمام علماء اور دانشور حضرات نے صرف مولویانہ مذہبی نظریات و خیالات ہی پیش فرمائے ہیں۔ دین کا کوئی تصور ان حضرات کے سامنے نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک اور خاص طور پر ترکی اور پاکستان ایک طویل

عرصہ سے اسلامی قوانین یا دوسرے الفاظ میں فقہ و شریعت کی تدوین کے بارے میں بے حد اضطراب میں مبتلا ہیں۔ اگر آپ علامہ اقبال کے خطبات اور ان کے خطوط' خصوصاً بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ اس وقت کی ضرورتوں سے کس حد تک آگاہ تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے ہم عصر اہل قرآن عالم خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری' فقہ اسلامی میں تحقیقی کام کریں اور قرآن کریم جو اپنے کمال اور خود مکتفی ہونے کا مدعی ہے' اس کو فقہی دلائل سے ثابت کر کے دکھا دیں۔ انہوں نے خاص طور پر عدل کے مسئلہ پر خواجہ صاحب سے راہنمائی بھی حاصل کی تھی' کیونکہ انہیں اس مسئلہ میں بہت تردد تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے دور تک تو سابقہ تدوین کردہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لیکن اب وہ دور بھی گذر چکا ہے۔ جیسا کہ معروف سکالر محمود غازی صاحب نے اپنی تقریر میں نشاندہی فرمائی ہے اب سابقہ تدوین کردہ حنفی و جعفری فقہ کا دور گذر چکا ہے ان کے الفاظ میں اب Cosmopolitan یعنی عالمی فقہ بنانا ضروری ہے' جس پر ساری دنیا میں عمل کیا جا سکے۔ تحریک طلوع اسلام تو عرصہ دراز سے یہ کہتی چلی آ رہی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پیشتر کا وضع کردہ فقہ بالکل بے جان اور بنجر ہے۔ اس میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا (اس کا ثبوت آگے آتا ہے) اس کے وضع کرنے کا طریقہ بھی قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے' لہٰذا یہی بہتر ہوگا کہ اس فقہ کی حد درجہ تعظیم و تکریم کر کے' اس سے سبکدوشی حاصل کر لی جائے۔ کیونکہ جب تک یہ لاشیں ہم اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھریں گے' اس وقت تک نہ قرآن پر عمل کر سکیں گے اور نہ دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکیں گے۔

ہمارے فقہاء کرام نے' تدوین فقہ کے سلسلہ میں بڑی کاوشیں کی ہیں۔ فقہ و اصول فقہ کے بارے میں ہزاروں کتب تصنیف کی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے' ہم مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے اس علم کی تدوین و ترویج کے لئے بہت کام کیا ہے۔ مغرب میں اصول فقہ کو

Jurispriudence اورفقہ کو Law کہتے ہیں اور اصول فقہ کے ماہر کو Jurist اور فقہ کے ماہر کو Lawyer کہتے ہیں۔ مغربی مفکرین اور قانونی ماہرین نے بھی وقت و حالات کے ساتھ ساتھ قانون وضع کئے۔ ہم مسلمانوں میں قانون سازی بہت عرصہ پیشتر شروع ہوگئی تھی جبکہ مغرب میں بہت عرصہ بعد یہ شروع ہوئی ہے لیکن مغربی مفکرین کی دانشوری و فطانت کے باوجود وہاں آج تک قانون کی کوئی جامع تعریف نہیں ہوسکی کیونکہ ان کے ہاں قانون کی کوئی اساس محکم ہی نہیں ہے ان کے ہاں متواتر رواج (Tradition) اور عدالتوں کے فیصلے ہی قانون کے ماخذ ہیں۔ مغربی قانون میں سند اور آخری اتھارٹی کا مسئلہ نہ اب تک طے ہوا ہے اور نہ ہی یہ طے ہوسکتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں وحی الٰہی قانون کا ماخذ ہے ہمارے ہاں تو قانون کی تعریف بہت آسان اور واضح ہے کہ اللہ کا دیا ہوا حکم جسے اسلامی حکومت نافذ کرتی ہے اور جس کی اطاعت سے عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ وہ قانون کہلاتا ہے۔

ہمارے فقہاء کرام کی تمام محنتوں اور کاوشوں کے باوجود ہمارے فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس موجودہ دور میں ناممکن العمل بھی ہے اور غیر مکمل بھی ہے۔ وہ اس دور کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس فقہ کی بنیادی خامی اور نقص یہ ہے کہ یہ مذہب کی رو سے انفرادی طور پر تدوین کیا گیا ہے اس کا دور سے بھی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دینی نظام میں Fit in ہو ہی نہیں سکتا۔ چونکہ یہ مذہبی رو سے لکھا گیا ہے اس لئے اس کے چند نمایاں نقائص پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(1) چونکہ قرآن کریم کی رو سے دین کا خالص تصور یہ ہے کہ عبادات و معاملات میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ہر معاملہ کی اطاعت ہی عبادتِ الٰہی ہے۔ ہر دنیاوی کام جو وحی کی رو سے طے کر دیا جائے وہ دینی بن جاتا ہے اور اس کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کے ثبوت میں کہ عبادات و معاملات کی تقسیم غیر قرآنی ہے۔ صرف چند آیات پیش خدمت عالی کی

جاتی ہیں۔

1- الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِیْ الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَاَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ (22:41)-

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دے دیں تو یہ لوگ نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے منع کریں گے اور ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔

آیۂ کریمہ میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ہر معاملہ کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق طے کرنا، ان پانچ امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے علمائے کرام ان میں سے پہلے دو یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو تو عبادت خداوندی گردانتے ہیں اور باقی تین امور، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تمام امور کے فیصلے وحی کے مطابق کرنے کو عبادت کے بجائے معاملات میں شمار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم نے ان پانچوں امور کو صرف ایک صف میں رکھا ہے، اور زمین پر اقتدار حاصل ہونے پر منحصر قرار دیا ہے اور ان پانچوں امور کو عبادت قرار دے کر عبادات ومعاملات کی تفریق ختم کردی ہے۔

2- ارشاد ہوتا ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (2:83)-

لوگوں کے ساتھ نرمی سے باتیں کرو۔ اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔

اس آیت کریمہ میں لوگوں کے ساتھ نرمی سے باتیں کرنے کو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ہم پلہ قرار دیا ہے اور تینوں امور ایک ہی درجہ میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت ہے تو یقیناً لوگوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا بھی عبادت ہے۔

3- فَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (22:78)-

نماز پڑھا کرو' زکوٰۃ دیتے رہو اور خدا (کے احکام) کو مضبوطی سے پکڑو' وہی تمہارا سرپرست ہے' اور کیا اچھا مددگار ہے۔

یہاں اعتصام باللہ سے مراد تمام مفسرین نے قرآن کے احکامات پر عمل کرنے کو قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کے تمام احکام پر عمل کرنا' ان کی اطاعت کرنا' اسی طرح عبادت خداوندی ہے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت ہے۔

اس سلسلہ میں مزید متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں' چونکہ مضمون طویل ہوجائے گا' اس لئے ان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(2) ہمارے فقہ کی دوسری خامی جس کی وجہ ہمارے فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف چلا جاتا ہے' اس کے غلط مصادر و ماخذ (Sources) ہیں۔ اس مروجہ فقہ کے ماخذ ادلہ اربع' یعنی قرآن' حدیث' قیاس و اجماع ہیں۔ جبکہ قرآن کریم کے مطابق قانون کا ماخذ صرف قرآن ہونا چاہئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ...... الظَّالِمُونَ ...... الْفَاسِقُونَ (5:44, 5:45, 5:47)- جو ما انزل اللہ یعنی قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر' ظالم اور فاسق ہے۔ نیز سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42:10)- جس بات میں بھی تمہارا اختلاف ہو' اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ۔ ان چار آیات کریمات' اور اسی قبیل کی مزید متعدد آیات کریمات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی سخت تاکید ہے کہ عدل و انصاف کا سارا مدار صرف قرآنِ کریم پر ہے۔ قانون سازی کا مصدر و ماخذ صرف قرآن ہے اور جو کوئی بھی اس کے علاوہ کوئی اور مصدر اس میں شامل کرے گا' وہ کافر' ظالم اور فاسق ہوگا۔ لیکن ہمارے موجودہ مروجہ فقہ کا ماخذ صرف قرآن نہیں ہے بلکہ روایات' قیاس اور اجماع بھی اس کے ماخذ ہیں۔ قرآن کی رو

سے منزل من اللہ میں کسی چیز کا اضافہ کرنے کے بعد فیصلہ کرنے والا اپنے آپ کو کافر' ظالم اور فاسق کے زمرہ میں شامل کر دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کا تو واضح اعلان ہے کہ جو بھی منزل من اللہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا وہ کافر' ظالم اور فاسق ہے۔

(3) تیسری خامی اس فقہ کی یہ ہے کہ یہ پرائیویٹ اور پبلک لاءز میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ یہ تقسیم سیکولر حکومتوں میں ہوتی ہے' جہاں پبلک لاء تو سیکولر قوانین پر مبنی ہوتا ہے' اور پرسنل لاء' کو مذہب کی روسے وضع کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت میں ایسی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

ہمارے قدامت پرست علماء کرام ہمارے اس فقہ کو کافی سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مسلمان ممالک ان قوانین کو نافذ کر دیں لیکن جو روشن خیال سکالرز اور دانشمند حضرات ہیں ان کا خیال ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے اور اس فقہ میں ہی اجتہاد کرنا چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ تو بالکل بے جان ہے' اس میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ قوانین بنوعباس کے دور کی غیر اسلامی حکومتوں کے وضع کردہ ہیں' جن کا مناسب ترین نام فقہ' ملوکیت' قوانین سلطانیہ ہونا چاہئے۔ ان میں اجتہاد کیسے ہو سکتا ہے' یہ تو سارا فقہ ہی ملوکیت' جو کہ خود قطعاً حرام ہے' اس کے سائے میں پروان چڑھا ہے اور اس وجہ سے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے' اس کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہیں۔ جس قانون کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہوں' اس میں اجتہاد کا کیا مقام ہو سکتا ہے' اس فقہ میں اجتہاد کرنے' اور اس کو جاری کرنے کا لازمی نتیجہ بادشاہی اور ملوکیت دوبارہ اپنے سروں پر مسلط کرنا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارا موجودہ فقہ بنوعباس کے اس دور میں وضع کیا گیا تھا جب کہ معاشرتی حالات ہی بالکل مختلف تھے۔ جبکہ موجودہ دور کے معاشرتی حالات' اس وقت کے معاشرتی حالات سے بالکل الگ ہیں۔ لہٰذا اس دور کے قوانین اس موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتے' اس دور میں ہمارے معاشرتی رشتے بدلے' پیداوار کے طریقے بدلے' سماجی قدریں تبدیل

ہوئیں، رسم و رواج بدلے، رہن سہن کے طریقے بدلے، سوچنے سمجھنے کا انداز بدلا، نئی ٹیکنالوجی بے شمار ایجادات اپنے ساتھ لائی، ٹی۔وی، فرج، ایئر کنڈیشنڈ، کاریں، ہوائی جہاز، ریلوے، ان سب چیزوں نے پوری زندگی بدل کے رکھ دی۔ ان بے شمار تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فقہ و اصول فقہ کا دارومدار حکومت کی ساخت اور اس کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ اگر حکومت غیر اسلامی ہے، اس میں سابقہ دور کے انفرادی طور پر وضع کردہ قوانین جاری کئے جا سکتے ہیں، لیکن ان قوانین کا اجراء دین میں نہیں ہو سکتا، اس نکتہ کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اِلٰہ کا لفظ حاکم کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

1- وَهُوَ الَّذِیْ فِیْ السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَفِیْ الْأَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)-

کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں وہی حاکم ہے۔

2- اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ (25:43)-

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا حاکم بنا لیا۔

3- قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهاً غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (36:29)-

تو (فرعون نے) کہا کہ اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوا تو تجھے قید کر دوں گا۔

4- سورۂ قصص کی آخری آیات میں الہ کے لفظ کو خود Define کر دیا کہ اس کے معنے حاکم کے ہیں جبکہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً آخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُکْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (28:88)-

"اور اللہ کے سوا اور کوئی دوسرا حاکم نہ پکار، کسی کی بندگی نہیں سوائے اس

کے، ہر چیز کو فنا ہے مگر اس کا منہ، اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔"

آیت کریمہ نے وضاحت فرمادی کہ جس کا حکم ہوتا ہے، وہی الٰہ ہوتا ہے، اِلٰہ کا معنی حاکم ثابت ہونے کے بعد آپ ملاحظہ فرمائیں کہ تمام انبیاء کرام کی مشترک تعلیم یہ تھی کہ:

(1) وَاِلَى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوداً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (11:50)-اور عاد کی طرف ہم نے اس کے بھائی ھودؑ کو بھیجا، بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی، کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے۔

(2) وَاِلَى ثَمُودَ اَخَاهُمْ صَالِحاً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (11:61)-

اور ثمود کی طرف بھیجا اس کے بھائی صالح کو، بولا، اے قوم بندگی کرو اللہ کی، کوئی حاکم نہیں اس کا سوائے اس کے۔

(3) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحاً اِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (23:23)-

ہم نے بھیجا نوحؑ کو اس کی قوم کے پاس، تو اس نے کہا اے قوم بندگی کرو اللہ کی، تمہارا کوئی حاکم نہیں سوائے اس کے۔

(4) فَاَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولاً مِنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (23:32)-

پھر بھیجا ہم نے ایک رسول ان میں، اس نے کہا کہ بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں حاکم تمہارا سوائے اس کے۔

اس منشا وفحوی کی اور بھی متعدد آیات ہیں صرف ان پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ آیات نمبر

11:50, 11:61, 23:23, 23:32 ان تمام مقامات پر حضرت شیخ الہند اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے الہ کا ترجمہ حاکم ہی کیا ہے۔ ان تمام آیات میں اس بات پر اصرار ہے کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی حاکم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ حاکم کی عبادت اس کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت ہے۔ حاکم اور محکوم کا تعلق ہی حکم بجا لانے سے بنتا ہے۔ حاکم اور محکوم کا تعلق اس کی محکومیت سے قائم ہوتا ہے۔ اس کی محکومیت اختیار کرنا ہی اس کی عبادت ہے۔ ان مبارک اور نورانی آیات سے عبادت کا معنیٰ محکومیت خوب واضح ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیم یہ تھی کہ صرف اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور غیر خدائی حکومتوں میں زندگی بسر نہ کرو، ان کی تعلیم کا نچوڑ ہی غیر اسلامی حکومتوں سے اجتناب کرنا ہے اور قرآنی حکومت میں زندگی بسر کرنا ہے اور اس حکومت کی اطاعت کرنا ہی عبادت خداوندی ہے۔

الہ اور عبادت کے الفاظ کی تشریح کے بعد یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے۔ عبادت کے لئے زاویوں اور گوشوں میں بیٹھ کر پرستش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسلامی حکومت کے فیصلوں کی اطاعت ہی عبادت ہے اور اسلامی حکومت کے قوانین اور اس کے فیصلے اس حکومت کی شریعت اور اس کا فقہ ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں جو عرض کیا گیا تھا کہ گذشتہ دور کا بنایا ہوا فقہ، موجودہ دور کا ساتھ نہیں دیتا تو اس سے یہی مراد تھی کہ موجودہ دور کی اسلامی حکومت میں جن امور کے فیصلے درکار ہوں گے، وہ مسائل بنوعباس کے دور کی فقہ کو درپیش ہی نہیں تھے۔ موجودہ دور کی اسلامی حکومت میں بہت سے ایسے شعبہ اور محکمہ ہوں گے کہ ان محکموں کے احکام کی اطاعت عبادت ہوگی لیکن وہ محکمے بنوعباس کے دور میں تھے۔ اس فقہ میں ان محکموں کی ہدایت حاصل کرنے کا کوئی سراغ نہیں مل سکتا۔

جب ہماری حنفی و جعفری فقہ مدون ہوئی، اس زمانہ میں بینک نہیں تھے۔ اس لئے فقہ کی مشہور ترین کتابوں، ہدایہ، الاحکام فی اصول احکام، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، وغیرہ میں کسی

جگہ بینک کے قوانین نہیں دیئے گئے۔ اس شعبہ فقہ کی رو سے کوئی اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ قدامت پرست علماء کو تو آپ چھوڑ ہی دیں' جو لوگ فقہ میں اجتہاد کے قائل ہیں وہ مملکت کے تمام شعبوں کو فقہ میں شامل ہی نہیں کرتے۔ لیکن دین کی رو سے مملکت کا ایک ایک شعبہ اور ایک ایک محکمہ مملکت کے ماتحت ہوگا۔ اس لئے ان کے تمام قوانین اسلامی حکومت بنائے گی اور وہی اس کی شریعت اور فقہ ہوں گی۔ بینک کا سٹاف ان قوانین کے مطابق بینک چلائے گا' اور ان قوانین کی اطاعت عبادت ہوگی۔ ایسے قوانین وضع ہوں گے کہ رقوم Write-off نہ ہوسکیں۔ اگر کوئی شخص اپنی رقم Write-off کرائے گا' وہ اسلامی شریعت کی خلاف ورزی کرے گا اور معصیت خداوندی کا مرتکب ہوگا۔

(2) پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا بنو عباس کے دور میں نہیں تھا۔ اس زمانہ کے فقہ میں اجتہاد کرکے' ان کے لئے قوانین نہیں بن سکتے' ظاہر ہے کہ ان کے لئے بالکل نئے قوانین وضع ہوں گے۔ یہ اس حکومت کا فقہ ہوگا۔ اخبارات کے مدیران اور مختلف چینلز کے اینکرز' اس فقہ اور اس شریعت کی اطاعت کریں گے' اور یہی ان کی عبادت ہوگی۔

اسی طرح سٹیٹ بینک' الیکشن کمیشن' امپورٹ' ایکسپورٹ' پی۔ آئی۔ اے' ریلوے واپڈا' سیکریٹریٹ کے تمام منسٹرز' فوج' پولیس' ڈاک خانہ جات' تمام محکموں کے قوانین' حکومت کی شریعت ہوں گے اور ان کی اطاعت عبادت کے مرادف ہوگی۔

ان چند سطور کے ملاحظہ کے بعد آپ خود غور فرمائیں کہ سابقہ فقہ واقعاً بے جان اور بنجر ہے یا نہیں۔ وہ صرف مذہب کی حد تک کام دے سکتا ہے۔ دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ بات ضرور خیال شریف میں رکھیں کہ اس فقہ کی تدوین میں ہمارے محترم علماء کرام کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ اسی لئے وہ دینی فقہ کے مخالف ہیں۔ ان کا دخل صرف مذہبی فقہ تک رہ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ خوش آئند ہے کہ اس فقہ میں فرقہ بندی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس طریق تدوین

میں فرقہ بن ہی نہیں سکتا۔

اسلام آباد میں منعقدہ سیمینار کے شرکاء کے سامنے صرف مذہب تھا ان کے سامنے دین نہیں تھا۔ یہ تبصرہ اخبار کی Cuttings پر کیا جارہا ہے۔ غالباً ان کی تقاریر ابھی شائع نہیں ہوئیں۔ اگر ان کی تقاریر شائع ہوکر حاصل ہوسکیں تو پھر انشاءاللہ ان پر جامع تبصرہ پیش خدمت عالی کیا جاسکے گا۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بدلتی تاریخ

ہم مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب تاریخی تقدس Sanctity بھی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ تقریباً تیسری صدی ہجری سے منضبط ہونا شروع ہوئی جن حضرات نے تاریخ لکھنی شروع کی ان کی قابلیت کے لئے جو تحریر کرنا مقصود ہے اس کے لئے انگریزی الفاظ زیادہ موزوں ہیں کہ وہ حضرات Professional Sense میں Historians نہیں تھے اور وہ ایک Historian کی Requirements پوری نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف وقائع نویس Chronicle Writers تھے۔ ان کے سامنے تاریخ نویسی کے کوئی اصول نہیں تھے۔ صحیح معنوں میں انہیں Historian نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے واقعات صرف اس وجہ سے Preserve کر لئے تھے تاکہ وہ اگلی نسلوں تک منتقل ہوتے جائیں۔ ان نوشتوں میں بہت زیادہ باتیں متضاد بھی ہیں۔ ان کا اپنا عندیہ بھی یہ نہیں تھا کہ تاریخ کو کسی قسم کا تقدس دیا جائے اور اسے Sacred Cow بنا دیا جائے۔ لیکن ہمارے لئے یہ تاریخ قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ جب وہ واقعات سامنے آتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں تو ہماری پیشوائیت ہمیشہ تاریخ کو اولین ترجیح دیتی ہے اور قرآن فہمی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس بارے میں بے شمار مثالیں ہیں لیکن چند مثالیں پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے تحریک طلوع اسلام نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ قرآن کی رو سے بلوغت، نکاح

کے لئے ایک شرط ہے۔ (4:6) قرآن کریم کی یہ بات اتنی واضح تھی کہ ہمارے علماء کرام اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے تو انہوں نے اس شرط سے انکار کرنے کے لئے قرآن سے کوئی سند نہیں دی بلکہ انہوں نے تاریخ کا سہارا لیا کہ چونکہ حضرت عائشہؓ کا نکاح قبل از بلوغت ہو گیا تھا' اس لئے بلوغت نکاح کے لئے شرط نہیں ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ عدالتوں میں بھی ان کی کمسنی کو بطور دلیل پیش کیا جاتا تھا۔ اور اس طرح یہ تاریخی واقعہ قرآن فہمی میں ایک روک بنا۔ لیکن چونکہ نابالغ کے نکاح کی اجازت قرآن میں نہیں ہے اور عقل عامہ اور موجودہ دور کی ضروریات بھی اس کے خلاف جاتی ہیں اس لئے مولوی حضرات بھی یہ چاہتے تھے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بلوغت کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ تحریک طلوع اسلام کے زیر اثر انہوں نے بھی اس بات کا اعتراف کر لیا۔ مشہور و معروف عالم دین جناب مولانا عمر احمد عثمانی نے فقہ القرآن نام کی ایک کتاب دس جلدوں میں تصنیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب فقہ کی دنیا میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ وہ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اس سلسلہ میں (یعنی حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں) بڑی اہم اور مسرور کن خبر یہ ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی پانی پتی' سرگودھا' فاضل دیوبند اور مولانا عظمت اللہ صاحب فاضل دیوبند' کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتم بالشان کتاب سامنے آئی ہے' یہ حضرات شیخ الاسلام سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب کا نام 'کشف الغمہ عن عمر الامہ'' ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے' جن سے حضرت عائشہؓ صدیقہ کی صِغرِ سنی پر استدلال کیا جاتا تھا' محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا ہے کہ 143 ہجری تک بخاری شریف کی ہشام بن عروہ والی 'حدیث'' کا کوئی وجود ہی نہیں تھا' جو اس سلسلہ میں بنیادی

حیثیت رکھتی ہے' اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پا گئی ہے۔'' اس سے آگے اسی کتاب فقہ القرآن میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب' اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: ''مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں ''پہلے خیال تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے کیونکہ اس سے احادیث کی صحت پر حرف آئے گا' اور منکرین حدیث کو تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلۂ خیال کیا گیا' اکثر کی رائے یہی تھی (کہ اس کو شائع نہ کریں۔ راقم سطور) لہٰذا کتاب کے مسودے میں باربار ترمیم کرنی پڑی''۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک واضح حکم کو کس طرح تاریخ پر منحصر کیا جا رہا ہے۔ جب طلوع اسلام نے حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت انیس سال ثابت کی تھی تو انہوں نے اس کو Appreciate نہیں کیا تھا' بلکہ خود اس کی تحقیق کی اور اس طرح یہ تاریخی رکاوٹ دور ہوگئی۔

دوسری نمایاں مثال صحابۂ کرام کے آپس میں جنگ وجدال کی ہے۔ تاریخ میں ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ جنگ جمل میں ہی حضرت علیؓ نے حضرت زبیر بن العوام کو قتل کیا۔ یہ حضرت زبیر کبار صحابہ میں سے تھے۔ حضورﷺ کے اور حضرت علیؓ کی حقیقی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے۔ یعنی حضرت علیؓ کے First Cousin تھے اور دونوں ماشاءاللہ رضی اللہ عنہٗ ہیں اور دونوں ''عشرہ مبشرہ'' میں شامل ہیں۔ قرآن کی رو سے صحابہ کرامؓ آپس میں نہیں لڑ سکتے تھے۔ (19:96, 48:29) لیکن چونکہ یہ تاریخ میں تحریر ہے' اس لئے ہمارے علماء کرام' قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف' ان جنگوں کے قائل ہیں۔ اور اس طرح اسلام کی بھیانک تاریخ پیش کرتے ہیں۔

بنو عباس کے دور میں جب کوئی بادشاہ فوت ہوتا تھا تو وہ اپنی وفات سے کچھ پیشتر اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا جانشین بنا دیتا تھا' یا ان کے درمیان مملکت کو تقسیم کر جاتا تھا۔ لیکن بادشاہ کے مرنے کے بعد' ہمیشہ اس کے بیٹوں میں جنگیں ہوئیں' اور خون خرابہ ہوا۔ اس دور کے عوام

بادشاہوں اور شہزادوں کو اس کشت وخون کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور اس کو کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے۔اس کراہت سے بچنے کے لئے اس دور کے تاریخ نویس حضرات نے ان واقعات کو جنم دیا کہ جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ اقتدار کی خاطر لڑ سکتے تھے' تو ان شہزادوں کا اس میں کیا قصور ہے' اور اس طرح ان شہزادوں کے ضمیر کو مطمئن کر دیا گیا اور عوام کی تنقید بھی ختم ہوگئی۔

اسی طرح قرآن کریم نے غلامی کو بالکل بند کر دیا تھا(24:33, 47:4) لیکن ان واضح آیات کے بعد بھی آپ دیکھیں گے کہ تاریخ میں بے شمار جگہ پر درج ہے کہ صحابہ کرامؓ اور اس کے بعد' بڑے بڑے علماء کے پاس غلام اور لونڈیاں تھیں اور بادشاہوں کے حرم میں بھی کنیزیں تھیں۔اب جب بھی غلاموں اور لونڈیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے ہمارے علماء ان تاریخی یادداشتوں کو سند کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت سلمان فارسی محض فرضی شخصیت ہیں۔ ایران والوں نے ایران کے تمام فضائل ان کے منہ سے نکلوائے ہیں۔اسی طرح ان کے بقول حضرت عباسؓ فرضی شخصیت ہیں۔عباسی خلفاء نے حضورﷺ سے اپنی رشتہ داری ثابت کرنے کے لئے یہ شخصیت وضع کی ہے۔

یہ سب تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ تاریخ کس طرح قرآن فہمی میں رکاوٹ بنتی ہے۔اب یہ عرض کیا جائے گا کہ تاریخ بنتی کیسے ہے' ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان ماضی قریب میں بنا ہے۔اب بھی وہ حضرات زندہ ہیں جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتا دیکھا ہے۔وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے اس کی تشکیل میں عملاً حصہ لیا ہے۔یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کے قیام کی مخالفت میں ہماری پیشوائیت نے ڈٹ کے مقابلہ کیا ہے۔اس وقت علماء کرام کی نمائندہ جماعت جمیعت العلماء ہند تھی جس کے صدر جناب مولانا حسین احمد مدنی صاحب تھے اور تمام علماء کرام اسی جمیعت سے منسلک تھے اور قیام پاکستان

کے سخت مخالف تھے۔آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم نے بھی اس بات کا اعتراف فرمایا کہ جب انہوں نے کہا تھا کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔ان تمام واقعات کے علی الرغم آپ ملاحظہ فرمائیں کہ آٹھویں جماعت کے بچوں کے لئے ایک درسی کتاب ہے جس کا نام ''اردو کی آٹھویں کتاب'' ہے۔یہ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ' جام شورو' سندھ' نے طبع کرائی ہے۔اس کتاب میں چالیس اسباق ہیں۔ان اسباق میں سے ایک سبق کا عنوان ''تحریک پاکستان میں علماء کا حصہ'' ہے۔یہ سبق محاکاتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔بچے اپنے دادا جان سے تشکیل پاکستان کے متعلق سوال کرتے ہیں اور ان کے دادا جان ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔اگرچہ مناسب تو یہ تھا کہ یہ پورا سبق آپ کی خدمت عالی میں پیش کیا جاتا' لیکن اس سے مضمون کے طویل ہونے کا اندیشہ ہے۔اس کا ایک حصہ اس کتاب سے نقل کیا جاتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

مشاہد: دادا جان' مسلمانوں کے ساتھ انگریز حکومت کا طرز عمل کیسا رہا؟

دادا جان: جنگ آزادی میں ناکام ہونے کے بعد عام مسلمانوں اور علماء کو انگریز حکومت نے سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی تھی۔انہیں بر سر عام پھانسیاں دی گئیں' جلاوطن کیا گیا' بہت سے لوگوں کو ''کالا پانی'' بھیج دیا گیا۔

اشرف: تو پھر مسلمانوں نے اس کے لئے عملی طور پر کس قسم کی جدوجہد کی؟

دادا جان: مسلمانوں نے مجلس خلافت' تشکیل دی جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ موثر اور فعال جماعت تھی۔تمام قابل ذکر علماء اس جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔مسلمانوں میں اپنے قومی وجود کی بقاء کا مسئلہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا انہیں ایک علیحدہ وطن کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اشرف: دادا جان۔جن علماء نے تحریک پاکستان کی اس جدوجہد میں حصہ لیا ان

میں خاص خاص کون تھے؟

دادا جان: دیکھو بھئی ویسے تو اس تحریک میں بہت سے علماء شامل تھے۔ لیکن ہم تمہیں صرف چند کے بارے میں بتاتے چلیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا ظفر احمد عثمانی' مفتی محمد شفیع' پیر محمد حسن جان مجددی سرہندی' مولانا عبدالعلیم صدیقی' علامہ سعید احمد کاظمی' مولانا عبدالحامد بدایونی' مولانا عبدالماجد بدایونی' پیر غلام محمد مجددی سرہندی' پیر مانکی شریف' پیر ذکوڑی شریف اور حافظ کفایت حسین بہت با اثر اور ممتاز تھے۔ ان علماء کی وجہ سے پورے برصغیر میں علماء کا تعاون مسلم لیگ کو حاصل ہوا۔ اس وقت تحریک پاکستان کو عام کرنے کے لئے ایک تنظیم ''جمعیت علماء اسلام'' بھی تشکیل دی گئی جس کی علمی کوششوں کی بدولت نظریۂ پاکستان زیادہ وضاحت سے سامنے آیا۔ چنانچہ عام مسلمان اور علماء کی ایک بڑی تعداد کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شریک ہونے لگی' اس سے تحریک پاکستان کو بڑی تقویت پہنچی۔

نومی: دادا جان۔ ان میں سے چند علماء کے بارے میں ہمیں الگ الگ مختصر طور پر کچھ بتائیے۔

دادا جان: اچھا تو سنو۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی خواہش تھی کہ زمین کے ایک حصہ پر خالص اسلامی حکومت قائم کی جائے' ایسی حکومت جس کے تمام قوانین شریعت کے مطابق ہوں۔ عدالتیں بھی شرعی ہوں۔ بیت المال اور زکوٰۃ کا نظام رائج ہو۔ ان کا خیال تھا کہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ اسلامی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے مسلمانوں

کے آئینی اور دینی مفادات کے تحفظ کے لئے کوششیں کیں ۔مسلمانوں کے دستوری معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کے لئے عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک بھی سب سے پہلے انہوں نے شروع کی۔انہوں نے مجلس ''دعوت الحق'' بھی قائم کی، جس کا مقصد دین اسلام کے مطابق مسلم لیگ کے لئے راہ عمل تجویز کرنا اور اصلاح کرنا تھا۔ وہ پاکستان کے وجود کو مسلمانوں کی بقا اور حیات قومی کے لئے لازمی سمجھتے تھے۔

شاہد: دادا جان اب کچھ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارے میں بھی بتائیے۔

دادا جان: مولانا شبیر احمد عثمانی بھی نظریۂ پاکستان کے قائل تھے۔وہ جانتے تھے کہ ہندو اور مسلم دو الگ قومیتیں ہیں۔وہ ساتھ مل کر نہیں رہ سکتیں۔اسی لئے انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔انہوں نے ان علماء کو متحد کیا جو دو قومی نظریئے کے قائل تھے انہوں نے ''جمیعت العلماء اسلام'' بھی تشکیل دی۔قائداعظمؒ کے کہنے پر انہوں نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔

اشرف: دادا جان۔تحریک پاکستان میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے کیا حصہ لیا؟

دادا جان: بھئی۔مولانا اشرف علی تھانوی نے سیاسی سطح پر تبلیغ و اصلاح کی جو مجلس تشکیل دی تھی مولانا ظفر احمد عثمانی اس کے اہم رکن تھے اور تقریباً تمام اہم وفود میں شریک رہے، مسلم لیگ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وہ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔پاکستان بنانے کے سلسلے میں جو فیصلہ کن انتخابات ہونے والے تھے ان کے لئے چار ماہ تک انہوں نے

مختلف علاقوں کا دورہ کیااور رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔

نومی: اس تمام جد وجہد میں مولانا شفیع کس حد تک شریک رہے؟

داداجان: مولانا محمد شفیع نے بھی دو قومی نظریے کی وجہ سے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی تھی' انہوں نے اپنی تحریروں سے پاکستان کے مطالبے کی وضاحت کی۔تحریک پاکستان کی مقبولیت کے لئے انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں بالخصوص صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ یہ ان کی تبلیغی کوششوں ہی کا اثر تھا کہ وہاں لوگ مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگے۔

بچو: یہ ایسے ہی علماء کی مستقل عملی اور تحریری کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عوام میں مسلم لیگ نے زیادہ تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔مسلمانوں میں اپنے قومی تشخص کا احساس بیدار رہوا۔انہیں ایک ایسا وطن حاصل کرنے کی لگن ہوئی جس میں وہ اپنے مذہب کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔''
(اقتباس ختم ہوا)۔

آپ نے اقتباس ملاحظہ فرمایا۔اس کی طوالت کی وجہ سے میں معذرت خواہ ہوں۔اس کا اخری پیراگراف خاص توجہ کا متقاضی ہے۔جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پاکستان صرف ہمارے علماء کرام نے ہی بنایا تھا۔

سارے مضمون میں صرف ایک مرتبہ قائداعظمؒ کا حوالہ دیا گیا ہے۔لیگ کے کسی مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید' جمیعت العلماء ہند' جماعت اسلامی' مجلس احرار' جمیعت الانصار اور دیگر مذہبی جماعتیں' جنہوں نے قیام پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی' ان کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں۔اس مضمون سے بچوں کے دماغ میں یہی بات پیوست ہوگی کہ پاکستان صرف علماء کرام نے بنایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند پاکستان کے قیام کا مخالف تھا جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے تعطیل کے دوران شہر شہر' قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں جا کر پاکستان کے قیام کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ علماء کرام کو جب بھی پاکستان کے فوائد گنوائے جاتے اور اس کے قیام کے لئے مشورہ دیا جاتا وہ ہمیشہ متحدہ ہندوستان میں رہنے کی ہی تائید کرتے اور اسی بات کا مشورہ دیتے کہ متحدہ ہندوستان میں رہنا زیادہ فائدہ مند ہوگا۔

ڈوبنے والوں کو جب میں نے دیا ساحل سے ہاتھ
وہ مجھے بھی ڈوبنے کا مشورہ دینے لگے

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استدراک

میرا ایک مضمون، رسالہ طلوع اسلام کے اگست کے ایشو میں ''حضراتِ گرامی قدر'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ اصل میں یہ ایک تقریر تھی جو محترم المقام جناب پرویز صاحب مرحوم کی برسی کے موقع پر کرنی تھی۔ کسی وجہ سے وہ تقریر نہیں ہوسکی اور طلوع اسلام نے اس کو مضمون کی شکل میں طبع فرمادیا جس کے لئے میں ان کا بہت شکرگزار اور ممنون ہوں۔

مضمون کے متن میں صفحہ اکتیس (31) پر یہ چند سطور مرقوم ہیں ''غیر اسلامی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے والا ہر فرد مجرم ہوتا ہے اور اس کے لیڈرز اکابر مجرمین ہوتے ہیں۔ غیر اسلامی حکومت میں کمائے ہوئے رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ غیر اسلامی نظام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔'' قارئین کو معلوم ہے کہ تقریر اور تحریر کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہر بات کی تائید میں قرآنی آیت تحریر کرے اور اس کے ساتھ اس کا حوالہ بھی دے۔ میں نے اپنی تحریر میں ہمیشہ اس بات کا التزام رکھا ہے۔ یہ مضمون چونکہ ایک تقریر تھی، اس لئے آیات کے حوالے درج نہیں کئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے میرے پاس متعدد خطوط اور ای میلز آئے ہیں کہ میں نے مضمون میں جو باتیں تحریر کی ہیں وہ محلِ نظر ہیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ امور درست اور صحیح ہیں تو قرآن کریم سے ان کے حوالے دیئے جائیں۔ میں نے نہایت دوٹوک اور Precise طریقہ سے تین نکات اس تقریر میں تحریر

کئے تھے اور یہ تین نکات تحریک طلوع اسلام کے وہ بنیادی و امتیازی نظریات ہیں جن کی وجہ سے یہ تحریک دوسری تحاریک سے ممیّز ہو کر' ایک منفرد حیثیت کی حامل قرار پاتی ہے اور قریب چودہ سو سال کے عرصہ میں ان نظریات کی حامل کوئی تحریک بر پا نہیں ہوئی اس لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ان نکات کو قرآنی آیات کی تائید کے ساتھ پیش خدمت عالی کیا جائے۔ مضمون کو Precise کرنے کے لئے تینوں نکات وضاحت سے تحریر کئے جاتے ہیں۔

(1) غیر اسلامی نظام میں اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔

(2) غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر فرد مجرم ہوتا ہے اور اس کے لیڈر اکابر مجرمین ہوتے ہیں۔

(3) غیر اسلامی نظام میں کمائے ہوئے رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔

پہلی شق کے بارے میں عرض خدمت ہے کہ نزول قرآن کے دوران مختلف امور کے متعلق جو قوانین و احکامات دیئے جا رہے تھے تو ان پر عمل کرنے کی یہ صورت ہوتی تھی کہ صحابہ کرامؓ ان پر اجتماعی طور پر ایک نظام کی وساطت سے عمل کرتے تھے۔ زکوٰۃ' خمس' صدقات کے احکام نازل ہوئے تو لوگوں نے انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا نہیں کی کہ جس کا دل چاہا اس نے اپنی مرضی سے اپنی متعین کردہ شرح کے مطابق کسی کو زکوٰۃ ادا کر دی بلکہ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ وہ رقم حضورﷺ کو پیش کی جاتی تھی اور حضورﷺ اس کو بطور سربراہ مملکت کے بیت المال سے لے کر مستحقین کی تقسیم فرما دیتے تھے۔ اس طرح جب احکامات تعزیرات نازل ہوئے کہ زانی کو سو کوڑے مارو یا چور کا ہاتھ کاٹ دو تو لوگوں نے از خود ان احکامات پر عمل نہیں کیا کہ کسی کے گھر میں چوری ہوگئی اور اس نے محلّہ کے لوگوں کو جمع کر کے' چور کے ہاتھ کاٹ دیئے بلکہ صحیح صورت یہ ہوتی تھی کہ زنا یا چوری کے جرم کی اطلاع مدینہ میں حضورﷺ کو اور مدینہ کے باہر حضورﷺ کے مقرر کردہ مقامی افسران' اولی الامر کو دے دی جاتی تھی' وہ مقامی حاکم' یعنی حضورﷺ کا مقرر کردہ ولی الامر اس جرم کی تحقیق

کر کے' اس کیس کو Dispose off کر دیتا تھا۔قرآنِ کریم کے نازل کردہ احکام کی اطاعت اس مرکز کی معرفت' اجتماعی طور پر کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر ان کی اطاعت الگ الگ نہیں کی جاتی تھی۔اس مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ احکام اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہوتے تھے' اور ان کو عملی طور پر حضورﷺ بحیثیت سربراہ مملکت کے جاری فرماتے تھے' اس لئے اس نظام (مرکز) کی اطاعت سے اللہ و رسول دونوں کی اطاعت ہو جاتی تھی۔مرکز کی اجتماعی اطاعت ہوتی تھی۔حضورﷺ کو حکم تھا: **فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ** (5:48) قانون خداوندی کے مطابق ان میں فیصلہ کرو' تو ہر تنازعہ کا فیصلہ مرکز کی طرف سے ہوتا تھا اور مرکز کے فیصلوں کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی تھی۔ارشاد ہوتا ہے: **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** (4:65) پس اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنالیں۔ظاہر ہے کہ یہ حکم حضورﷺ کے دور تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی فرضیت حضورﷺ کے جانشینوں کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔اب اگر کسی کو اللہ و رسول کی اطاعت کرنی درکار ہے تو اس پر فرض ہے کہ پہلے وہ اسلامی حکومت کا مرکز قائم کرے' جو ما انزل اللہ' کے مطابق فیصلے کرے' پھر اس مرکز کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت شمار کرے' اس مرکز کے قیام کے بغیر اللہ و رسول کی اطاعت کرنا ''حدیثِ بے خبراں'' ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ** ...... (4:59) ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں۔ یہ آیہ مبارکہ اس قدر جامع آیت ہے کہ اس ایک آیت میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام کا مکمل نقشہ عطا کر دیا ہے۔اور اس آیت کو صحیح طور پر سمجھنے سے ہی تحریک طلوعِ اسلام کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔**اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول**. یہ قرآن کریم کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس سے مراد نظامِ خداوندی کی

اطاعت ہوتی ہے جسے سب سے پہلے حضورﷺ نے عملاً جاری کیا تھا اس کے لئے آیات ,59:4 9:62 ,9:74 ,9:59 ,9:24 ملاحظہ فرمائیں۔ اس نظام میں جو تنازعے مدینے کے باشندوں کے درمیان ہوتے تھے وہ حضورﷺ کے سامنے پیش کر دیئے جاتے تھے لیکن دور دراز کے مقامات کے تنازعات' حکومت کے مقامی حکام' اولی الامر کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ ان مقامی حکام کی اطاعت' مرکزی حکومت' یا دوسرے الفاظ میں' حضورﷺ کی اطاعت ہوتی تھی۔ یہ اطاعت حضورﷺ کی ذاتی اطاعت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اس میں یہ فرق ضرور تھا کہ مقامی حکام کے فیصلوں کے خلاف مرکز میں اپیل ہوسکتی تھی جبکہ مرکز (حضورﷺ) کا فیصلہ حتمی Final ہوتا تھا' بہر حال حضورﷺ کی اطاعت' اس نظام میں' ان کے اپنے ماتحت اولی الامر کی وساطت سے ہی ہوتی تھی۔ اب اگر نہ تو حضورﷺ کے مقرر کردہ اولی الامر ہوں' اور نہ ہی وہ نظام جاری ہو' جو قرآن کریم کے احکامات نافذ کر رہا تھا۔ تو پھر اس صورت میں حضورﷺ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ حضورﷺ کی اطاعت صرف نظام میں' ان کے اولی الامر کی وساطت سے ہی ہوسکتی ہے۔ چونکہ اس نظام کو آگے چلنا تھا' اس لئے حضورﷺ کے بعد' آپ کے خلفاء اور جانشینوں اور ان کے مقرر کردہ اولی الامر نظام کی معرفت حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے' اس مقصد کی تائید کے لئے چند احادیث پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔ جن سے اسلامی حکومت' امام وقت کی اہمیت اور اس کی اطاعت کی وضاحت ہوتی ہے۔

(1) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(بخاری شریف' کتاب الاحکام)۔

(2) ابوذر سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نظام جماعت سے بالشت بھر بھی ہٹا' اس نے درحقیقت گردن سے اسلام کا حلقۂ اطاعت نکال پھینکا۔

(3) جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے' وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (مسلم شریف' باب الامر بلزوم الجماعۃ)۔

ان سطور میں آیاتِ قرآنی اور ارشادات نبوی سے یہ بات ثابت کی جارہی ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کے لئے قرآن کریم کو بحیثیت ایک نظام' ایک ضابطۂ حیات کے متمکن کرنا لازمی وضروری ہے۔ اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور اس نظام کا سربراہ' ایک زندہ اتھارٹی کی شکل میں موجود ہوتا ہے جس کے احکامات پہلے سنے جاتے ہیں اور ان کے بعد ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ (64:16, 24:51, 8:20, 2:285)-

اس منشاوفحویٰ کو مزید مرتکز طور پر بانداز دیگر یوں بھی واضح کیا جاسکتا ہے کہ یہ عقیدہ تو ہم سب مسلمانوں کا مشترک عقیدہ ہے کہ حضورﷺ نے اپنے دورِ مبارک میں ایک مملکت قائم فرما لی تھی جس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا۔ حضورﷺ خود ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے فرماتے تھے (5:48-49) حضورﷺ کے اپنے دور میں عدالتیں بھی قائم ہوگئی تھیں (24:5, 5:106, 4:58) اور جگہ جگہ مقامی حکام یعنی اولی الامر بھی مقرر فرما دیئے گئے تھے (4:59, 4:83) ہمارے علماء اس بات میں بھی ہم سے متفق ہیں کہ حضورﷺ کے دور میں اس نظام کی اطاعت' جو حضورﷺ نے قائم فرمایا تھا' اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اس بات میں ہم سب متفق ہیں۔ البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورﷺ کے بعد حضورﷺ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ ہمارے علماء کرام حضورﷺ کی اطاعت احادیث کی طرف منتقل کر دیتے ہیں کہ اب احادیث سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے جبکہ تحریک طلوع اسلام کا یہ منفرد نظریہ ہے کہ یہ اطاعت حضورﷺ

کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور خلفاء کی اطاعت سے حضور ﷺ کی اطاعت ہوتی ہے اور اگر اس نظام کو چلانے کے لئے خلفاء بحیثیت ایک زندہ اتھارٹی کے موجود نہ ہوں اور ان کے احکامات کی تعمیل نہ ہو رہی ہو، تو پھر حضور ﷺ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ چونکہ احادیث کی اطاعت کرنے میں کسی نظام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اس لئے ہمارے علماء کرام کے نزدیک نظام کے قیام کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

شق نمبر دو (2) کا مضمون یہ تھا کہ غیر اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنے والا ہر فرد مجرم ہوتا ہے۔

> أَوَ مَن كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122)-
>
> (ترجمہ) کیا جو شخص (پہلے) مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ ہر طرف سے اندھیروں میں پھنسا ہوا ہے۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر موت و حیات کا مفہوم واضح کیا ہوا ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ خدا کا زندگی بخشنے والا پیغام حیات، ان ہی لوگوں کے لئے فائدہ مند ہے جو زندہ ہوں اور زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں 36:70۔ اس آیہ کریمہ میں بھی مردہ سے مراد وہ ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنے کے خواہش مند نہ ہوں اور زندہ وہ ہے جو اسلامی نظام قائم کر کے، قرآنی مشعل و قندیل کی روشنی چاروں طرف بکھیرتا ہو۔ اس آیہ سے اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

> وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجَرِمِيهَا لِيَمْكُرُواْ فِيهَا وَمَا يَمْكُرُونَ إِلاَّ بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (6:123)-

(ترجمہ) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے قصور واروں کو سردار بنایا تا کہ ان میں مکاری کریں، اور وہ لوگ جو کچھ بھی مکاری کرتے ہیں، اپنے ہی حق میں برا کرتے ہیں۔

قرآن کریم ظلم و جور پر مبنی نظام کے لیڈرز و عمائدین کو **اکٰبر مجرمین** 6:123، مجرموں کا سردار کہتا ہے۔ اس کی رو سے اس نظام کا ایک ایک فرد مجرم ہے لیکن اس کے لیڈر اکٰبر مجرمین ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو قوم کو دارالبوار (14:28) تباہی کے گھر میں اتار دیتے ہیں۔ حضرت صالح نے جب قوم ثمود کی اصلاح کی کوشش شروع کی تو انہیں بہت مایوسی ہوئی کہ اس قوم میں اصلاح کیسے ہوگی؟ تو انہیں جواب ملا۔ **وَكَانَ فِيْ الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِيْ الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ** (27:48)-اس سلطنت کے دارالخلافہ میں نو (9) لیڈر ہیں جو ساری خرابی کا سبب ہیں۔ صرف ان کی وجہ سے ساری قوم ثمود بگڑی ہوئی ہے۔ اگر ان نو آدمیوں کی اصلاح ہو جائے تو پھر معاشرہ درست ہو جائے گا۔ قرآن کریم کی رو سے جو لوگ ایمان لے آئیں، مگر وہ ایمان لانے کے باوجود اسلامی مملکت کی طرف ہجرت نہ کریں تو قرآن ان کی کسی قسم کی مدد کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُم مِّن وَّلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا** (8:72)- لیکن جو لوگ مسلمان تو ہو گئے، لیکن انہوں نے اپنا وطن نہیں چھوڑا، (غیر اسلامی نظام میں رہے) تو ان کی مدد و اعانت تم پر فرض نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ نہ آملیں۔ یہاں **حتی یھاجروا** کے الفاظ غور طلب ہیں کہ مدد کرنے کا معیار صرف ایمان نہیں ہے، بلکہ اسلامی حکومت کی طرف ہجرت ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِيْ الْاَرْضِ قَالُوْا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ

وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (4:97)-

بے شک جن لوگوں کی قبض روح فرشتوں نے اس وقت کی ہے کہ دارالحرب میں پڑے اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے قبضِ روح کے بعد حیرت سے کہتے ہیں تم کسی حالت غفلت میں نہیں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو روئے زمین پر بے کس تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی زمین میں اتنی بھی گنجائش نہیں تھی کہ تم ہجرت کر کے چلے جاتے۔ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ (جو دارالحرب میں ہے) جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

ان آیات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے غیر اسلامی نظام میں زندگی گذارنا کس طرح ممنوع ہے۔

اس تقریر کا تیسرا نکتہ یہ تھا کہ غیر اسلامی نظام میں جس قدر بھی رزق حاصل ہوتا ہے وہ سب حرام ہے' اور اس کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔ یہ نکتہ سب سے زیادہ Punching اور کاٹنے والا ہے' کیونکہ ہمارا اس نکتہ سے روزمرہ کا تعلق ہے۔ اس لئے یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ اور Teasing ہے' اور اتفاق سے یہی نکتہ سب سے زیادہ واضح اور دوٹوک بھی ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ جو لوگ قانون خداوندی کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر' ظالم اور فاسق ہوتے ہیں۔ 5:44-45,47' ان آیات کا اطلاق صرف سیاسی احکام پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کا اطلاق معاشی نظام پر بھی ہوتا ہے۔ ہر وہ معاشی نظام جس کی اساس قرآن کریم پر نہیں ہے' وہ معاشی نظام باطل پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا حاصل کردہ رزق کسی حال میں بھی حلال نہیں ہو سکتا۔ جب رزق کی تقسیم قرآن کے قوانین کے مطابق ہو گی اس وقت وہ رزق حلال ہو گا اور اس کی واضح علامت یہ ہے کہ: وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (11:6)- زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا

نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔ جب تک مملکت کے ایک ایک فرد کو رزق مہیا نہیں ہوتا' اس کی تقسیم قانون خداوندی کے مطابق نہیں' چونکہ رزق کی تقسیم قرآنی احکام کے مطابق نہیں ہے' اس لئے وہ رزق قطعاً حرام ہے۔

اس کے علاوہ ربوٰ قرآن کی رو سے قطعاً حرام ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (2:275)- اللہ نے تجارت حلال کی اور سود حرام قرار دیا ہے' جب کبھی اور جہاں کہیں بھی غیر اسلامی نظام ہو گا' اس جگہ ربوٰ کا چلن ضرور ہو گا۔ ربوٰ خود اللہ و رسول کے خلاف جنگ' اور اسلامی نظام کے متبادل ایک نظام ہے۔ ورلڈ بینک' آئی۔ ایم۔ ایف اور تمام بین الاقوامی اداروں سے جو ہم قرض لیتے ہیں' ان سب کا دارومدار ربوٰ پر ہے۔ آج کل تمام حکومتوں کا نظام ہی ربوٰ پر ہے۔ اس ربوٰ کے ذریعہ جس قدر رزق حاصل ہو رہا ہے وہ سب حرام ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں جاگیرداری نظام بھی جاری ہے۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر رز کا گذارا ہی جاگیرداری پر ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ملکیت زمین جائز ہی نہیں ہے۔ منطق اور عقل عامہ کی کوئی دلیل زمین کی ملکیت ثابت نہیں کر سکتی۔ صرف یہ ثابت کر سکتی ہے کہ یہ زمین وراثت میں حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ کہ سب سے پہلا' مورثِ اعلیٰ اس کا مالک کیسے ہو سکتا ہے' یہ کوئی ثابت نہیں کر سکتا اس لئے قرآن کی رو سے جاگیر اور مربعوں کی آمدنی جائز نہیں ہے۔

البتہ یہاں جائز رزق حاصل کرنے کے بارے میں دو مغالطوں کا دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے' کچھ حضرات کا خیال ہے کہ اگرچہ ملک کا نظام ربوٰ پر مبنی ہو' لیکن ہم چونکہ اپنی تنخواہ یا اجرت' محنت کرنے کے بعد لیتے ہیں' اس لئے وہ ہم پر حلال ہے' لیکن یہ بات درست نہیں ہے' مالِ مسروقہ اگر کئی واسطوں کے بعد بھی خرید کیا جائے وہ مال مسروقہ ہی رہتا ہے' اس کی ملکیت جائز نہیں ہوتی۔ بعض حضرات سورہ مائدہ کی آیات کریمات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ آیات یہود سے متعلق ہیں اور انہیں یہ حکم تھا کہ اگر انہوں نے ما انزل اللہ کے متعلق فیصلے نہ کئے تو وہ کافر ہو جائیں

گے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ہمارا ان آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مغالطہ ہے چونکہ اس مغالطے میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں' اس لئے اس مغالطہ کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔

پہلی اصولی بات تو یہ ہے کہ دین اول دن سے آج تک ایک ہی چلا آ رہا ہے' دین کی غایت الغایات خدا کی حاکمیت ہے جس کا عملی طریقہ اس کی کتاب کی حکمرانی ہے۔ ہر رسول نے یہی فرمایا: یَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ (11:50)- محکومیت صرف خدا کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ اصول جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اس قانون کا اطلاق ہر رسول' اس کی کتاب' اور اس کی امت پر ایک جیسا ہوگا اور ہم پر خصوصاً اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہے۔ دوسروں کے پاس اصل حالت میں موجود ہی نہیں ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص انجیل و توریت کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جو ماانزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ماانزل اللہ' توریت و انجیل تھی۔ ہمارے لئے ماانزل اللہ قرآن کریم ہے۔ ان کا ماانزل اللہ ان کی کتابیں تھیں' ہمارا ماانزل اللہ ہماری کتاب اللہ ہے۔ جس کے مطابق فیصلے کرنا ہم سب پر لازم ہے۔ ہم پر خصوصاً زیادہ لازم ہے کیونکہ اب ماانزل اللہ صرف ہمارے پاس ہے' اور کسی کے پاس غیر محرف شکل میں ماانزل اللہ ہے ہی نہیں۔ اس لئے وہ ماانزل اللہ کے مطابق فیصلے کر ہی نہیں سکتے۔

قارئین کرام کے حکم کے مطابق ان تینوں نکات کی وضاحت پیش خدمت عالی کر دی گئی ہے۔ آیات کریمات کے حوالہ جات بھی تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ آپ قرآن کریم کے نسخے سے ان کے تراجم ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ چونکہ یہ نکات و نظریات تحریک طلوع اسلام نے صدر اول کے بعد اب پہلی مرتبہ پیش کئے ہیں' اس لئے ان سے نکارت محسوس ہوتی ہے۔ بار بار پڑھنے اور

غور کرنے سے یہ نکارت دور ہو جائے گی۔شرط صرف اطاعتِ قرآن کی طرف رغبت اور طبیعت کی سعادت ہے۔

؎ نخواہم دریں نوع گفتن بسے
کہ حرفے بس از کار بندد کسے

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک طلوعِ اسلام کا ایک منفرد نظریہ

تحریک طلوعِ اسلام خالص قرآنی نظریات کی داعی ہے' چونکہ ہماری پیشوائیت اس تحریک کی مخالف ہے' اس لئے اس پروپیگنڈے کے زیراثر اس کو انکار حدیث سے متہم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا واضح اور ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ جو حدیث قرآنِ کریم کے مطابق ہے' وہ ہماری سر آنکھوں پر لیکن جو حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ تحریک حدیث کو وحی الٰہی تسلیم نہیں کرتی۔ اگر کوئی حدیث قرآن کے مطابق ہی ہے' تب بھی وہ وحی الٰہی نہیں ہوسکتی۔ وحی صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ انسانیت کی راہ نمائی اور مسائل انسانی کو حل کرنے کے لئے جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوا ہے وہ صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ وحی کا ایک لفظ بھی قرآن کے باہر نہیں ہے۔ یہ وہ نظریہ اور موقف ہے جس میں یہ بلند پایہ تحریک بالکل منفرد ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اس عقیدہ کی حامل صرف یہی تحریک ہے۔ اس بات کی وجہ کہ صرف یہی ایک تحریک اس نظریہ کی کیوں حامل ہے' ابھی آپ کے پیش خدمت کی جائے گی۔

حدیث کو وحی الٰہی خیال کرنا قرآنِ کریم کے خلاف ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے یہی نظریہ چلا آرہا ہے حدیث کی حیثیت اور اس کے مقام کے متعلق دوسری صدی ہجری کے آغاز میں ہی تحریک شروع ہوچکی تھی امام شافعی کی مشہور کتاب

''الرسالہ'' میں تحریر ہے کہ امام صاحب موصوف کا کسی منکر حدیث سے مناظرہ ہوا تھا۔ مناظرہ کے Contents سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منکر حدیث معتزلہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ معتزلہ حدیث کو حجت نہیں مانتے تھی۔ معتزلہ کے علاوہ بھی شدہ شدہ علماء و مفکرین بھی حدیث کی حجیت کے خلاف چلے آ رہے ہیں۔ موجودہ دور میں' حالات کے تقاضوں سے مجبور ہوکر' حدیث کے متعلق پھر غور وفکر شروع ہوا ہے۔ مصر کے مشہور مفکرین' ڈاکٹر طہ حسین' احمد امین مصری' ابراہیم ادھم' ڈاکٹر توفیق صِدقی' ڈاکٹر علی حسن عبد القادر' پروفیسر محمود ابوریہ نے حدیث کی حجیت پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے لیکن آپ سارے عالم اسلام پر نظر دوڑالیں' آپ کو حدیث کے وحی نہ ہونے پر کسی جگہ گفتگو نہیں ملے گی۔ ہمارے موجودہ دور میں فرقہ اہل قرآن اور تحریک طلوع اسلام نے اس مسئلہ کو نہایت بلند آواز سے اٹھایا' اور حدیث کے وحی نہ ہونے کے قرآنی و عقلی دلائل فراہم کئے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کا ہر فرقہ حدیث کو وحی ہی تسلیم کرتا چلا آ رہا ہے۔

تحریک طلوع اسلام کا حدیث کو وحی تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ اس کا دین کا تصور ہے۔ جب تک آپ اسلام کو بطور مذہب کے تسلیم کریں گے آپ کو مجبوراً حدیث کو وحی ماننا پڑے گا لیکن اگر آپ اسلام کو بطور دین پیش کریں گے تو پھر حدیث بطور وحی کے تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اس نکتہ کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

حضورﷺ کے دور میں تو چونکہ حضورﷺ خود اسلامی نظام کے سربراہ تھے اس لئے ان کی اطاعت اس نظام کی اطاعت' اور عبادت خداوندی کے مرادف تھی' ساری بحث حضورﷺ کے انتقال کے بعد سے شروع ہوتی ہے کہ حضورﷺ کے انتقال کے بعد اللہ و رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ جب تک اسلامی نظام قائم رہا' اس کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی' حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی' خلافت راشدہ کے بعد جب وہ نظام منقرض ہوگیا تو یہ نہایت اہم اور پیچیدہ سوال

سامنے آیا کہ اللہ کی اطاعت تو قرآن کی اطاعت سے ہو سکتی ہے' رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اسلامی نظام کے منقرض ہونے کے بعد رسول کی اطاعت کا حدیث کی اطاعت کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' اس لئے حدیث کی اطاعت کو فرض قرار دے دیا گیا اور اس کو Justify کرنے کے لئے حدیث کو وحی' حجت' سند اور اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا گیا اور اس طرح دین کے قیام یا اسلامی نظام کے قائم کرنے کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے لیکن اگر آپ اسلام کو بطور دین تسلیم کرتے ہیں تو آپ کو حدیث کی حجت سے لازماً انکار کرنا ہوگا' کیونکہ اس طرح اسلامی نظام کے سربراہ کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دینا ہوگا۔ اس میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے وحی خارج از قرآن کے عقیدہ کو ترک کرنا ہوگا۔ یہ وہ اصل سبب ہے جس کی وجہ سے طلوع اسلام کا موقف حدیث کے بارے میں بالکل منفرد ہے۔

تحریک طلوع اسلام والوں کو بھی حضورﷺ سے اسی طرح عشق و عقیدت ہے جس طرح عام مسلمانوں کو ہوتی ہے۔ اس تحریک کے عالی مرتبہ' بانی' جناب محترم المقام پرویز صاحب نے حضورﷺ کی سیرت طیبہ پر نہایت عالمانہ کتاب' ''معراج انسانیت'' تصنیف فرمائی جو انہوں نے عشق رسول میں ڈوب کر لکھی ہے۔ پاکستان کے عام دانشوروں کے خیال میں سیرت طیبہ پر اس سے بہتر کوئی اور کتاب اب تک تحریر نہیں ہوئی ہے۔ ان کی ساٹھ سال پر محیط تحریرات کو ملاحظہ فرمائیں ان میں ہر جگہ محبت رسول کا عنصر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ تحریک طلوع اسلام کو خدانخواستہ احادیث سے بھی کسی طرح کا انقباض نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے' یہ تحریک منکر حدیث نہیں ہے البتہ حدیث کے بارے میں اس کے دو منفرد نظریات ضرور ہیں۔

ایک تو یہ تحریک دین کا تصور سامنے آ جانے کے بعد حدیث کو وحی تسلیم نہیں کر سکتی' یہ اس کی مجبوری ہے کہ یہ حدیث کو وحی کو تسلیم نہ کرے۔ دوسری منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ تحریک احادیث کو حضورﷺ کے اقوال تسلیم ہی نہیں کرتی بلکہ یہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں اور چونکہ

موجودہ احادیث حضورﷺ کے اقوال ہی نہیں ہیں بلکہ روایات ہیں۔ اس لئے یہ نہ تو وحی ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے۔

آپ حدیث اور اصول حدیث کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں اور ان میں حدیث کی تعریف (Definition) ملاحظہ فرمائیں' ان تمام تعریفات میں یہ Inherent اور In-built' تصور دیا جاتا ہے کہ یہ احادیث راوی کے الفاظ ہیں' خود حضورﷺ کے الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ

(1) حافظ ابن حجر نے حدیث کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے کہ: **المراد بالحدیث فی الشرع ما اضیف الی النبی صلی اللہ و علیہ وسلم.** (ترجمہ عرفِ شرع میں حدیث سے مراد وہ (قول و فعل) ہے جس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی گئی ہو۔ (تدریب الراوی' جلد اول' ص 23)۔

(2) حافظ سخاوی' فتح المغیث میں علم حدیث کی تعریف یوں بیان فرمائی ہے:
معرفة ما اضیف الی النبی قولاً له' او فعلاً او تقریراً او صفة.
(ترجمہ) علم حدیث سے مراد اس قول و فعل' تقریر اور صفت کی معرفت ہے جو رسول اللہ کی طرف منسوب کی گئی ہو۔

ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ حسنی السباعی الشامی کی مشہور تالیف ''السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی'' میں سنت کے اصطلاحی معنی کے ضمن میں لکھا ہے:

''سنت اصطلاحی معنی۔ محدثین کی اصطلاح میں نبی کریمﷺ سے جو بھی آپ کا قول' فعل' یا بیان سکوتی' نیز آپ کی کوئی بھی جسمانی صفت یا اخلاقی کیفیت یا سیرت و خصلت' خواہ آپ کی بعثت سے پہلے کی ہو یا بعد کی' نقل کی گئی ہو' اس کو سنت کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کے اعتبار سے' سنت'

حدیث کے مرادف (ہم معنی) ہے جیسا کہ بعض علماء حدیث کی رائے ہے۔

علماء اصول کی اصطلاح میں ہر اس قول یا فعل یا بیان سکوتی کو سنت کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کر کے نقل کیا گیا ہو۔ (اور اس سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا ہو)۔" (کتاب محولہ بالا' ص 91)۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ حدیث کی تعریف میں کس طرح روایت بالمعنی کا مفہوم مضمر اور پنہاں ہے۔اب آپ روایت بالمعنی کا مفہوم بغور سمجھیں۔محدثین کی اصطلاح میں روایۃ بالمعنی سے مراد یہ ہے کہ راوی حدیث کے الفاظ وکلمات کے بجائے حدیث کے معنی اور مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرے۔

حافظ ابن الصلاح نے روایۃ بالمعنی کی تعریف کی ہے:

اذا اراد روایۃً ما سمعه علی معاناه دون لفظه.

(ترجمہ) جب راوی حدیث کے الفاظ کے بجائے اس کے معنی ومفہوم کی روایت بیان کرے تو اس کا یہ عمل روایۃ بالمعنی کہلائے گا۔

روایت بالمعنی کے اس مفہوم کو سامنے رکھنے کے بعد اب آپ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔فالخلاف فیھا شھیر والاکثر علی الجواز ایضاً۔ روایۃ بالمعنی کے ضمن میں اختلاف مشہور ہے۔لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ راوی اگر عالم ہو تو اس کے لئے جائز ہے۔(نزھۃ المنظر' صفحہ 94)۔

(2) یجوز نقل الخبر بالمعنی وھو مذھب الحسن

البصری، وابی حنیفہ خلافاً لابن سیرمن وبعض المحدثین۔ (توجیہہ النظر، صفحہ 300) امام حسن بصری اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، ابن سیر بن اور بعض محدثین کے نزدیک اس کی اجازت نہیں ہے۔

حدیث کی تعریف Def inition اور ان دو حوالوں سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ ان روایات کے الفاظ حضورﷺ کے اپنے الفاظ نہیں ہیں۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک راوی حضورﷺ سے کوئی مضمون سماعت فرماتا وہ راوی اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ اس سے اگلا راوی سابقہ راوی سے اس مضمون کے مفہوم کو سنتا تھا وہ دوسرا راوی پھر اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا اس طرح مفہوم تو وہی حضورﷺ کا عطا کردہ رہتا تھا، لیکن الفاظ ہر روایت میں بدلتے چلے آتے تھے۔ یہ موجودہ روایات جو ہمارے معتبر و مستند کتب حدیث میں تحریر ہیں اور ہمارے علمائے کرام جن کو احادیث کہتے ہیں یہ ان راویوں کے منہ کے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ ان کا حضورﷺ کے دہنِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، راویوں کے یہ الفاظ وحی الٰہی کس طرح ہوسکتے ہیں؟ یاللعجب!

حدیث کے وحی نہ ہونے کے بارے میں چونکہ صرف تحریک طلوع اسلام نے ہی گفتگو کا آغاز کیا ہے، اس لئے پاکستان میں ہی سب سے زیادہ اس موقف کے خلاف کتب تحریر کی گئی ہیں۔ تحریک طلوع اسلام کے اس موقف کے خلاف جو کتب تحریر کی گئی ہیں ان کی تعداد تقریباً دوسو سے متجاوز ہوگئی ہے۔ ان میں کچھ کتابیں سطحی اور جذباتی ہیں اور کچھ کتب سنجیدہ اور علمی بھی ہیں لیکن ایک بات غور کرنے کی یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام ہمیشہ اصل مسئلہ کو Mis s کر جاتے ہیں۔ معلوم نہیں عمداً یا سہواً لیکن نتیجہ ایک ہی ہے کہ اصل مسئلہ کو نظر انداز کرنے کے بعد ساری بحث کا رخ غلط سمت کی طرف ہوجاتا ہے۔ ان دوسو کتابوں کے اندر حفاظت حدیث، عربوں کے حافظہ کی

تعریف، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، تعلیم کتاب وحکمت، علماء ومحدثین کی کاوشیں اور محنتیں، پر تو خوب مواد مہیا کیا گیا ہے لیکن اصل موضوع کہ حدیث وحی الٰہی ہے، اس موضوع سے ان دوسو کتابوں میں سے کسی ایک نے بھی تعرض نہیں کیا ہے، حالانکہ اصل مسئلہ تو یہی ہے۔

اگر ہمارے علماء کرام صرف اس بات پر ہی غور فرمالیں کہ یہ احادیث روایۃ بالمعنی کی گئی ہیں اوران روایات کے الفاظ ہی حضور ﷺ کے اپنے الفاظ نہیں ہیں، تو یہ مسئلہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔اس موجودہ مضمون میں روایۃ بالمعنی کے بارے میں یہ مواد تحریر کر دیا گیا، مزید مواد اس لئے تحریر نہیں کیا جا رہا ہے کہ ''حجت حدیث'' کے موضوع پر حضرت العلام، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہی ''حجت حدیث'' ہے۔اس مشہور کتاب میں مولانا مرحوم نے روایۃ بالمعنی کے بارے میں علماء کا موقف بہت وضاحت سے بیان فرما دیا ہے، حضرت اقدس چونکہ اس دور کے نہایت بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کی تحریر اس بارے میں نہایت معتبر ومستند شمار ہوتی ہے۔حضرت کی کتاب کا پورا نام ''حجت حدیث'' شریعت اسلامیہ میں حدیث کا مقام'' ہے۔حضرت عرصۂ دراز تک جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث رہے ہیں اور نہایت پختہ سیرت، اور دنیاوی امور سے بہت مستغنی تھے۔ان کو دیکھنے سے ہی سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔اب آپ ان کی کتاب کا اقتباس بغور مطالعہ فرمائیں۔

> ''حدیث فقط رسول اللہ ﷺ کے کلمات طیبات ہی کا نام نہیں بلکہ آپ کے افعال واقوال اور واقعات اور احوال جو آپ کے سامنے پیش آئے سب ہی کو حدیث کہتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ روایت باللفظ کی ضرورت صرف آپ کے کلمات طیبہ اور احادیث قولیہ تک محدود ہے جو حدیث کا ایک قلیل حصہ ہے اور آپ کے افعال واعمال اور واقعات واصول جو حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اس میں روایت باللفظ کا سوال ہی جاری نہیں

ہوسکتا اس لئے کہ ظاہر ہے کہ جو شخص بھی حضور ﷺ کے کسی فعل اور حال کو نقل کرے گا وہ اپنے ہی لفظوں میں کرے گا، کسی کے اقوال تو باللفظ نقل ہو سکتے ہیں مگر افعال اور احوال تو کوئی لفظ نہیں جن کو باللفظ نقل کیا جا سکے۔ بیس آدمی اگر کسی کے فعل اور عمل کو بیان کریں گے تو بیس ہی لفظوں میں روایت کریں گے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پرنور کے افعال اور احوال کی روایات اور حکایات میں روایت باللفظ کا سوال تو درکنار عقلی احتمال بھی جاری نہیں ہوسکتا۔ پھر احادیث قولیہ میں ایک بڑا ذخیرہ احادیث اذکار و اوعید کا ہے ان کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب روایت باللفظ ہیں اس لئے کہ مسلمانوں میں قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ بالتواتر انہی الفاظ کے ساتھ نقل ہوتی آ رہی ہے۔"

اس سے کچھ ہی آگے چل کر حضرت اقدس تحریر فرماتے ہیں:

"اور اگر بالفرض والتقدیر تسلیم کر لیا جائے کہ الفاظ محفوظ نہیں، صحابی نے اپنے ہی الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کے مقصود کو ادا کیا ہے تب بھی حجت ہوگا اس لئے کہ صحابۂ کرام اعلیٰ درجہ کے عاقل، دانا اور قوی الحافظہ ہونے کے علاوہ زبان دان بھی تھے مزاج شناس بھی تھے قرائن مقالیہ اور حالیہ سے بھی باخبر تھے آپ کی مراد کسی تغیر و تبدل اور آپ کے کلام میں ادنیٰ تحریف کو اپنے لئے شقاوت سمجھتے تھے، لہٰذا ان حضرات نے آپ کی مراد سمجھ کر اپنے الفاظ میں بیان کی وہ بالکل مستند، معتبر اور تمام عالم کے لئے حجت ہو گی۔"

حضرت محترم کا طویل اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ اصل مسئلہ کہ حدیث وحی ہے یا نہیں وہ

حضرت کے پیش نظر نہیں تھا۔ وہ صرف روایۃ بالمعنی پر گفتگو فرما رہے تھے۔ انہوں نے روایۃ بالمعنی کے حق میں دلیل بھی تحریر کی ہے اور ان کی یہ دلیل واقعاً وقیع بھی معلوم ہوتی ہے کہ: ”کسی کے اقوال تو باللفظ نقل ہو سکتے مگر افعال اور احوال تو کوئی لفظ نہیں جن کو باللفظ نقل کیا جا سکے۔“

حضرت کے اس پرمعنی فقرہ کی وضاحت کے بارے میں عرض ہے کہ حدیث قولی میں حضور ﷺ کے وہ تمام اقوال آ جاتے ہیں جو حضور ﷺ نے احکام شریعہ کے طور پر ارشاد فرمائے ہیں۔ جیسے طلب العلم فریضہ علیٰ کل مسلم۔ یا خیرکم من لعلم القرآن وعلمہ۔ ومن استویٰ یوما فھو مغبون ان ارشاداتِ عالیہ کی روایۃ بالمعنی بھی ہو سکتی ہے۔

سنت فعلی میں عبادات وغیرہ کے تمام طور طریقے، افعال واعمال جو راویوں نے آپ کی طرف منسوب کر کے بیان کئے وہ سب حدیث فعلی کی مثال ہیں۔ یہ روایت باللفظ ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح تحویل قبلہ کی روایت حدیث فعلی ہیں جو باللفظ روایت نہیں ہو سکتیں۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ دوران نماز آپ نے نعلین مبارک اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ صحابہ نے بھی نماز کے دوران چپل اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ نماز کے بعد حضور ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ تم نے چپل کیوں اتارے صحابہ نے کہا ہم نے آپ کو دیکھ کر چپل اتار دیئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو جبریل نے بتایا تھا کہ میرے چپلوں میں گندگی ہے۔ یہ حدیث فعلی ہے جو نقل باللفظ نہیں ہو سکتی۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرامین پر مہر لگانے کے لئے ایک انگوٹھی بنوائی، تو صحابہ نے بھی انگوٹھی پہننی شروع کر دی، اس کے بعد آپ نے اس انگوٹھی کو اتار دیا اور فرمایا کہ میں یہ کبھی سونے کی انگوٹھی نہیں پہنوں گا تو صحابہؓ نے بھی پھینک دیں۔ (امام شافعی کا الرسالہ بحوالہ السنۃ ومکانتھا، مصطفیٰ حسنی، صفحہ 106)۔

یہ سب حدیث فعلی کی مثالیں ہیں جن کی روایت باللفظ نہیں ہوسکتی۔ بیان سکوتی کی مثال میں وہ تمام افعال و تقاریر آ جاتی ہیں جو صحابہؓ سے صادر ہوئے اور آپ نے پسند فرما کر ان پر سکوت اختیار فرمایا' ظاہر ہے کہ ان کی بھی روایۃ باللفظ نہیں ہوسکتی۔

اب حضرت اقدس کے بیان اور اس کی مندرجہ بالا توضیح سے آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہوگی کہ کتب احادیث' جن میں سب مہمات کتب شامل ہیں' ان کے الفاظ راویوں کے الفاظ ہیں۔ احادیث کی ان کتابوں کے الفاظ کا حضورﷺ کے الفاظ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے راویوں کے یہ الفاظ وحی نہیں ہوسکتے اور ہمارے علمائے کرام بھی تو عملاً شب و روز اس کی شہادت دیتے ہیں جبکہ وہ قرآن کریم کی تلاوت کے فوری بعد صدق اللہ العلی العظیم کہتے ہیں اور احادیث پڑھنے کے بعد او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام کہتے ہیں کے معنے یہ ہیں کہ حدیث کے الفاظ خود حضورﷺ کے الفاظ ہوتے ہیں انہیں بھی شک ہے اور یہ اقوال راویوں کے وہ اقوال ہیں جو منسوب الی الرسول ہیں۔ ان کی صحت و سقم کے لئے تو گفتگو ہوسکتی ہے لیکن ان کے وحی الٰہی ہونے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک اچھے لیڈر کا قرآنی معیار

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی راہنمائی کے لئے ایک مکمل' منفرد ضابطہٴ حیات عنایت فرمایا۔ زندگی کا ضابطہٴ حیات خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو' جب تک کہ ایک مخلص اور دیانتدار لیڈر اس تحریک کو لے کر نہیں اٹھتا' وہ ضابطہٴ حیات عملی نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کی جن قائدانہ صلاحیتوں کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے چند یہ ہیں کہ ایک اچھا لیڈر مردہ قوم کو زندہ کر دیتا ہے (3:49) وہ قوم پستی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاتی ہے (3:49)' انہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہوتی ہیں (7:176) اور اس قوم کی بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت مل جاتی ہے کہ وہ زندگی کی صحیح راہوں پر چلنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ کسی قوم کو جب تک اچھا راہنما نہیں ملتا وہ قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ جہاں قرآن کریم نے ہر ہر شعبہ میں راہنمائی فرمائی ہے' ایک اچھے لیڈر کی صفات و خصوصیات بھی بیان فرما دی ہیں' جس کی قیادت و راہنمائی میں ایک قوم عروج و اقتدار حاصل کرسکتی ہے۔

قرآن کریم نے ایک اچھے لیڈر کی پہلی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے: اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ (36:21)' ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ و معاوضہ نہیں مانگتے اور خود بھی راہِ راست پر چل رہے ہوں۔ اس آیت میں قرآن کریم نے ایک اچھے لیڈر کی دو نمایاں نشانیاں بیان فرمائی ہیں ایک اچھے لیڈر کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ کوئی معاوضہ طلب

نہیں کرتا' معاوضہ حاصل کرنے کی دسیوں صورتیں ہو سکتی ہیں' جن کو نہ تو تولا جا سکتا ہے اور نہ ہی گنا جا سکتا ہے۔ اس میں ضرورت سے زیادہ Privileges بھی آجاتی ہیں۔ اچھے اچھے قیمتی پلاٹس حاصل کرنا' بڑی بڑی کاریں لینا' زرعی اراضی اپنے نام لینا' بنکوں کے رقوم Write Off کرانا' یہ سب چیزیں اس اجرا میں آجاتی ہیں جو قرآن کریم نے منع فرمائی ہیں۔ اچھے لیڈر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود صحیح راستہ پر چل رہا ہو بے غرضی ایک شخص کی نیک نیتی کی شہادت تو ضرور ہے' لیکن مجرد نیک نیتی اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ وہ درست راستہ پر ہی چل رہا ہے۔ اس لئے کسی شخص کی نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی بات اس کی روشِ زندگی' اس کی عقل و دانش بھی درست ہے یا نہیں۔

صدرِ اول کے دور میں ہمارے عظیم راہنماؤں نے کسی طرح کا بھی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا پیشہ کپڑے کی تجارت تھا۔ جب وہ خلیفہ مقرر ہوئے تو ان کے پاس آمدنی کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد' ان کے لئے اس پیشہ کو جاری رکھنا بہت مشکل کام تھا۔ اس لئے باہم مشاورت کے بعد ان کا مملکت کی طرف سے وظیفہ مقرر ہوا۔ ان کا یہ وظیفہ' مدینہ کے ایک مزدور کی مزدوری کے مساوی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے تھے کہ میں اپنا وظیفہ مزدور کی آمدنی کے مساوی اس لئے لیتا ہوں تاکہ مجھے یہ دلچسپی ہو کہ مزدور کی آمدنی میں اضافہ ہو' تاکہ میرے وظیفہ میں بھی اضافہ ہو۔ کسی قسم کی کوئی سہولت یا Privilege ان کے لئے نہیں تھی۔ انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ انہیں ان کے پرانے کپڑوں میں ہی دفن کردیں۔ کفن کے لئے نئے کپڑے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت ایک اچھے راہنما کی یہ ہے کہ وہ نہ صرف قانون کا پابند ہو بلکہ دوسروں سے زیادہ قانون کی پابندی کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار مربع میل پر محیط مملکت کے سربراہ تھے' وہ وحی کے ایک ایک حکم کے پابند تھے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ (7:203) بلکہ وہ اَوَّلُ

الْمُسْلِمِیْنَ (6:163)۔قانون کے سب سے زیادہ پابند تھے۔قرآن کریم کی رو سے پبلک اور پرائیویٹ زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ زندگی ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اگر کسی کی ذاتی پرائیویٹ زندگی اچھی نہیں ہے تو اس کی پبلک لائف بھی اچھی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیکولر مملکت کا نظریہ ہے کہ پرائیویٹ لائف قابل احتساب نہیں ہے۔قرآن کریم کی رو سے ایسی کوئی تقسیم نہیں۔اچھے لیڈر کی پرائیویٹ لائف بھی اس طرح قابل احتساب ہے جیسے اس کی پبلک لائف ہوتی ہے۔

لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ وہ عہد و پیمان کا پابند ہو۔ارشاد ہوتا ہے:لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (61:2)۔تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو۔تمہارا یہ رویہ اللہ کے ہاں موجبِ سعادت نہیں ہے۔ایک لیڈر یا سربراہِ مملکت کے قول وقرار کی ساری قدر و قیمت اس کی وفاداری اور راستبازی نہیں ہے۔

آج کل کے دور میں لیڈروں کی سب سے بڑی کمزوری خوشامد پسندی اور تملق ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے کیا اس کی دل کھول کر تعریف کی جائے۔اس کے علاوہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو کام انہوں نے نہیں بھی کیا' اس کا Credit بھی ان کو دیا جائے اور ان کی تعریف کی جائے کہ آپ نے قوم کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:وَّیُحِبُّونَ اَن یُحْمَدُواْ بِمَا لَمْ یَفْعَلُواْ (3:188)۔(یعنی) جو کام وہ نہیں کرتے وہ چاہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے بھی ان کی تعریف کی جائے۔ جب کوئی قوم بے عمل و کاہل ہو جاتی ہے تو ان کے لیڈروں کا یہ ایک عام رویہ ہو جاتا ہے کہ وہ باتیں تو بڑی لمبی چوڑی اور پُرکشش کرتے ہیں لیکن ان باتوں کے مطابق کام بالکل نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ لوگ ان کی باتوں کی وجہ سے ان کے قصیدے پڑھیں یہ کمزوری صرف سیاسی راہنماؤں کی ہی نہیں ہوتی بلکہ مذہبی اور روحانی پیشوا بھی اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیڈروں کی اس کمزوری سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ لوگ ان کے منہ پر ان کی تعریف کرتے رہیں' لیکن بالآخر معاشرہ بالکل کھوکھلا ہو جاتا ہے۔اور اس کی وجہ سے پھر عوام تمام

لیڈروں کو ناپسند کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس آیۂ کریمہ کے مفہوم کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں حضورﷺ کی سیرت کی پختگی کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّهُمْ لاَ يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِيْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (6:33)-وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ ظالم آیاتِ خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔اس آیت کریمہ سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ تیرے مخالفین، تیرے صدق و صفاء راستی اور بلند کرداری کے تو معترف ہیں صرف تیری دعوت کے برحق ہونے پر شک وشبہ کرتے ہیں ۔اس آیت میں حضورﷺ کی سیرت کی انتہا کی بلندیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔مکہ کے کفار ومشرکین حضورﷺ کے ذاتی اعمال و افعال کی تکذیب نہیں کرتے تھے۔ وہ حضورﷺ کی انتہائی حدتک تعریف کرتے تھے البتہ یہ کہتے تھے کہ جونظریات و اقدار آپ دے رہے ہیں وہ سب غلط ہیں۔قرآنِ کریم نے اچھے لیڈروں کے اور بھی معیار بتائے ہیں، لیکن ہم ان چند پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں ساری دنیا کے لیڈر اور قائدین اچھی صفات سے بالکل عاری اور مبرا ہیں اور زیادہ تر لیڈر اپنے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ ان ہی مقاصد کے حصول کے لئے ساری عمر گذار دیتے ہیں۔ البتہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اس جَم غفیر میں بالکل اکیلی اور تنہا شخصیت تھے۔ جو پختگئِ سیرت میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ ہندو راہنما جوان کے سخت مخالف تھے، انہوں نے بھی قائداعظمؒ کی سیرت کی تعریف کی ہے۔جس طرح حضورﷺ کے مخالفین، ان کے نظریات و اقدار کی مخالفت کرنے کے باوجود حضورﷺ کی سیرت کے مداح تھے، اسی طرح قائداعظمؒ کے وہ مخالفین جو قیام پاکستان کے سخت دشمن تھے، انہوں نے بھی قائداعظمؒ کی دیانتداری، اخلاص اور راست گوئی کی تعریف کی ہے، حال میں جو کتاب بھارت کے سابق وزیر خارجہ جسونت سنگھ صاحب نے تحریر کی ہے وہ اس بات کی گواہ ہے۔ اس کتاب کے علاوہ جو تبصرے اس کتاب پر آئے ہیں وہ بھی اس

بات پر شاہد ہیں کہ قائداعظمؒ کے ہم عصر ہندو لیڈر' قائداعظمؒ کی سیرت پر رشک کرتے تھے۔

بھارت میں ایک مشہور اخبار ''ہندو'' نام سے انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان کے معروف اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ قیام پاکستان کے وقت بھی شائع ہوتا تھا اور اب بھی شائع ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ پر اس کو www.thehindu.com پر اب بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ قائداعظمؒ کی وفات 11 ستمبر 1947ء کو ہوئی تھی۔ دو روز بعد' یعنی 13 ستمبر 1947ء کی اشاعت میں' اس ''ہندو'' اخبار نے اپنا ایڈیٹوریل قائداعظمؒ پر ہی تحریر کیا ہے۔ ہمارے پاکستان کے مشہور اخبار The News نے ''ہندو'' کے اس ایڈیٹوریل کو' اپنی 24 اگست 2009ء کی اشاعت میں Verbative شائع کیا ہے۔ اس اداریہ سے پیشتر' اس کے تعارف کے طور پر چند کلمات ماری آنا بابر Mariana Baaber نے بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اس اداریہ کا عنوان "BJP's animosity towards Qauide Azam unending" یہ ایڈیٹوریل قائداعظمؒ کی پـــختـــگـــئـــیِ سیرت پر ایک واضح شہادت ہے۔ یہ ایک بڑا قیمتی Document ہے۔ اس اداریہ کی زبان بہت To the point, TERSE اور Forcible ہے اور ایجاز پر مبنی ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی فقروں کا مضمون سمو دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ بہت محنت طلب تھا' لیکن میں نے اس کی اہمیت اور قائداعظمؒ سے عقیدت و محبت کے پیش نظر' اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس لئے بھی کہ اب یہ اداریہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ایک مرتبہ اس کا ترجمہ رسالہ میں طبع ہو کر محفوظ ہو جائے گا۔ اب آپ اس کے چند تمہیدی فقرے ''ماری آنا بابر'' کے اور پھر اصل اداریہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ رواں ہو' اور پورا مفہوم ادا ہو گیا ہو۔ وھو ھذا.

بی جے پی' کے سینئر پارٹی ممبر مسٹر جسونت سنگھ نے جو کتاب قائداعظمؒ کے متعلق شائع کی ہے' اس میں انہوں نے قائداعظمؒ کو ایک وحشی شخصیت نہیں لکھا ہے۔ اس لئے اس کتاب کی

اشاعت کے بعد BJP نے آزادی فکر کا تو گلا گھونٹ دیا لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخبار ’’ہندو‘‘ نے جو اداریہ 13 ستمبر 1947ء کو تحریر کیا تھا اس کے لئے BJP کیا اقدام لے سکتی ہے کیونکہ اداریہ نے قائداعظم کے متعلق تحریر کیا تھا:

’’ہندو‘‘ کا اداریہ

’’اپنی سخت غم انگیز واندوہناک حالت میں بھی وہ یہ کبھی نہیں بھول سکے کہ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی بہت ضروری ہے‘ ان کی اچانک موت کی اطلاع سارے ہندوستان میں رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی۔ صرف بارہ ماہ پیشتر تک وہ سارے ہندوستان میں صرف مسٹر گاندھی کے بعد دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ طاقتور لیڈر رہتے۔ ان کی بڑی تعریف تھی‘ اگرچہ جو مقصد ان کے پیشِ نظر تھا‘ اس کو تعصب پر مبنی سمجھ کر اس کی تنقیص کی جاتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دوسری قومیتوں میں ان کی اپنی ذاتی کھری صفات کی تعریف کی جاتی تھی۔ چالیس سال تک وہ ہندوستان کی نمایاں شخصیت رہے۔ تقریباً اس کے نصف حصہ تک انہوں نے اپنے آپ کو کانگرس کے ساتھ اس قدر وابستہ رکھا کہ آزادیٔ جدوجہد میں وہ نہایت پسندیدہ شخصیت شمار ہوتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں‘ معمار پاکستان ہونے کی وجہ سے‘ ان کی قوم نے ان کی اندھی تقلید کی‘ اس لئے وہ اپنی قوم میں منفرد اختیارات کے حامل تھے۔ اگرچہ چند سنجیدہ طبقے ان کی فراست پر کچھ شک کرنے لگے تھے۔ ایک ایسا دور جس میں صدیوں پرانی سلطنتیں دم توڑ رہی تھیں‘ بمبئی کے اس قانون

دان نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔

سیکولرازم کے اس دور میں، اس مسلمان نے جو کبھی بھی مذہبی خیال نہیں کیا جاتا تھا، اس نے اسلامی حکومت بنانے کے نظریہ پر (اپنا) وقت ضائع کر دینا شروع کر دیا۔ اور ان کا یہ خواب جلد ہی صحیح ثابت ہو گیا اور جو کامیابی انہیں حاصل ہوئی ہے اس پر کسی اور کو اس قدر تعجب نہیں ہوا ہوگا، جس قدر تعجب انہیں خود اس کامیابی پر ہوا ہوگا۔ مسٹر جناح ایک نہایت زیرک وکیل تھے ان کی کامیابی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ہر صورتِ حال کے نتائج و اثرات کو تاڑ جاتے تھے، ان کی کامیابی کسی خاص اصولوں کو اختیار کرنے، یا کسی خاص فلسفۂ حیات کی وجہ سے نہیں تھی؛ بلکہ ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنی ساری توانائیاں صرف ایک ایسے مقصد کے لئے وقف کر دی تھیں، جو مقصد ہی دوسری طاقتوں نے ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ پورے تیس سالہ دور میں جس میں مہاتما گاندھی کو کوئی بھی قدم اٹھانے کا کلی اختیار تھا، اور جس دور میں انہوں (گاندھی نے) اپنے حالات سے مفاہمت بھی کی، وہ (قائداعظمؒ) ایک ہی مقصد پر جمے رہے۔

اس پورے دور میں قائداعظمؒ کے رویہ میں گاندھی کے رویہ سے ایک نمایاں فرق برقرار رہا۔ پاکستان کی ابتداء اقبال کے ایک شاعرانہ تخیل سے ہوئی ہے۔ رحمت الٰہی اور اس کے کیمرج کے انگریز ساتھیوں نے اس کو ایک عقیدہ اور ضابطۂ حیات مہیا کیا۔ حکومت برطانیہ کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی نصف صدی کی سیاست بھی اس مقصد کی طرف رواں تھی۔ جناح نے اصل کام یہ کیا کہ مسلم لیگ کے مردہ جسم میں جان ڈال

دی۔جس کی وجہ سے عوام کو اپنا خواب پورا کرنا آسان ہو گیا۔ایک ہی نسل میں دو عالمی جنگوں کے واقع ہونے سے بہت سی ریاستیں وجود میں آئیں اور برطانوی امارت کو انحطاط ہوا۔ یہ دونوں امور پاکستان بننے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ۔اس پر مستزاد یہ کہ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی جارحانہ عصبیت کو ایک راہنمائی عطا کر دی۔

یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ مسٹر جناح کی سیاسی زندگی کی ابتداءاس روشن خیالی کے ماحول میں ہوئی تھی جس کی داغ بیل وکٹورین دور کے سیاسی مدبرین نے ڈالی تھی۔انہوں (جناح) نے ہمیشہ انگلستان کی پارلیمینٹری ڈیموکریسی کا ساتھ دیا اور انہوں نے دیانتداری پر مبنی خطابت میں کمال حاصل کیا۔ منٹو مارلے اصلاحات کے دوران انگریزوں نے مسلمانوں کو کانگرس سے جدا کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے (جناح) اس کی سخت مخالفت کی۔عرصہ دراز تک وہ مسلم لیگ سے الگ رہے اور آخرکار جب انہوں نے لیگ میں شمولیت اختیار کی تو اس وقت بھی ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت پیدا کرنا ہی تھا ان میں اختلافات پیدا کرنا نہیں تھا لیکن مسٹر جناح کے پیشِ نظر ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ انہیں اپنی صلاحیتوں اور کامیابیوں پر بڑا زعم تھا اور بالکل ابتدائی زندگی میں ان کامیابیوں کے حصول نے ان کے زعم کو درست بھی ثابت کر دیا تھا۔ دوسروں کے اشاروں پر چلنا ان کو سخت ناگوار تھا۔ کانگرس اس زمانہ میں دادا بھائی نوروجی' مہتا' گوکھلے جیسی بلند و بالا شخصیات کے زیر اثر تھی۔اس کے علاوہ بھی بائیں بازو کے مسٹر تلک کا بھی

اس پر اثر تھا۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسٹر جناح نے کانگرس سے آہستہ آہستہ کنارہ کشی اختیار کی اور کچھ مواد جمع کیا جس سے وہ اپنے لئے ایک الگ پلیٹ فارم تیار کر سکیں۔ عین اس وقت جنگ عظیم (اول) شروع ہوگئی اور خود اختیاری کا خیال عام ترویج پا گیا۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر جو 14 نکاتی فارمولا پیش کیا تھا وہ کوئی وقتی حادثہ نہیں تھا بلکہ حالات کا تقاضا تھا۔

مسلمانوں کا دوسروں سے الگ ہوجانے کا خیال' اس زمانہ میں ان کے لئے مضحکہ خیز تھا۔ انہیں علی برادران کی تحریک خلافت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی' بلکہ وہ اس تحریک کو آگ سے کھیلنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ عوام کے جذبات کو بے لگام چھوڑنے سے خائف تھے' ان کے تاریخ کے مطالعہ نے ان کی یہ راہنمائی کی تھی کہ ایک مرتبہ اگر عوام کے جذبات بے قابو ہوجائیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کہاں پہنچے۔ اسی دوران وہ کانگرس سے بھی کنارہ کش رہے وہ آرام دہ زندگی گذارنے کے عادی تھے۔ انہیں ستّیہ گرہ اور قید کی صعوبتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کانگرس جو گاندھی جی کے زیرِ اثر تھی' اس سے ان کے اجتناب کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ عوام کے مشتعل جذبات کے نتائج سے خوفزدہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے سیاست سے سرد مہری اختیار کرلی لیکن اس دوران وہ نہایت گہری نظر سے سب باتوں کا جائزہ لیتے رہے۔ عوام سے رابطہ رکھنے کی کامیاب پالیسی سے جو گہما گہمی پیدا ہوئی اس سے وہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں جیسی پسماندہ قوم کو بھی مذہبی نعروں سے بیدار کیا جا

سکتا ہے۔

وہ ایک عقلمند انسان تھے۔فطری طور پر بھی اور اپنی پرورش کے اثر سے بھی' انہیں انارکی سے نفرت تھی۔ اسی لئے پہلی گول میز کانفرنس میں وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے ہندوستان کے لئے وحدانی حکومت کی حمایت کی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فیڈریشن ایسے مختلف اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں اختلافی میلانات موجود ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ کی بدقسمتی تھی کہ ایک ایسی شخصیت نے وہ پالیسی شروع کی جس سے ایک ایسا ملک تقسیم ہو گیا جو کہ قدرتی طور پر ایک تھا اور جس پالیسی کے انجام کی کوئی نشاندہی نہیں کرسکتا۔مسٹر جناح نے جن طاقتوں کی اندرونی حرکت کو جاری کیا تھا' وہ اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھے لیکن بدقسمتی سے وہ یہ کہنا پسند نہیں کرتے تھے کہ انہوں نے غلطی کی۔

جناح اپنے انتہائی عروج پر فوت ہوئے۔ وہ خود تاریخ میں اپنے مقام سے خوب واقف تھے۔لیکن زندگی کے آخری ایام میں انہیں پاکستان کا فکر ضرور ہوگا' وہ پاکستان جس کا وجود انہوں نے بخشا تھا۔'' (ترجمہ ختم ہوا)۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موجودہ دور میں تبلیغ اسلام کا طریقہ

اسلام ساری دنیا کے لئے واحد ضابطۂ حیات ہے۔ صدر اول میں یہ حضورﷺ اور آپﷺ کے ساتھیوں کی کوششوں اور قربانیوں کی وجہ سے بطور ایک نظام حیات کے قائم ہوا اور غلبہ حاصل کرتا رہا۔ اس نظام کا عملی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اتباع سے دنیاوی مقاصد از خود حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان دنیاوی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کے اتباع کے علاوہ اور کسی بھاگ دوڑ اور کوشش کی ضرورت باقی ہی نہیں رہتی۔ یہ امور دین کا خاصہ ہوتے ہیں۔ مذہب کا ان سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ہمارے برصغیر ہندوپاک میں بھی اسلام آیا لیکن یہ اسلام چونکہ ایران کے راستہ سے صوفیاء کی معرفت آیا تھا، اس لئے برصغیر میں یہ داخل ہی مذہب کی حیثیت سے ہوا۔ اس لئے ہم مسلمان دینی مسلمان کبھی بھی نہیں ہو سکے۔ اسی وجہ سے انسانیت کی بھی کوئی خدمت نہیں کر سکے۔ ہاں اگر اس برصغیر میں اسلام بطور دین کے داخل ہوتا اور یہاں کے شروع کے مسلمان بادشاہ، غیاث الدین بلبن، محمد تغلق وغیرہ اسلام کا نظام جاری کرتے تو یہاں اسلام سُرعت کے ساتھ پھیلتا۔ اور یہاں کی ساری آبادی، پشاور سے راس کماری تک مسلمان ہو جاتی۔ دین کی تو شان ہی یہ ہوتی ہے کہ: یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجاً (110:2)۔ لوگ دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہیں۔ جس قدر درخشندہ نتائج اس نظام کے زیادہ ہوتے چلے جاتے۔ اسی قدر یہاں کے عوام اس نظام کی طرف کشاں کشاں کھچے چلے آتے لیکن افسوس نہ تو

یہاں کے بادشاہوں نے یہ نظام قائم کیا اور نہ ہی یہاں کے بڑے بڑے صوفیاء کرام نے ان بادشاہوں کو اس طرف راغب کیا۔ ہمارے یہ بادشاہ چونکہ خود توہم پرست تھے' اس لئے وہ خود بھی ان اولیاء وصوفیاء کے زیر اثر ہوتے تھے۔ وہ جنگی مہمات پر جانے سے پیشتر' ان سے مشورہ کرتے تھے اور ان کی Bles sing s لے کر مہمات پر روانہ ہوتے تھے۔ یہ صوفیاء کرام ان بادشاہوں کو مظالم سے روکتے تھے اوعدل وانصاف کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔ لیکن دقت تو یہ تھی کہ خود ان صوفیائے کرام کے سامنے ''مذہب'' کا تصور تھا۔ وہ بادشاہوں کو کس طرح دین کے قیام کی ترغیب دے سکتے تھے۔

اس برصغیر میں تو جو کچھ ہوا' اس کے لئے صرف کفِ افسوس ہی مل سکتے ہیں۔ اب اس کا کسی طرح بھی مداوا نہیں ہوسکتا۔ اس دور میں امریکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ چند سال پیشتر صدر مشرف کے دورہ امریکہ کے بعد ایک اعلامیہ صدر مشرف اور صدر بش کے دستخطوں کے ساتھ جاری ہوا تھا۔ جس میں دونوں صدور نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ آج کل امریکہ میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ آپ کو goo gle سے بھی یہ اطلاع مل سکتی ہے کہ آج کل امریکہ میں اوسطاً روزانہ پانچ سو آدمی مسلمان ہو رہے ہیں۔ یہ خبر یقیناً خوش آئند ہے لیکن حیرت اور تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان خوش نصیب اور نیک بخت حضرات کو مسلمانوں کی کون سی ادا لبھاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ان کی تبلیغ کے زیر اثر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ہم موجودہ مسلمانوں کے زیادہ تر عقائد' خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے Irr ation al ہیں' ایصالِ ثواب' استمداد عن الموتیٰ' حجِ بدل' نزول مسیح' دجال کی آمد' روح کے متعلق تمام نظریات' معجزات ان میں سے کون کون سا عقیدہ ایسا ہے جو غیر مسلموں کو اپیل کرتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کی اپنی موجودہ حالت ہے' اس کے لئے 'صورت بین حالت مپرس'' والا محاورہ صادق آتا ہے۔

ہمارے اپنے معاشرے میں بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جو بالکل سیکولر مزاج

رکھتے ہیں اور مذہب سے برگشتہ ہیں۔ یہی علماء کرام اور تبلیغی جماعت کے عمائدین ان کو اسلام کی طرف راغب کرتے ہیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ان تمام عقائد میں سے ایک عقیدہ بھی ان کو متاثر نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں جو حضرات مسلمان ہو رہے ہیں وہ اپنے معاشروں سے تنگ ہو کر اس درجہ عاجز ہو گئے ہیں کہ وہ ان عقائد کو ہی غنیمت سمجھتے ہیں۔ کافی عرصہ پیشتر لندن میں ایک انگریز خاتون سے میں نے دورانِ گفتگو اپنے ایک دوست کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ دوست چھ فٹ سے زیادہ بلند قامت ہے۔ اس پر ان خاتون (Mrs. Keith) نے مجھے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا اور کوئی شخص 6 فٹ سے زیادہ قامت کا نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان خاتون کی اس بات پر حیرت ہوئی اور میں نے اس کی وجہ دریافت کی، انہوں نے کہا کہ چونکہ حضرت عیسیٰؑ 6 فٹ کے تھے۔ اس لئے اب کوئی شخص ان سے زیادہ بلند قامت نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان خاتون کی بات پر حیرانی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ دو تین سال بعد مجھے ان کی ایک خاتون دوست نے بتایا کہ Mrs. Keith مسلمان ہو گئی ہیں۔ اس واقعہ کو نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عموماً ایسے مبلغ علم کے لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایک مشہور کتاب "Why I became a Muslim" کافی عرصہ پیشتر طبع ہوئی تھی۔ وہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں ان ایک سو حضرات کا ذکر ہے جو اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان ایک سو حضرات میں بعض حضرات تعلیم یافتہ اور بلند پایہ بھی ہیں۔ آپ اگر اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کسی ایک شخص نے بھی اپنے مسلمان ہونے کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ کسی نے بھی قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کی کوئی دلیل نہیں دی۔ ان حضرات میں سے ہر شخص صرف اس لئے مسلمان ہوا ہے کہ وہ فوجی ہونے کی وجہ سے یا Foreign Service میں ہونے کی وجہ سے مسلم ممالک میں آ گئے تھے اور ان ممالک کی معاشرت اور لوگوں کے حسنِ سلوک کی وجہ سے وہ مسلمان ہو گئے تھے۔

مسلمانوں یا غیر مسلموں میں پہلے مناظرہ یا تبلیغ کا یہ طریقہ تھا کہ ہر مذہب والے اپنے عقائد یا رسوم عبادت کی برتری وفوقیت ثابت کرتے تھے اور اپنے عقائد کو بہتر ثابت کر کے' اپنے مذہب کو سچا ثابت کرتے تھے۔ یہ مذہب کا طریقہ تھا۔ اب بھی امریکہ اور دیگر ممالک میں ہمارے مسلمان بھائی اور مولوی صاحبان اسی طرح تبلیغ کرتے ہیں لیکن یہ طریقہ مذہب کا ہے۔ دین پیش کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ آپ براہ راست دین پیش کریں اور اس سلسلہ میں یہ واضح کریں کہ آج تمام دنیا کے معاشروں میں جو اضطراب اور بے چینی ہے وہ معاشرہ کا غلط اقدار پر قائم ہونے کی وجہ سے ہے اور دنیا کے تمام مصائب ان غلط اقدار پر معاشروں کی تعمیر کی وجہ سے ہیں۔ اسلام دنیا کے تمام مصائب ومشکلات کا حل پیش کرتا ہے اور ان اقدار پر معاشرے کو تعمیر کرتا ہے جن سے انسانیت کو سکون و اطمینان حاصل ہوسکتا ہے اور ہر شخص پر امن زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اسلام جو معاشرہ تعمیر کرتا ہے' اس کے نتائج اس دنیا میں ہی سامنے آجاتے ہیں۔ اگر وہ نتائج برآمد نہ ہوں تو اسلام جھوٹا مذہب ہے اور اگر وہ نتائج اس دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں تو اسلام بلاشبہ ایک سچا اور مبنی بر صداقت ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام کو مذہب کی حیثیت سے اس لئے اختیار نہ کیا جائے کہ اس سے آخرت درست ہوتی ہے' بلکہ اسلام اس وقت کی ضرورت ہے' اس کے قیام سے اس دنیا میں امن واطمینان حاصل ہوگا' اس کے بعد آپ قرآن کریم کی ان اقدار کی وضاحت فرمائیں جن کی تلاش کے لئے انسانیت سرگرداں اور بے چین ہے اور جن اقدار کو اپنانے سے دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جائے گی۔

(1) اسلامی نظام میں سب سے پہلے انسانیت کی تکریم کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً (17:70)۔ ہم نے انسانیت کو عزت بخشی اور اس انسان کو قوانین طبعی کا وہ علم دیا جس کی بنا پر خشکی اور تری میں جتنی

بھی فطرت کی قوتیں ہیں وہ سب اس کی تابع تسخیر ہوگئیں اور اسے نہایت خوشگوار سامان حیات دیا گیا۔اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں اس میں ملک اور کسی زبان کی تمیز نہیں ۔مطلق انسان واجب التکریم ہے۔کسی ملک یا نسل کا ہونا صرف اضافی چیزیں ہیں۔نہ کوئی بچہ گناہ کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔انسان کے واجب التکریم ہونے کے حق میں کسی قسم کی بھی کوئی تفریق وتمیز نہیں ہے۔انسان جو جرم کرتا ہے تو اس صورت میں بھی وہ قابل نفرت نہیں بن جاتا' بلکہ اس کا جرم قابل نفرت ہوتا ہے۔انسان قابل نفرت نہیں ہوتا۔جرم کے ارتکاب کے بعد بھی وہ بنی آدم ہی ہوتا ہے۔جب اسے سزامل گئی یا اس نے اس جرم سے اجتناب کرلیا وہ پھر اسی طرح کا ہوگیا جیسا کہ وہ سابق میں تھا۔اس اصول کی روح یہ ہے کہ وہ ممالک جو زیادہ طاقتور ہیں اور مرفہ الحال ہیں۔انہیں غیر ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک سے پیش آنا چاہئے۔سعدی نے کہا ہے:

آدمیت احترام آدمی۔باخبر شو از مقام آدمی

اسلامی مملکت میں اگر ایک آدمی کی بھی عزت مجروح ہوگی یا اسے رزق مہیا نہیں ہوگا تو وہ اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔

(2) اسلامی نظام سے متعلق دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام کے نزدیک ساری دنیا کے انسان ایک امتِ واحدہ ہیں۔تمام انسانیت کا مفاد اور نقصان مشترک ہے۔ارشاد ہوتا ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213)-ساری انسانیت ایک امتِ واحدہ ہے۔زمین پر خود ہی اپنے ہاتھوں سے لکیریں کھینچ کر' اپنے آپ کو مختلف حصوں اور گروہوں میں بانٹ کر آپس میں لڑنا' یا اپنے اپنے مفادات میں تصادم پیدا کرنا' خود اپنے لئے مصائب پیدا کرنا ہے۔یورپ کی گذشتہ دو جنگیں' جنہوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا' اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ انسانیت کو پارہ پارہ کر کے' ایک دوسرے کو قتل وغارت کرنا شروع کر دیا۔ان دونوں جنگوں کے دوران برصغیر

ہندو پاک انگریزوں کے زیر تسلط تھا۔ برٹش گورنمنٹ یہاں کے غریب و نادار عوام کو فوج میں بھرتی کرتی تھی وہ فوجی سپاہی جنگ کے دوران فرنٹ پر کام کرتے تھے۔ وہ مخالف فوج کے ان سپاہیوں کو قتل کرتے تھے، جنہیں انہوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا' ان کا اس سے پیشتر کبھی آمنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ مخالف فوج کے سپاہی کو قتل کرنے کا سنگین جرم وہ صرف اس لئے کرتے تھے کہ وہ افلاس ونا داری کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اوران کے افلاس نے انہیں فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ساری غارت گری انسانیت کو مختلف اقوام میں تقسیم کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک کروڑ سے زیادہ آدمیوں کا قتل ہوا تھا۔ اسلامی نظام کے سامنے ساری انسانیت ایک امت واحدہ ہے۔ ہر ملک کو دوسرے ملک کی مدد کرنی چاہئے۔ خواہ وہ ملک مسلم افراد پر مشتمل ہو یا غیر مسلم افراد پر۔ مختلف ممالک کے درمیان انسانیت ہی وجۂ اشتراک ہو گی۔ امریکہ کے سامنے اگر اسلامی نظام کا یہ نکتہ پیش نظر ہوتا تو وہ کبھی ویت نام' عراق' کوریا وغیرہ میں بربادی وتباہی کا ارتکاب نہ کرتا۔

(3) اسلامی نظام کی تیسری خصوصیت اس کا عدل قائم کرنا ہے: **يَـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُوا كُـونُـوا قَـوَّامِيْـنَ لِـلّٰـهِ شُهَـدَاء بِـالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى اَلاَّ تَعْدِلُوا اعْـدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوَى** (5:8)۔ اے ایمان والو عدل قائم کرو اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کر سکو (دوسری قوموں) سے عدل کرو انصاف کرو۔ یہی تقویٰ کے قریب ہے' آپ غور فرما رہے ہیں کہ دوسروں قوموں کے ساتھ عدل وانصاف کرنا ہی سب سے بڑی عبادت وتقویٰ ہے۔ تقویٰ پرہیز گاری ہی نہیں ہے' تقویٰ دوسری قوموں سے عدل کرنا ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ تمام شہریوں کے درمیان عدل وانصاف ہو کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ انصاف کرنے میں گورے' کالے اور نسل پرستی' وطن پرستی' مذہب کا اختلاف' رتبہ اور مرتبہ کا تفاوت کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے' کیونکہ

اسلامی نظام کا عدل پر مبنی ہونا ہی تقویٰ ہے۔ یہی عدل وانصاف اور تقویٰ تمام دینِ وشریعت کی روح ہے۔اس سے موافقت رکھنے والا طرزِ عمل یہی ہے کہ دشمن کی دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ کوئی معاملہ عدل وحق سے ہٹ کر نہ کیا جائے۔اگر اس اصول کو بین الاقوامی قانون کی اساس و بنیاد قرار دے دیا جائے تو کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی قوم کے ساتھ بھی کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی۔ اسلامی حکومت کی اساس ہی توحید کے عقیدے پر ہوتی ہے۔وحدتِ خالق کے ایمان کا فطری اور عملی نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔اس لئے اس نظام کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس میں ہر شہری کو عدل مہیا ہوتا ہے اور اپنی مملکت کے علاوہ دوسری مملکتوں سے بھی عدل اور انصاف کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

اس دور میں اسلام کی تبلیغ کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے نظامہائے حیات کے نقائص واضح کئے جائیں اور ثابت کیا جائے کہ آج تک جتنے بھی نظام ہائے حیات انسان نے وضع کئے کسی ایک نظام سے بھی انسانیت کو سکون حاصل نہیں ہوسکا۔انسانیت کی آخری پناہ گاہ صرف قرآن کریم کے پیش کردہ نظام میں مل سکتی ہے۔

اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ دور کی ان مشکلات کی نشاندہی کی جائے جن سے آج انسانیت دوچار ہے اور عقل انسانی ان کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔اس کے بعد ان مشکلات کا حل قرآن کریم سے پیش کیا جائے اور ان کا جو حل پیش کیا جائے اس کی تائید میں قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دیا جائے۔اس صورت میں تبلیغ اسلام کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔محض اوراد و وظائف اور فضائل بیان کرنے سے اسلام کی تبلیغ کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

ہر حکومت کے قانون کی اساس اس کے مصالح Expediencies پر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں NRO ،قرضوں کی معافی کے قوانین، حکومتی مصالح کی بہترین مثالیں ہیں۔سیکولر حکومتوں میں عدل سے مفہوم قانون مروجہ کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔مثلاً جب امریکہ میں

شراب نوشی قانوناً منع تھی تو شراب خور کو سزا دینا عدل و انصاف تھا' اس دور میں جبکہ امریکہ میں قانون انسداد شراب منسوخ ہو گیا ہے' تو شراب خور کو سزا نہ دینا عدل ہو گیا ہے۔ انگلستان میں جب تک ہم جنس پرستی منع تھی' وہاں ہم جنس پرستی Homosexuality کی سزا ہوتی تھی' اب وہاں ہم جنس پرستی قانوناً جائز ہے اس لئے اس کی کوئی سزا نہیں ہے۔ سیکولر حکومتوں میں عدل و انصاف اضافی ہوتا ہے۔ عدل کی کوئی مطلق Absolute حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ ایک فیصلہ ایک دور میں عدل پر مبنی ہوگا' دوسرے دور میں وہی فیصلہ عدل شمار نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف دین کی اساس ضابطۂ انسانیت پر ہوتی ہے۔ دین میں عدل سے مراد یہ ہے کہ اس مملکت کے ہر فرد کو اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے وسائل وذرائع یکساں فراہم ہوں' ہر شخص اپنی مضمر صلاحیتوں کو پوری طرح جلا دے کر' اپنی صلاحیتوں کے مطابق مقام حاصل کرے۔ مضمر صلاحیتوں کو اس طرح جلا دینا ہے تزکیہ نفس ہے۔ تزکیہ نفس زاویوں اور گوشوں میں مذہب میں ہوتا ہے' دین میں تزکیہ نفس اس طرح ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

معاشرہ کو متوازن رکھنے کے لئے قرآن کریم نے انسان کے اختیار کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کے اختیارات کی چند حدود و قیود بھی مقرر کر دی ہیں جن کے دائرہ کے اندر انسان اپنے اختیارات استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان حدود کو حدود اللہ کہا ہے۔ ان حدود کا ایک اعجاز یہ ہے کہ جب کسی مملکت میں اس کے باشندے اپنے اختیارات ان حدود کے اندر اندر استعمال کریں گے تو انسانی اختیارات کے استعمال سے باہمی مفادات میں تصادم پیدا نہیں ہوتا بلکہ حدود اللہ کے دائرہ کے اندر استعمال شدہ اختیارات تمام باشندگان مملکت کی نشوونما کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور یہ نشوونما صرف ان کے جسم تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ان کی طبعی صلاحیتوں کو بھی جلا ملتی ہے۔ یہ موضوع بڑے گہرے مطالعہ کا متقاضی ہے' اور اسی قدر یہ موضوع تبلیغ میں ممد و معاون بن سکتا ہے۔

اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو کچھ اب تک تحریر کیا گیا ہے' اس کا تعلق انفرادی کوششوں سے ہے' جو امریکہ یا دوسرے غیر مسلم ممالک میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کا بہترین طریقہ جو خود قرآن کریم نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عملاً کسی خطۂ زمین پر رائج کر دیا جائے (10:39)۔ اس طرح اس نظام کے درخشندہ نتائج' اس نظام کے بے مثال ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوں گے اور اس نظام میں لوگ فوج در فوج داخل ہوں گے (110:2)۔ اور جو کوئی بھی اس نظام میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا (3:97)۔ اس نظام کے ثمرات و برکات کو دیکھ کر دوسرے نظام خود برف کی طرح پگھل جائیں گے۔ اس نظام کی جڑیں پاتال تک محکم و استوار میں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولتی ہیں اور یہ ہی وہ ایک نظام ہے جس سے ہر زمانہ میں اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں (14:24)۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روحانیت کا مذہبی تصور

عربی زبان میں عبادت کے معنے ایسی اطاعت کے ہیں جو دل کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ چنانچہ عبادت کی یہی تعریف عربی لغاۃ میں دی گئی ہے۔ **العبادۃ، الطاعۃ مع الخضوع.** یعنی عبادت اسی اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہو۔ قرآن کریم نے بھی عبادت کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اس کو تحریر کرلیا کرو (2:282)۔ جب ہم قرض کے لین دین کے موقع پر قرآن کریم کی اس ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہیں، تو یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم نے حکم دیا کہ دوسرے کے گھروں میں بغیر اہل خانہ کی اجازت کے داخل نہ ہو (24:27)۔ جب ہم اس حکم کے مطابق دوسروں کے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تو ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے ہر حکم کی اطاعت، عبادت خداوندی ہے۔ جب اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے اور وہ حکومت کی ایڈمنسٹریشن کے لئے قرآن کریم کے احکامات جاری کرتی ہے تو اس حکومت کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ پھر پرستش کی کوئی گنجائش رہتی ہی نہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اگر آپ ان احکامات کی اطاعت غیر اسلامی حکومت میں کر رہے ہیں، تو وہاں اللہ کی عبادت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مسلمان ہندوستان یا انگلستان میں دوسروں کے گھروں میں داخل نہیں

ہوتا' تو یہ عبادت خداوندی نہیں ہے' اور نہ ہی اسے کوئی ثواب حاصل ہوگا۔ کیونکہ وہاں وہ دوسروں کے گھروں میں اس لئے داخل نہیں ہوتا کہ یہ عمل وہاں کے قانون کے خلاف ہے اور پولیس اس کے خلاف ایکشن لے گی۔ اگر ہندوستان میں کوئی مسلمان قرض کے لین دین کے وقت اس کو تحریر میں لے آتا ہے تو وہ قرآنی حکم کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ وہ Law of the Land کی اطاعت کرتا ہے' کہ اس تحریر سے اس کو مقدمہ کے وقت فائدہ ملتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر ہندوستان میں شراب ممنوع قرار دے دی جائے تو یہ حکم اسلامی نہیں بنے گا۔ نہ اس کی اطاعت' عبادت خداوندی ہو گی۔ قرآنی احکامات کی اطاعت صرف اسلامی حکومت میں ہوسکتی ہے۔ اور اللہ کی عبادت بھی صرف اسی کے ذریعے سے ہوسکتی ہے۔

عبادت کے اس مفہوم کے پیش نظر کہ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے' پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پرستش کا تصور مذہب میں ہے۔ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو قوم پرستش کی قائل ہو گی۔ اس میں دین کا کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم مسلمانوں میں پرستش کا دارومدار ''روح'' اور ''روحانیت'' کے خلافِ قرآن عقیدے پر قائم ہے اسی روحانیت پر تصوف' الہام' کشف وغیرہ کی عمارت قائم ہے۔ جو بالکل دین کی ضد ہیں اور جو عبادت کو پرستش میں محصور و محدود کر دیتے ہیں۔ روحانیت کا سارا تصور سابقہ مذاہب' خصوصاً عیسائیت کے زیر اثر ہماری روایات میں آیا ہے اور پھر روایات کے ذریعے تفاسیر میں راہ پا گیا۔ آپ روحانیت کے اس تصور کو بغور ملاحظہ فرمائیں آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ روحانیت کے اس تصور اور اس کے فروغ نے ہی مسلمانوں کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ یہ موضوع چونکہ خشک اور غیر دلچسپ ہے' اس لئے اس کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

روایات کے پیش کردہ عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں کروڑوں کی تعداد میں

روحیں پیدا کرلی تھیں۔ اب جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو ارواح کے اس ذخیرہ میں سے ایک روح کو لے کراس بچہ کے جسم میں داخل کر دیا جا تا ہےاور جب کوئی انسان فوت ہوتا ہےتو یہ روح اس کے جسم سے نکل کر عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ تین روایات خود ملاحظہ فرما لیں۔

(1) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس (آدم) کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ پس اس کی پشت سے ارواح گریں جن کا اللہ خالق ہے۔ آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک۔ (مشکوٰۃ شریف)

(2) مسلم بن یسار سے روایت ہے اس نے کہا عمر بن خطاب سے پوچھا گیا اس آیت سے **وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ** (7:172) الخ۔ کیا عمر نے یہی سنا رسول اللہﷺ کو آپ سوال کئے گئے اسی آیت سے پس آپ نے فرمایا کہ تحقیق پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدم کو پھر داہنا ہاتھ پھیرا اس کی پشت پر پس نکلی اس سے اولاد۔ (مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر)۔

(3) عن ابی الدرداء عن النبیﷺ قال خلق الله آدم عین خلقه فضرب كتفه اليمنى فاخرج ذرية بيضاء كانه الذر و ضرب كتفه يسرى فاخرج ذريه سوداء كانه الحمم۔ (ترمذی شریف ابوداؤد شریف)۔

(ترجمہ)۔ ابودرداء سے روایت ہے انہوں نے فرمایا پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جس وقت کہ اسے پیدا کیا۔ پس ہاتھ پھیرا اس کے

دائیں شانہ پر تو نکالی (سفید فام) اولاد مور چہ کی مانند' اور ہاتھ پھیرا اس کے بائیں شانہ پر تو نکالی (سیاہ فام) اولاد کوئلوں کے مانند۔

ہمارے علماء کرام نے یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل ابتداء میں ارواح کا ایک ذخیرہ بنا لیا تھا۔ سورۂ اعراف کی ایک آیہ کریمہ سے اخذ کیا ہے جس کی تفسیر کے بارے میں آپ نے مندرجہ بالا تین احادیث ملاحظہ فرمائیں۔ یہ تین احادیث اور اسی مضمون کی چند اور احادیث ہیں جو اس آیت کو سمجھنے میں نہ صرف رکاوٹ بنی ہیں بلکہ انہوں نے ہم مسلمانوں میں ایک خلافِ قرآن عقیدہ کی بنیاد ڈالی جس نے مسلمانوں کے زوال و ادبار میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ ذاتی' انفرادی نجات کا تصور بھی اسی عقیدہ کا رہینِ منت ہے جس سے خود غرضی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ اس آیت کو مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں پھر اس کی مذہبی (Please read misleading) تفسیر' اور اس کے نتائج پر غور فرمائیں۔ ارشاد عالی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِیْ آدَمَ مِن ظُھُورِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلَی اَنفُسِھِمْ اَلَسْتَ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلَی شَھِدْنَا اَنْ تَقُولُوْا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھَذَا غَافِلِیْنَ (7:172)-

(ترجمہ) اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے' ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں' بولے ہاں تو ہمارا رب ہے ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

یہ ہے وہ آیہ کریمہ جو آپ نے مع ترجمہ ملاحظہ فرمائی ہے۔ اس آیت سے ہمارے علماء کرام یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کائنات بنانے کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے ارواح کا ایک ذخیرہ بنا لیا

تھا اوران سب ارواح سے اپنی توحید کا اقرار کرا لیا تھا۔ اس کو ''روز میثاق''۔ ''یوم ذر''۔ ''یوم الست'' کہا جاتا ہے۔ علماء کرام کا خیال ہے کہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کے طور پر کیا ہے۔

ہمارے علماء کرام اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں کہ زندگی (The Life) آہستہ آہستہ رینگتے رینگتے جرثومۂ حیات سے چل کر انسانی پیکر میں آئی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں تو نوع آدم کا ذکر کیا ہے' اور کہیں نسل آدم کا۔ ہمارے علماء کرام نے اپنی تفاسیر میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قرآن کریم کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی''۔ جبکہ حدیث میں یہ ہے کہ ''اللہ نے آدم کی پیٹھ سے اس کی اولاد نکالی''۔ نیز یہ کہ قرآن میں ظھــورھــم کا لفظ آیا ہے' جو جمع پر دلالت کرتا ہے' جبکہ حدیث شریف میں مِن ظھرہ (اس کی پیٹھ سے) تحریر کیا گیا ہے۔ آیت زیر نظر میں آدم کی اولاد کا تذکرہ نہیں بلکہ بنی آدم کی اولاد کا تذکرہ ہے۔ ان روایات کی وجہ سے اس آیت کی صحیح تفسیر ہی نہیں ہو سکی۔ علمائے کرام کی اس تفسیر میں عربی قواعد کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے اور حضرت آدمؑ کی اکیلی پشت سے بیک وقت ساری اولاد کو نکالنے کا تصور دیا گیا۔ حالانکہ یہ اولاد بنی آدم کی پیٹھوں سے روزانہ نکلتی چلی جا رہی ہے۔

آیت کی تفسیر میں علماء کرام نے عربی قواعد میں غلطی کی ہے اور جو الفاظ حال و مستقبل کے معنے دیتے ہیں' انہیں صرف ماضی تک محدود کر دیا ہے۔ عربی قواعد کی بحث ذرا Technical اور اُکتا دینے والی ہے اس لئے اس سے صرفِ نظر کر کے' آیت کا سادہ مطلب' ''مفہوم القرآن'' سے پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے۔

> ''بنی آدم کی نسل کا سلسلہ پشت ہا پشت سے جاری ہے ان کا وجود خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ کائنات میں خدا کا قانونِ نشو ونما کارفرما ہے۔ ہر نیا

پیدا ہونے والا بچہ اس حقیقت کی ناطق شہادت ہے۔ہم یہ دلائل وشواہد اس لئے تمہارے سامنے لا رہے ہیں کہ جب تمہارے تخریبی اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آئیں تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا''۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر انسانی بچہ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔

(1) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّن طِيْنٍ الخ(23:12)-

(ترجمہ)اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ جگہ(رحم) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں ۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔

(2) هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلاً (6:2)-

(ترجمہ)اللہ وہ ہے جو پیدا کرتا ہے تم کو گیلی مٹی سے ۔ پھر مقرر کرتا ہے تمہاری زندگی کی مہلت۔

(3) هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلاً (40:67)-

(ترجمہ)اللہ تعالیٰ وہ ہے جو تم کو پیدا کرتا ہے حقیر مٹی سے ۔ پھر اس سے نطفہ سے پھر اس سے جمے ہوئے خون سے ۔ پھر نکالتا ہے تمہیں لڑکا۔

(4) وَاللّٰهُ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجاً (35:11)-

(ترجمہ) اللہ تم کو پیدا کرتا ہے مٹی سے۔ پھر اس بنے ہوئے نطفہ سے، پھر بناتا ہے تم کو جوڑے۔

اس کے علاوہ تقریباً پندرہ اور مقامات پر بچہ کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کسی ایک جگہ بھی روح کے اِدخال کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوسکتا کہ روح بچہ کے اندر داخل کی جائے اور قرآن نے اس کے ذکر کو نظر انداز کر دیا ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی توجہ کے قابل یہ ہے کہ نطفہ تو خود زندہ ہوتا ہے، مادۂ تولید زندہ ہوتا ہے، اس کا ایک ایک جرثومہ زندہ ہوتا ہے، اس میں زندگی کے لئے روح ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، ہماری روایات کے مطابق جنین چار ماہ تک مردہ ہوتا ہے، پھر چار ماہ بعد اس میں روح ڈالی جاتی ہے اور پھر جنین میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب جنین مردہ ہوتا ہے تو وہ پیٹ کے اندر مردہ صورت میں یہ مراحل کیسے طے کر لیتا ہے، یہ نظریہ چونکہ بدیہات کے خلاف ہے، اس لئے گذشتہ زمانہ میں تو چل سکتا تھا کیونکہ ہمارے مفسرین کو اس بارے میں معلومات بہت کم تھیں۔ اب تو موجودہ صورت یہ ہے کہ آپ Physiology کی کوئی ابتدائی کتاب جو O`Level میں داخل نصاب ہو، اس کا سرسری مطالعہ فرمائیں آپ کو ساری معلومات جنین سے متعلق مل جائیں گی۔ یا google میں جا کر Ovum, Featus, Embryo درج کر کے معلومات حاصل کر لیں تو آپ کو جنین کی صحیح صورت حال معلوم ہو جائے گی اور آپ کو اندازہ ہو گا کہ ہمارے مفسرین کرام نے معلومات کی کمی کی وجہ سے کس طرح روایات کے مندرجات کو تسلیم کر لیا ہے۔

جسم انسانی میں روح نہ ہونے کے نظریہ کی تغلیط کے لئے ہمارے مفسرین نفخ روح والی آیات سے استدلال کر کے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی جسم میں روح ہوتی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ نفخ روح کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے۔

نفخِ روح کے متعلق قرآن کریم میں صرف تین مندرجہ ذیل آیات آئی ہیں۔

(1) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِىْ فَقَعُواْ لَهٗ سَاجِدِيْنَ (15:29)-

(ترجمہ) تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

(2) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِىْ فَقَعُوا لَهٗ سَاجِدِيْنَ (38:72)-

تو جب میں اس کو درست کر لوں، اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔

(3) ثُمَّ سَوّٰاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (39:9)-

پھر اس کو درست کیا اور اپنی روح پھونکی اور تم کو سماعت، بصارت اور عقل دی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے قرآن کریم میں نوع آدم کی ابتدا کی آیات اور نسلِ انسانی کی پیدائش کی آیات الگ الگ آئی ہیں چونکہ ہمارے علمائے کرام زندگی کے آہستہ آہستہ پیکر انسانی میں آنے کے قائل نہیں ہیں اور ان کے خیال میں آدم ایک Finished Product کے طور پر ایک مرتبہ ہی عالم وجود میں آ گیا۔ اس لئے وہ ان آیات کا اطلاق بچوں کی پیدائش پر کر دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں تمثیلاً نوعِ انسانی کی پیدائش کا ذکر ہے کہ جب انسان پیدا کیا گیا تو اس میں نفخ روح کیا گیا۔

ہمارے مفسرین کرام نے روحی کو مرکب اضافی قرار دے کر روح کو اللہ تعالیٰ کا ایک

جزو قرار دے دیا ہے' لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے روح کو جو اپنی طرف مضاف کیا ہے' وہ اضافتِ تبعیضی نہیں ہے' بلکہ یہ اضاف تشریفی ہے جو عزت افزائی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جیسے کہ بیت اللہ' ناقہ اللہ اور شعائر اللہ قرآن کریم نے استعمال کئے ہیں۔

اس آیت میں نفخ کے معنے پھونک مارنے کے نہیں ہیں' اسی لئے جلالین نے نفخ من روحہ کے معنے **انی جعلتہ حیا حساسا بعد ان کان جمادا** کئے ہیں' یعنی انسان کا جاندار اور ذی حس وحرکت ہونا کیا ہے۔

یہ تینوں آیات کریمات نوعِ انسانی کی تخلیق کے متعلق ہیں ان میں سے دو آیات 15:29, 38:72 کے الفاظ ایک جیسے ہی ہیں' ان تینوں آیات میں تسویہ کا نتیجہ روح کا موجود ہو جانا بتایا گیا ہے۔ نفخت فیہ من روحی میں روح انسانی فہم وادراک کی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو ارتقائی منازل حاصل کرنے کے بعد ملتی ہے۔ آیت نمبر 32:9 میں اس کو سماعت' بصارت اور عقل کی صلاحیت بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے کسی جگہ بھی روحِ انسانی کا تذکرہ نہیں کیا' روحِ خداوندی ہی کا ذکر ہے۔ جب یہ روحِ خداوندی پیکر انسانی میں نمود کرتی ہے' تو قرآنِ کریم اس کے لئے اپنی اصطلاح میں نفس کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ نفس انسانی کا اس مزعومہ روح سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا ذخیرہ علماء کرام کے نزدیک ابتدائے آفرینش میں جمع کرلیا گیا تھا' نفس انسانی ہر انسانی بچہ کو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے اور اس نفس انسانی کی نشو ونما کرنا ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ جس نے اس کی نشو ونما کرلی وہ کامیاب ہوگیا' جس نے اس کی نشو ونما نہیں کی وہ ناکام رہا۔ (87:14)-

ہمارے علماء کرام اور صوفیائے عظام جس روح کی نشو ونما کرتے ہیں' وہ اصل میں

نشو ونما نہیں ہوتی۔ وہ تو اس کو مارتے ہیں ان کے نزدیک اس کی نشو ونما' پرستش اوراوراد وظائف' گوشہ نشینی' زاویہ گیری سے ہوتی ہے۔ جبکہ نفسِ انسانی کی نشو ونما قرآن کریم کی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کی اساس ہی چونکہ مستقل اقدار پر ہوتی ہے' اور اس کی اطاعت سے مستقل اقدار کی اطاعت ہوتی ہے' اس لئے اسلامی حکومت میں نفس انسانی کی نشو ونما از خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ نفس انسانی کے ارتقاء اور نشو ونما میں پرستش کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔ مذہب کی اساس چونکہ مزعومہ روح کے تصور پر ہوتی ہے' اس لئے اس میں پرستش کی ضرورت ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد نفس انسانی پر ہوتی ہے' اس لئے اس میں پرستش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان دونوں کے نشو وارتقاء کے طریقے بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو شخص اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے' اس کے نفس میں ارتقاء ہوتا ہے۔ جو شخص مستقل اقدار پر عمل کرتا ہے' اس کے نفس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ جو صرف اسلامی حکومت میں ہوسکتی ہے۔ اس کی نشو ونما گوشوں اور زاویوں میں نہیں ہوسکتی۔ جب تک ہم مسلمان روح کے مذہبی تصور سے جان نہیں چھڑائیں گے' دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے روابط کے طریقے

ساری دنیا کے مسلمان اور خصوصاً ہم پاکستان کے باشندے' ایک شدید اضطراب اور افراتفری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان حالات میں زیادہ توجہ زندگی کے مسائل کی طرف دینی ضروری ہے اور نظری مسائل کے متعلق کچھ تحریر کرنا اس وقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تحریک طلوع اسلام کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مشکلات وبلیات کا حل قرآنی نظام کے قیام سے وابستہ ہے۔ قرآنی نظام کے قیام کے بغیر مسلمانوں کے مصائب کسی طرح بھی دور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ عقائد جو قرآنی حکومت کے قیام میں مانع ہوں' ان کی نشاندہی کرنا اور ان کی تردید کرنا بھی ایک ضروری امر ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کے عقائد ہی قرآنی حکومت کے داعی نہ ہوں' بلکہ ان میں مانع بنتے ہوں تو اسلامی حکومت کسی طرح بھی قائم نہیں ہوسکتی۔ اس پس منظر کو خیال میں رکھنے کے بعد آپ اس مضمون کو ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے تعلق صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی قائم ہوسکتا ہے۔ وحی الٰہی اور وحی الٰہی پر قائم شدہ نظام وہ واحد ذریعہ ہے جس کے واسطہ سے انسانیت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرسکتی ہے۔ آپ خود غور فرمائیں' اور بار بار اس مسئلہ پر غور فرمائیں' وحی الٰہی اور اس پر قائم شدہ نظام کے علاوہ کوئی ذریعہ ایسا ہے ہی نہیں' جس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کیا جاسکے۔ آپ جب قرآنِ کریم کی تلاوت فرماتے ہیں تو تخاطب الٰہی

اور مکالمۂ خداوندی سے سرفراز و مشرف ہوتے ہیں۔ جتنی دیر آپ وحی الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے' یہ تعلق وقتی ہوتا ہے' تلاوت کے بعد یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے' ہاں اگر آپ ایک اسلامی حکومت میں زندگی گزار رہے ہیں تو پھر آپ کا اللہ تعالیٰ سے مستقل تعلق قائم رہتا ہے۔ اس تعلق میں استمرار ہوتا ہے اور اس میں ہر مسلمان ہر وقت اسلامی حکومت کی اطاعت کرتے ہوئے عبادت الٰہی میں مصروف رہتا ہے اور اس میں آیۂ کریمہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56)-(ترجمہ) ''اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں'' کی تعمیل ہر وقت از خود ہوتی رہتی ہے ورنہ غیر اسلامی حکومت میں' اس آیہ پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے تعلق صرف وحی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں الہام' کشف' مراقبہ' القاء وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ ارشاد عالی ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (3:179)-(ترجمہ) اور خدا ایسا بھی نہیں کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے مگر ہاں خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چُن لیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا O اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (72:26)-(ترجمہ) اللہ ہی غیب کو جانتا ہے اور اپنے غیب کی باتیں ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ پھر اس (غیب) وحی کو انسانیت تک محفوظ طور پر پہنچانے کے لئے وہ انبیاء کرام کی جونگرانی کرتا ہے' اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا O لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَىْءٍ عَدَدًا (72:28)-(ترجمہ) (وحی کو بحفاظت پہچانے کے لئے) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر کر دیتا ہے تا کہ (وہ) دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ (اللہ) سب پر حاوی ہے اور اس نے تو ایک ایک

چیز گن رکھی ہے۔ وحی الٰہی کو انسانیت تک محفوظ طور پر پہچانے کے لئے یہ حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف گنا ہوا اور شمار کیا ہوا ہوتا ہے۔ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ جس وحی کے محفوظ پہچانے کا یہ اہتمام کیا جاتا ہے کیا اس میں قرآن کریم کے علاوہ، روایات یا الہام شامل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین کرام کے مطابق تو روایات بغیر الفاظ کے نازل ہوئی ہیں۔ ان کے الفاظ و حروف کی کس طرح گنتی ہو سکتی تھی۔ رہا الہام تو یہ بھی مُلہَم کو بغیر الفاظ کے صرف ایک خیال محسوس ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو صرف قرآن ملنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ (2:23)-(ترجمہ) اور اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کوئی شک ہے تو ایک سورۃ اس کے مانند لے آؤ۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں کفار و مشرکین سے تعارض صرف قرآن کا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر اس چیز کا تعارض کیا گیا ہے جو بھی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ اس آیت میں لفظ ما تعمیم کے لئے آیا ہے اور معارضہ پورے ''منزل من اللہ'' کا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر جو کچھ بھی نازل کیا ہے اس کے مثل ایک سورہ لے آؤ۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ نازل ہو رہا تھا وہ صرف سورتیں تھیں، یعنی نازل شدہ چیز صرف سورتوں پر مشتمل تھی۔ اسی لئے معارضہ صرف سورتوں تک محدود رکھا گیا ہے اگر ''مما نزلنا'' میں احادیث یا الہام شامل ہوتے تو ارشاد ہوتا کہ اگر تمہیں ''مما نزلنا'' میں شک ہے تو تم ایسی ایک آیت یا ایک حدیث بنا کر پیش کرو۔ ''مما نزلنا'' کے مانند صرف سورۃ بنانے کا چیلنج کرنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی نازل ہو رہا تھا وہ صرف وہ چیز تھی جو صرف سورتوں پر مشتمل تھی اور جس کا مثل نہیں بن سکتا تھا۔ ہمارے مفسرین کرام نے عمداً اور دانستہ اس آیت میں معارضہ کو صرف قرآن تک محدود کر دیا ہے حالانکہ آیت میں قرآن کا لفظ تک نہیں ہے۔ اگر معارضہ صرف قرآن تک محدود ہوتا تو ارشاد

ہوتا: وان کنتم فی ریب مما نزلنا فی القران. لیکن چونکہ معارضہ صرف قرآن تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر اس چیز کا معارضہ ہے جو بھی نازل ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ صرف قرآن تھا‘ کیونکہ قرآن کا ہی مثل نہیں بن سکتا۔ اس آیت میں ’’مما نزلنا‘‘ کے زمرہ میں احادیث دور دور تک بھی نہیں آسکتیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ احادیث کا چونکہ مثل بن سکتا ہے‘ اس لئے وہ اس آیت کے مطابق ’’منزل من اللہ‘‘ یا وحی الٰہی قرار نہیں دی جاسکتیں۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رابطہ انسانیت کے ساتھ صرف قرآن کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے‘ روایات (وحی خفی) یا الہام رابطہ کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

تحریک طلوع اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا رابطہ انسانیت سے صرف اس کے نظام کی معرفت ہوسکتا ہے‘ قرآن کریم نے انسانیت سے جو وعدے کئے ہیں وہ وعدے نظام کے ذریعے ہی پورے ہوتے ہیں اور وہ وعدے جس قدر پورے ہوتے جاتے ہیں یہ رابطہ اسی قدر پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا رابطہ ہے جو اس دنیا میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ یہ کوئی خفیہ یا انفرادی رابطہ نہیں ہوتا۔ چونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی صرف اسی رابطہ سے ہوسکتی ہے۔ اس رابطہ کے علاوہ کسی طرح بھی اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔ ہمارے علماء کرام چونکہ اسلامی حکومت یا اسلامی نظام کے قائل ہی نہیں ہیں‘ اس لئے وہ اس رابطۂ خداوندی کو بالکل Ignore کر دیتے ہیں‘ وہ ختم نبوت کے بعد الہام کو اللہ تعالیٰ سے رابطہ کا اصل ذریعہ گردانتے ہیں‘ لیکن ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے اس مضمون میں چند گذارشات الہام کے بارے میں پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سارے قرآن میں الہام کا لفظ ہی نہیں آیا‘ یہ اصطلاح ہی غیر قرآنی اور تصوف زدہ حضرات کی وضع کردہ ہے۔ اس کا قرآن کریم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

البتہ قرآن میں صرف ایک جگہ اس مادہ سے الھم کا لفظ آیا ہے۔ جو اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں اس اصطلاحی 'الہام' کا کوئی تعلق ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ سورہ الشّمس میں ارشاد ہوتا ہے: وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا O فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91:7-8)- (ترجمہ) نفس انسانی اور جو قوتیں اس کو درست رکھتی ہیں، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر فجور و تقویٰ کی امکانی صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔ اس جگہ الہام کے وہ اصطلاحی معنے لگ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ علماء کرام کے نزدیک تو الہام صرف بڑے بڑے عبادت گذاروں، متقیوں، پرہیزگاروں اور اولیاء کرام کو ہوسکتا ہے۔ جو ان کو ان کی عبادت و ریاضت کے صلہ میں ملتا ہے۔ اس آیت میں تو ایسی کوئی تشخیص ہی نہیں ہے۔ اس میں اولیاء اللہ تو ایک طرف مومن و کافر کا بھی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ الہام تو ہر انسان کو از خود ہوتا ہے، اس میں کسی عبادت و ریاضت کا دخل ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ آیہ کریمہ مقصد زیرِ نظر کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہوسکتی۔

ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ ہے کہ الہام دو طرح کا ہوتا ہے ایک الہام تو اولیاء اللہ کو ہوتا ہے اور ایک الہام انبیاء کرام کو ہوتا تھا۔

انبیاء کرام کے اسی الہام کو یہ حضرات وحی خفی بھی کہتے ہیں اور یہی وحی خفی احادیث میں روایت کردی گئی ہے۔

جہاں تک اولیاء اللہ کے الہام کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ ہمارا تصور ہی اولیاء اللہ کے متعلق غلط ہے۔ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ ہوتا ہی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (10:62-63)- آگاہ رہو کہ اس میں شک نہیں کہ دوستانِ خدا پر نہ خوف ہوتا ہے اور نہ انہیں حزن ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا پر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ آیہ کریمہ نے خود ہی ولی کی تعریف Definition بیان کردی ہے کہ: "جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار

کرے وہ ولی اللہ ہے۔"

قرآن کریم میں اولیاءاللہ کے مقابل اعداء اللہ کا بھی تذکرہ آیا ہے "ولی" اور "عدوٌ" ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے ولی اللہ کے صحیح معنے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ "عدواللہ" کے قرآنی مفہوم کو بھی سامنے رکھ لیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: (اے مسلمانو) کفار کے مقابلے کے لئے جہاں تک تم سے ہوسکے قوت حاصل کرو۔ تُرۡهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ 8:60' اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: یَـٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ (60:1)- اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ ان دونوں آیات میں اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے مومنین کے دشمنوں کے علاوہ خود اپنے دشمنوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اللہ کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے دشمن صرف وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے نظام اور اس کی حکومت کے قائم کرنے میں رکاوٹ بنیں۔ اس لئے اولیاءاللہ صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کے قائم کرنے میں رات دن کوشاں رہتے ہیں' ان اولیاءاللہ کو الہام کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کا رابطہ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اس نظام کی معرفت قائم رہتا ہے۔

اب رہا وہ الہام جو ان حضرات کے نزدیک انبیاء کرام کو ہوتا تھا' اس کے متعلق عرض ہے کہ اس کی بھی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں مل سکتی۔ مضمون کے شروع میں وہ آیات پیش خدمت عالی کی گئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی وحی کے ذریعے ملا ہے۔ اس کے علاوہ ایک لفظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو نہیں ملا۔ (36:69, 29:51)- الہام کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ ہر جگہ حضور ﷺ پر وحی نازل ہونے کا ذکر ہے۔ (42:13, 42:3, 35:31, 6:19, 43:43)-' قرآن کریم میں کسی جگہ بھی حضور ﷺ پر الہام ہونے کا ذکر تک نہیں ہے۔ ایک جگہ حکم ہے کہ وحی دی گئی ہے اس کی تلاوت کرو

13:30 ' الہام میں تو الفاظ ہوتے ہی نہیں ان کی تلاوت کس طرح ہو سکتی ہے۔ پھر اسی طرح حکم ہے کہ جو وحی تیری طرف کی جاتی ہے اس کا اتباع کرو 7:203, 10:15, 10:109, 6:107, 6:50, 33:2 ' پورے قرآن میں کسی جگہ بھی حضور ﷺ کو الہام کے اتباع کا حکم نہیں دیا گیا۔

ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ وحی اور الہام میں سورج اور چراغ کی نسبت ہوتی ہے۔ کیونکہ وحی قطعی اور رالفاظ کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ الہام بالکل ظنی' اور مشکوک' اور صرف مفہوم کی شکل میں ملتا ہے۔ اس بات کا علماء کرام خود اعتراف کرتے ہیں۔ پھر سوچنے کی یہ بات ہے کہ جس عالی مرتبت ہستی' رسول یا نبی کو وحی ملتی ہو' اس کو الہام کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ جب حضور ﷺ کو وحی جلی' جو سراج منیر اور ایک ایسی روشن قندیل ہے جو ساری دنیا کو روشن کر دے' تو ان کو الہام کی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الہام کیا اور اس کے ذریعے احادیث نازل کی گئیں۔

ہمارے علماء کرام کے نزدیک الہام میں صرف مفہوم بلا الفاظ کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ سابقہ ادوار میں تو چل سکتا تھا لیکن اس دور میں جبکہ سائیکالوجی (نفسیات) نے اتنی ترقی کر لی ہے' اس نظریہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بغیر الفاظ کے صرف مفہوم کو کسی کی طرف منتقل کر دینا Nonsensical Imposibility ہے۔ بغیر الفاظ کے کسی حال میں بھی تنہا مفہوم کسی کی طرف منتقل (Convey) نہیں کیا جا سکتا۔

جب قرآن کریم سے براہ راست الہام کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا تو ہمارے علماء کرام نے ایسی آیات کی تلاش شروع کر دی جن سے بالواسطہ الہام کی طرف اشارہ ملتا ہو۔ اس بارے میں تین آیات زیادہ نمایاں ہیں۔ الہام کے بارے میں مضمون کو مکمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان آیات کا قرآنی مفہوم بھی پیش خدمت عالی کر دیا جائے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ اَنْ آمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْآ آمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (5:111)-اور جب میں نے وحی کی حواریوں کی طرف کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہنا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اس آیہ کریمہ میں اوحیت کا لفظ حواریوں کے بارے میں آیا ہے۔ اس سے یہ حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے حواری نبی نہیں تھے تاہم جب ان کی طرف وحی ہوسکتی ہے تو غیر از انبیاء کی طرف بھی وحی ہوسکتی ہے اور وہی الہام ہوتا ہے۔

ہمارے علماء کرام کی یہ دلیل درست نہیں ہے۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ کا نام محذوف ہے۔ حواریوں کو یہ وحی حضرت عیسیٰ کی معرفت ہوئی تھی انہیں براہ راست نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح قرآن کریم میں دیگر مقامات میں حضورﷺ کا نام نامی محذوف ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)- ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہاں خطاب براہ راست مومنین سے نہیں ہے بلکہ یہ خطاب حضورﷺ کی معرفت ہے۔ اس نظریہ میں ہم منفرد نہیں ہے اور مفسرین نے بھی ہمارے اس نظریہ کی تائید کی ہے۔

(1) تفسیر مظہری نہایت بلند تفسیر شمار کی جاتی ہے اس تفسیر میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تحریر فرمایا ہے: ''عبد بن حمید نے قتادہ کا اور ابوالشیخ نے سُدی کا یہی قول بیان کیا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک وحی سے مراد حضرت عیسیٰ کی زبانی حکم بھیجنا ہے۔

(2) جلالین میں اوحیت کے ذیل میں تحریر ہے: ''چونکہ اصطلاح شرع میں وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس لئے مفسر علام کو وحی بالواسطہ سے تاویل کرنی پڑی۔'' آپ غور فرما رہے ہیں کہ کس طرح جلالین ہمارے الفاظ کو دہرا رہی ہے۔ ہمارے نظریہ کے مطابق اس کے نزدیک بھی وحی صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور اس آیت میں حواریوں کو وحی بالواسطہ ملی تھی۔

(3) علامہ پیر کرم شاہ صاحب ازہری نے ضیاء القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر یہ حواری انبیاء تھے جیسے بعض علماء کا خیال ہے تو وحی سے مراد وہ وحی ہوگی جو اللہ تعالیٰ انبیاء پر نازل فرماتا ہے۔''

(4) تفسیر نمونہ ایران کی موجودہ دور کی تفاسیر میں نہایت نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں تحریر ہے'' یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے وہ وحی مراد ہو جو حضرت مسیح کے ذریعے اور معجزات کی شکل میں ان کی طرف بھیجی جاتی تھی۔'' (جلد سوم' صفحہ 262)۔

(5) امام راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں تحریر فرمایا ہے ''واذ اوحیت الی الحوارین'' اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا''۔ میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔''

امید ہے کہ جو اقتباسات مستند تفاسیر سے پیش خدمت عالی کئے گئے ہیں' ان سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ان تمام تفاسیر نے ہماری تائید کی ہے کہ وحی صرف انبیاء کرام کو ہوتی تھی اور زیر نظر آیت سے الہام کی کوئی سند نہیں ملتی۔

ہمارے علماء کرام اس بارے میں دو آیات اور پیش کرتے ہیں' یہ دونوں آیات حضرت موسیٰ کی مادر گرامی سے متعلق ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

(i) اِذْ اَوْحَيْنَا اِلَى اُمِّکَ مَا يُوحَى O اَنِ اقْذِفِيْهِ فِيْ التَّابُوتِ (20:38-39)- (اے موسیٰ) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی کہ وہ مجھے ایک صندوق میں ڈال دے اور اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔

(ii) وَاَوْحَيْنَا اِلَى اُمِّ مُوسَى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (28:7)- اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ۔ (ترجمہ شیخ الہند)۔

اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ وحی صرف مردوں کو

ہوتی تھی۔ارشاد ہوتا ہے:

(1) وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیۡ اِلَیۡھِم مِّنۡ اَھۡلِ الۡقُرَیٰ (12:109)۔

(2) وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیۡ اِلَیۡھِمۡ فَاسۡاَلُوۡا اَھۡلَ الذِّکۡرِ (16:43)۔

(3) وَمَا اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیۡ اِلَیۡھِمۡ فَاسۡاَلُوۡا اَھۡلَ الذِّکۡرِ (21:7)۔

ان تینوں آیات کریمات میں ارشاد ہوتا ہے کہ وحی صرف مردوں کی طرف ہی نازل ہوتی تھی۔واضح رہے کہ ان آیات میں لفظ الا حصر کے معنے میں استعمال ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وحی صرف مردوں کو ہی ملتی تھی۔عورتوں کو وحی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے کسی جن کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو نہ کسی خانہ بدوش کو۔(تفسیر مظہری، جلد5، ص144)۔

ان تینوں آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ کو وحی نہیں ہوسکتی تھی۔

اوحی کے معنے ''کسی حکم کا دوسرے کی طرف کسی کی معرفت بھیجنا'' بھی ہوتے ہیں۔ جس کی مثال حواریوں کے سلسلہ میں پیش کی جا چکی ہے۔ وہاں حضرت عیسیٰ کی معرفت حواریوں کو حکم بھیجا گیا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔یہ بنی اسرائیل کی قوم نبیوں کو مانتی تھی۔ان میں قریہ قریہ، بستی بستی، نبی موجود رہے۔وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولاً (16:36)-اور ہم نے ہر اُمّت میں رسول بھیجا۔بعض مرتبہ دو دو تین تین رسول ایک ہی جگہ ہوتے تھے۔(36:14) اس دور میں ایک ایک گاؤں اور ایک ایک گروہ میں نبی موجود تھا اس لئے یہاں اوحینا کے معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کے ذریعے ام موسیٰ کی طرف یہ پیغام بھیجا تھا۔

یہ وہ تین آیات کریمات ہیں جن کا سہارا لے کر ہمارے علمائے کرام کسی کو الہام

ہونے کے نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔قرآن کریم میں براہ راست الہام کا کوئی ذکر نہیں آیا' نہ الہام کا کوئی ثبوت قرآن سے کسی طرح بھی مل سکتا ہے۔افسوس' صد افسوس' اس بات پر ہوتا ہے کہ اس موہومہ ومزعومہ الہام کے نظریہ پر سارے تصوف' تشیع اور احمدیت وقادیانیت کی عمارتیں استوار کی گئی ہیں۔الہام کے نظریہ کے بعد کسی بھی ہیئت اجتماعیہ کا تصور باقی رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ الہام کے نظریہ کا لازمی ومنطقی نتیجہ ذاتی وانفرادی نجات اور پرستش کرنا ہوتا ہے' الہام کے نظریہ کے ہوتے ہوئے اسلامی مملکت کا کوئی نظریہ باقی نہیں رہ سکتا نہ ہی کوئی اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے انسانیت کا رابطہ صرف قرآن اور قرآنی نظام کے ذریعے ہو سکتا ہے اور اسی کے ذریعے اس کی اطاعت وعبادت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین کے دعاوی کے نتائج اس کی صداقت کے ثبوت ہوتے ہیں

مغربی ممالک میں تقریباً پندرہویں صدی عیسوی سے عام بیداری شروع ہوئی۔اور اسی عرصہ کے دوران علمی تحاریک شروع ہوئیں۔ حیرت یہ ہے کہ یورپ کے تمام ممالک بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے شانہ بشانہ ترقی کرنی شروع کی۔خصوصاً انگلستان میں اس وقت بڑے بڑے مفکرین اور سائنسدان پیدا ہونے شروع ہوئے۔علمی وسائنسی رجحان زیادہ تر مذہب کے خلاف ہی تھا۔ بائبل کی تعلیم چونکہ بالکل خلاف عقل تھی اس لئے اس دور کے مفکرین مذہب سے برگشتہ بلکہ بیزار تھے۔ان میں بھی جولوگ طبعاً سعیدالفطرت تھے۔انہوں نے خدا کے وجود کا انکار نہیں کیا۔ایسے لوگوں کو Deist یا Theist کہتے تھے۔ یہ مذہب کی تعلیم کے خلاف' لیکن اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے۔ اس دور میں مذہب کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا خصوصاً Thomas Paine کی کتابوں کی بہت شہرت بھی ہوئی اور انہوں نے بہت زیادہ کردار ادا کیا۔ Paine نے اپنی کتاب میں بائبل کے تضادات کو خوب واضح کر کے تحریر کیا۔

ہمارے موجودہ دور میں بھی وہاں مذہب کے خلاف بہت کچھ لکھا جارہا ہے اس بارے میں Karen Armstrong کی کتاب A History of God اور ہاکنگ کی کتاب

The Delusion of God بہت مشہور ہیں۔

آپ مذہب کے خلاف مغربی مفکرین کی تمام کتابوں کا مطالعہ فرمالیں آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ وہ جو کچھ مذہب کے خلاف لکھ رہے ہیں اس کا زیادہ تر حصہ درست ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے سامنے قرآنِ خالص ہوتا ہے' وہ ان کی بیشتر چیزوں کی تصدیق کرے گا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی صدرِاول کے بعد سے ''مذہب'' ہی چلا آرہا ہے اور مغربی مفکرین اسلام پر بھی بطور ''مذہب'' کے ہی اعتراض کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے چونکہ قرآن کریم کو بطور ''دین'' کے خود ہی نہیں اپنایا' اس لئے ان مفکرین کے سامنے بھی قرآن کا دینی تصور کبھی نہیں آیا۔ وہ یہ خیال ہی نہیں کر سکتے کہ اسلام کا نظام کس درجہ انسانیت پرور' غریب نواز' اور انسانی صلاحیتوں کو نشوونما دینے والا ہے۔ اب انہوں نے Political Islam کی ایک اصطلاح' (وضع) Coin کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس اصطلاح سے ان کے ذہن میں دین کا تصور سامنے آتا' لیکن ہم مسلمانوں کی بدقسمتی کہ اس دور میں مختلف اسباب و وجوہ کے باعث تشدد Violence اس درجہ بڑھا ہے کہ انہوں نے اس مبنی بر تشدد اسلام کو ہی دین کے مرادف سمجھ لیا ہے۔ نہ ان تشدد پسندوں کے سامنے دین اور مذہب کا فرق نمایاں ہے اور نہ ہی ان مغربی مفکرین کے سامنے۔

مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ نہ یہ خارج میں کسی جگہ ہوتا ہے۔ مذہب چند رسوم و روایات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کو کسی جگہ ادا کیا جاسکتا ہے' مذہب میں نتائج مرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ مذہب کا کسی معاشرہ یا سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' نہ کوئی شخص کسی مذہب کو صحیح یا غلط ثابت کرسکتا ہے۔ اس کے برخلاف دین موجود فی الخارج ہوتا ہے چونکہ اس کے دعاوی کے نتائج اس دنیا میں برآمد ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے اس کے صحیح یا غلط ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ دین جو دعاوی کرتا ہے اگر وہ دعاوی پورے ہوجائیں تو آپ سمجھ

لیں کہ یہ دین درست ہے اور اگر اس کے دعاوی ہی پورے نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ وہ دین درست نہیں ہوسکتا۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر آپ دین خداوندی کے دعاوی کو ملاحظہ فرمائیں، یہ دعاوی کوئی بھی مذہب نہیں کرسکتا۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے: قُلْ یَا قَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَن تَکُوْنُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهُ لاَ یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135)- (اے رسول) تم ان سے کہہ دو کہ اے میری قوم، تم بجائے خود، جو چاہو کرو، میں بھی بجائے خود، عمل کر رہا ہوں۔ پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخرالامر کامیابی کس کے لئے ہے اور ظالم یقیناً کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ نظری طور پر تو دونوں کی طرف سے یہ دعویٰ تھا کہ وہ سچے ہیں، لیکن یہ کس طرح معلوم ہو کہ سچا کون ہے۔ مذہب میں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ کون درست ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کا واضح حل دے دیا ہے کہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق عمل کرتے چلے جائیں۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ کس کا دعویٰ درست ہے۔ قرآن کریم نے فسوف، یعنی پھر عنقریب، کے الفاظ لا کر یہ واضح کر دیا کہ اس کا فیصلہ بہت جلد اسی دنیا میں سامنے آ جائے گا۔

قرآنِ کریم کو چونکہ اپنی صداقت وحقانیت پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے اس لئے وہ بار بار اس بنیادی واساسی اصول کو پیش کرتا ہے کہ قرآن کریم کے نظام پر عمل کر کے دیکھ لیا جائے۔ خود اس کے دعاوی کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے: وَیَا قَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَن یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ کَاذِبٌ (11:93)- (ترجمہ) اے میری قوم تم اپنی جگہ جو چاہے کرو، میں بھی بجائے خود کرتا ہوں، عنقریب ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب نازل ہوتا ہے جو اسکو رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا

ہے۔آپ غور فرمائیں کہ اس آیت میں بھی 'سوف' یعنی عنقریب کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ عنقریب وہ عذاب نازل ہوگا اور عنقریب جھوٹے اور سچے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ دین کے اتباع اور اس کی مخالفت کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ان کے لئے قیامت یا آخرت کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔

سورہ زمر میں پھر تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو 11:93 میں استعمال ہوئے ہیں جبکہ ارشاد عالی ہے: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ○ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ (39:39-40)۔اے رسول کہہ دو اے میری قوم تم اپنی جگہ جو چاہو عمل کرو۔میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں پھر عنقریب ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ آفت آتی ہے جو اس کو (اس دنیا) میں رسوا کر دے اور اس پر دائمی عذاب بھی نازل ہوگا۔

قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ بڑا عظیم دعویٰ ہے اور جس اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ وہ اسے پیش کرتا ہے وہ بہت بڑا چیلنج ہے۔یہ چیلنج صدر اول میں پورا ہوا۔اور اس کو پھر دوبارہ پورا کرنے کے لئے مومنین کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو قرآن کریم کے نظام کو بطور دین کے پیش کرے یہ مذہب کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ علماء کرام کے بس کی بات ہے۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

قرآنِ کریم کی ایک عجیب و نادر بات پر غور فرمائیں کہ اگرچہ دنیا کی تمام حکومتیں قوت کے زور پر وجود میں آتی ہیں لیکن قرآن کریم کی رو سے ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجہ میں حکومت حاصل ہو جاتی ہے (24:55) اس کے نزدیک قوت و طاقت کے ذریعے حکومت حاصل کرنا درست نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے نہایت پر امن طریقہ سے مکہ میں اپنی تیرہ سالہ زندگی بسر کی اور مکہ میں ہی بیعت عقبہٰ اولیٰ و بیعت عقبہٰ ثانی واقع ہوئیں اور معاہدہ عقبہ کے موقع پر ہی

حضورﷺ نے نقباء کا تقرر فرما دیا۔نقباء کے تقرر سے مدینہ میں اجتماعی نظم کی ابتدا ہوگئی اورنقباء کے ذریعہ مدینہ میں ایک منظّم سیاسی معاشرہ کی تعمیر ہونی شروع ہوگئی۔(تاریخ کے مطابق) معاہدہ عقبہ 12 ذی الحجہ 12 نبوی میں ہوا۔محرم اور صفر کے صرف دو ماہ بعد ہی ربیع الاول 13 نبوی میں رسول اللہﷺ نے ہجرت فرمائی۔ہجرت کے فوری بعد حضورﷺ نے نہایت دور بینی اور تدبر سے کام لے کر عقد ''مواخاۃ'' قائم فرمایا۔اس میں کسی قسم کا جبر نہیں تھا۔یہ عقد ''مواخاۃ'' نہایت رضاو رغبت سے قائم ہوا۔اس کے بعد ریاست کا آغاز ہوگیا۔حضورﷺ کے جاری کردہ احکامات کی اطاعت سب کے لئے فرض ہوگئی دنیا کی یہ واحد مملکت تھی جس کا قیام بغیر کسی قوت کے استعمال کے عمل میں آیا' حضورﷺ نے بالکل غیر مانوس ماحول میں متضاد ومتخالف عناصر کے تعاون سے یہ حکومت قائم فرمائی۔یہ ریاست دیگر تمام ریاستوں جیسی ریاست نہیں تھی۔یہ ایک نظریاتی ریاست تھی۔حضورﷺ نے یہ تعاون کسی قوت کے زور پر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ ایک معاہدہ تھا جس کے ذریعے یہ ریاست وجود میں آئی تھی۔حضورﷺ کا یہ معاہدہ تاریخ کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ مشہور سیرت نگار ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام دونوں نے اسے بالاستیعاب نقل کیا ہے۔اس تاریخی دستاویز کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تقریباً 50 سے زیادہ شقیں (Articles) تھیں۔ یہ حضورﷺ کا ایک انقلابی اقدام تھا کہ حضورﷺ نے اس معاہدہ کے ذریعہ پہلی مرتبہ مدینہ کو شہری مملکت قرار دیا۔معاہدے کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ ''انھم امۃ واحدۃ من دون الناس'' یعنی یہ تمام گروہ دنیا کے دوسرے لوگوں سے الگ ہوکر ایک علیحدہ سیاسی وحدت متصور ہوں گے۔

اس ریاست کی تفصیلات کتبِ تاریخ میں بہت شرح وبسط سے مذکور ہوئی ہیں' جن کا تذکرہ کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔یہاں صرف یہ بات پیشِ خدمت عرض کرنی ہے کہ اس ریاست کا آغاز ربیع الاول ایک ہجری میں ہوا۔ریاست بغیر کسی قوت وتشدد کے وجود میں آگئی۔اس کے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد 17 رمضان 2 ہجری بدر کا واقعہ پیش آیا اور بدر کے بعد لڑائیوں کا

سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن یہ سب لڑائیاں مدینہ کی ریاست کے دفاع میں تھیں اگر کفار اس ریاست پر حملہ نہ کرتے' تو یہ ریاست خود بخود مستحکم ہوتی چلی جارہی تھی' اور اسلام کی تبلیغ بھی بغیر تشدد کے پھیلتی جارہی تھی۔ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے ریاست قائم ہوسکتی ہے' صدر اول میں ہی پورا ہوگیا تھا۔

مسلمان کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے القرآن (3:139, 4:141, 30:47)

حضورﷺ کے زمانہ میں یہ ریاست وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضورﷺ کے زمانہ میں اس ریاست کا رقبہ دس لاکھ مربع میل اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں 32 لاکھ مربع میل پر مشتمل تھا۔ حضورﷺ نے اپنے زمانہ میں مقامی حکام اور امراء مقرر فرما دیئے تھے القرآن (4:83, 2:188) اور ان مقامی حکام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ مملکت کے کاروبار کے سلسلہ میں حضورﷺ مدینہ شریف سے باہر بھی جاتے رہتے تھے اور اپنی جگہ مدینہ میں اپنا جانشین مقرر فرما جاتے تھے۔ عموماً حضرت ابنِ اُم مکتوم کو اپنی جگہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ حضورﷺ کی عدم موجودگی میں حضرت ابنِ اُم مکتوم کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت تھی' مقصود بالذات اسلامی ریاست کی اطاعت تھی۔ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت مقصود بالذات نہیں تھی۔ حضورﷺ نے اپنے دور میں اسلامی ریاست کا ادارہ اور دیگر ادارے اس درجہ مضبوط کر دیئے تھے کہ شخصی اطاعت کے تصور کی بجائے اداروں (ریاست) کی اطاعت کا تصور جگہ پکڑتا جارہا تھا۔

قرآنِ کریم کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہوتی ہے (11:6, 6:151, 17:31) حضورﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے نئے اصول مقرر فرمائے۔ صدقات و زکوٰۃ کا نظام قائم فرمایا۔ حضورﷺ نے 9 ہجری میں زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کے لئے ہر قبیلہ کے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے یہ محصلین قبائل کا دورہ

کر کے، زکوٰۃ وصدقات حاصل کرتے تھے۔ یہ محصلین جب واپس آتے تو حضورﷺ کو پورا پورا حساب دیتے تھے۔ آمدنی کی ان ہی مدات سے ہر شہری کو رزق مہیا کیا جاتا تھا۔ اور حضورﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی بستی میں ایک شخص بھی بھوکا سو گیا، اس بستی سے حکومت کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اس دور کے افسران کی تنخواہ کا تعلق ہے اس کی شرح بھی حضورﷺ نے خود ہی مقرر فرما دی تھی۔ فرمایا کہ ''من کان لنا عاملاً فلیکتب زوجہ فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادماً وان لم یکن لہ مسکن فلیکتب مسکناً ومن اتخذ غیر ذلك فھو غال''۔ جو شخص ہمارا عامل ہو، اس کو ایک بیوی کا خرچ لینا چاہیئے۔ اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو مکان کا خرچ لینا چاہیئے، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔''

حضورﷺ کے خلاف کفار اعتراض کرتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے اس کے پاس تو نہ کوئی خزانہ ہے اور نہ ہی کوئی باغ القرآن 25:8- فرمایا کہ خدا کی ذات بڑی قدرت والی ہے۔ اس کے پاس باغوں کی کمی ہے نہ خزانوں کی۔ یہ کفار ایک باغ کو کہتے ہیں۔ خدا اگر چاہے تو تمہارے لئے بہت سے باغات اور بہت سے ایوان ومحل تیار کر دے۔ یہ سب چیزیں تمہیں ایک دن ملنی ہیں، کہا ذرا انتظار کرو پھر دیکھو کہ یہ تو ایک باغ ومحل کو کہتے ہیں۔ قیصر وکسریٰ کی تہذیبوں اور ان کی زمینوں کے کتنے باغات تمہارے قبضہ میں آتے ہیں۔ تم خود دیکھنا کہ کیسے کیسے محلات تمہارے قبضہ میں آتے ہیں۔ **وَيَجْعَل لَّكَ قُصُوراً** (25:10)-ایران کی فتح سے قرآن کریم کے یہ تمام وعدے پورے ہوئے اور عربوں کو وہ مالِ غنیمت حاصل ہوا جو ان کے آباء و اجداد کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں ان اموال وغنائم کو دیکھ کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ غنائم واموال کے ساتھ حضرت سعدؓ نے ان کی ایک فہرست بھی حضرت عمرؓ کو روانہ کی تھی۔ اس فہرست میں جو چیزیں درج تھیں وہ سب وہ تھیں جن کا وعدہ قرآن کریم نے مومنین سے کیا ہوا

تھا۔قرآن کریم کے یہ وعدے اس طرح دین میں پورے ہوتے ہیں۔یہ مذہب کے بس کی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے کسی وقت یا شخصیتوں سے منسلک نہیں ہوتے۔ اس کے وعدے دائمی ہوتے ہیں اور ہر شخص کے لئے پورے ہوتے ہیں ہمارے موجودہ دور میں پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدوں کی بنیاد پر ہوا تھا۔مسلم لیگ کا قیام تو 1906ء میں ہو گیا تھا لیکن 1906ء سے لے کر 1940ء تک نہ تو لیگ کے سامنے کوئی متعین نصب العین تھا اور نہ ہی لیگ نے اس دوران کوئی تعمیری کام کیا۔البتہ 1940ء میں مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کا ریزولیوشن (Resolution) پاس کیا اور سات سال کے مختصر عرصہ میں مسلم لیگ پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔پاکستان کے قیام میں کسی قسم کی طاقت یا قوت کا استعمال نہیں کیا گیا۔انگریز حکومت کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی گئی' مسلم لیگ کا ایک ممبر بھی ایک دن کے لئے قید نہیں ہوا۔بغیر قوت کے استعمال کے پاکستان حاصل ہو گیا۔یہ الگ بات ہے کہ پاکستان کے قیام کے فیصلے کے بعد' ہندوؤں نے جوشِ انتقام میں جھگڑے شروع کر دیئے جس میں تقریباً ایک ملین آبادی جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر مشتمل تھی' قتل کر دی گئی لیکن اس جوشِ انتقام اور قتل وغارت کا حصول پاکستان کی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک ماہر وکیل عدالت میں فیصلہ جیت لے اور اس کے مخالف اس کو کمرۂ عدالت کے باہر نکلنے پر زدوکوب کرنے لگیں۔ پاکستان تو قائداعظمؒ کی قانونی مہارت سے حاصل ہوا۔ پاکستان کے لئے کوئی قیمت ادا نہیں کی گئی تھی۔یہ دوسری بات ہے کہ ہم مسلمان ان تمام وعدوں سے مکر گئے اور بالکل منحرف ہو گئے۔اور آج اسی انحراف کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور حالات اس بات کی طرف واضح اشارے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے ان وعدوں سے انحراف سخت تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12)-بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے۔

اب بھی موقع ہاتھ سے نہیں نکلا ہے اور ہمارے لئے کشادکی راہ موجود ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام بغیر کسی تشدد اور ہنگامہ آرائی کے اب بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ وہ فکر جو صرف قرآنِ خالص پر مبنی ہو' اس کی اشاعت و ترویج کی جائے۔ بُوئے پرستش کا کلی طور پر استیصال کیا جائے اس میں ہر طرح اور ہر نوع کی پرستش شامل ہے۔ واضح رہے کہ دین میں خدا پرستی سے مقصود خدا کے قوانین کو دنیا میں عملاً رائج کرنا ہوتا ہے اور نیک عملی کے معنے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہوتا ہے اور یہی دین کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہمیت قبلہ

دین میں اللہ ورسول کی اطاعت اس زندہ اتھارٹی کی معرفت ہوتی ہے جو دین کا نظام جاری رکھتی ہے اور یہ اطاعت ایک ہی اتھارٹی کی ایک ہی اطاعت ہوتی ہے۔قرآن کریم نے ہر جگہ اللہ ورسول کی اطاعتوں کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔لیکن جب ہمارے ہاں دین کا نظام منقرض کر کے ملوکیت غالب آ گئی تو یہ اطاعتیں بھی رد ہوگئیں' اللہ کی اطاعت تو قرآن کریم کے ذریعہ کرنا بہت آسان بات تھی' لیکن اس دور میں یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ رسول اللہ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔اگر مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو وہ پھر اسلامی نظام جاری کر دیتے لیکن یہ تو ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے ناممکن ہوگیا۔اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی دوسری اور واحد صورت یہی تھی کہ حدیث کی اطاعت سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے احادیث کے صحاح' مجامع' رسانید' جمع ہونے شروع ہو گئے اور ان کتابوں کی اطاعت رسول کی اطاعت قرار دے دی گئی۔ کیونکہ اسلامی نظام کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا اور کوئی ذریعہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔حالانکہ ہمارے علماء کرام کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ عربی محاورہ کے مطابق اطاعت صرف زندہ ہستی کی ہوسکتی ہے' اطاعت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی زندہ ہستی حکم دے اور اس حکم کی فرمانبرداری کی جائے۔ کتابوں کے ذریعے کسی شخص کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔معروف ومتداول درسی لغت ''مصباح اللغات'' میں

اطاعت کے معنے فرماں بردار ہونا لکھا ہے ''امرہ' فاطاع' اسے حکم دیا اور اس نے اطاعت کی۔''
امام راغب افضائی نے لکھا ہے' عام طور پر طاعۃ کا لفظ کسی حکم کے بجالانے پر آجاتا ہے'' اور اس کی
سند میں انہوں نے آیات 81:4 ,21:47 پیش کی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے معنے
کسی کی فرمانبرداری کرنا تحریر کیا ہے اور سند میں اطیعوا الرسول 38:4 کا حوالہ دیا ہے۔ غرضیکہ
اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ حکم دینے والا زندہ ہو اور زندہ حاکم کے حکم کی فرمانبرداری اطاعت
ہے۔ کتابوں کے ذریعے اطاعت کا تصور محاورہ عرب کے خلاف ہے۔

تقریباً ایک ہزار سال کے بعد ہمارے اس دور میں پھر احادیث کے مقام کے متعلق
شکوک وشبہات ظاہر ہونے لگے اور چند بیدار مغز علماء اور چند روشن خیال دانشوروں نے حدیث
کے صحیح مقام کے تعین کے سلسلہ میں پھر بحث شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے قدامت
پرست علماء کرام نے حدیث کے دفاع میں تقریباً دوسو کتب تصنیف کر ڈالیں اور ان کتب میں
انہوں نے حدیث کو وحی (خفی) قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک حدیث کو وحی قرار دینے کی دو
وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو ان کی وہی مجبوری ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں
حضور ﷺ کی اطاعت کا واحد ذریعہ حدیث کی اطاعت رہ جاتی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے
احادیث کو وحی ہی قرار دے دیا۔ ضمناً عرض ہے کہ ہمارے علماء کرام نے یہ غور نہیں فرمایا کہ وحی
سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعے رسول کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ احادیث
رسول کو وحی قرار دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ احادیث کو وحی (خفی) کا درجہ دے کر' ان کو جہت
شرعی قرار دے دیا گیا۔

دراصل اس عقیدہ کا محرک انسانوں کا وہی جذبہ ہے جو رسولوں کو بشری حدود سے ارفع
واعلیٰ سمجھنا ہے اور اس سے آپ کے عقلی و ذہنی قویٰ کو سہو وخطا سے بلند خیال کرنا ہے۔ چنانچہ
ہمارے دور کے مشہور عالم ومحدث مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی' شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ

لاہور نے اپنی مشہور کتاب ''حجیت حدیث'' میں تحریر فرمایا ہے' اسے آپ غور سے ملاحظہ فرمائیے اور سر پیٹیئے' وہ فرماتے ہیں ''جس طرح ٹیلیفون خود نہیں بولتا' بولنے والا پس پردہ کوئی اور ہوتا ہے اسی طرح نبی کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی آواز ہوتی ہے'' (صفحہ 39)۔ اپنے اس نظریہ کی مزید تائید کے لئے' حضرت اقدس نے مولانا روم کا ایک شعر بھی نقل فرما دیا ہے۔

گفتۂ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس شعر کا ترجمہ کتاب میں یہ دیا گیا ہے' آپ کی گفتگو اللہ کی گفتگو ہوتی' اگرچہ بظاہر وہ اللہ کے بندے (نبی کریم) کی زبانِ مبارک سے ہو رہی ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ حضرت اقدس کس طرح حضور ﷺ کو عقلی و ذہنی صلاحیتوں سے فارغ قرار دے رہے ہیں حالانکہ قرآنِ کریم کے مطابق بے شک انبیاء کرام کو وحی الٰہی ملتی تھی جسے وہ بلا تغیر و تبدیل کے انسانیت کو پہنچا دیتے تھے' لیکن اس کے علاوہ باقی تمام امور و معاملات میں جتنی خصوصیات انسانوں کی ہیں وہ سب انبیاء کرام میں ہوتی تھیں مثلاً خوش ہونا' رنجیدہ ہونا' خوف و حزن لاحق ہونا' عمدہ سے عمدہ تدابیر کی راہ نکالنا اور ان کو تدابیر کو اختیار کرنا' بیمار ہونا' نکاح کرنا' بھولنا' اپنی ازواج مطھرات سے ازدواجی تعلقات رکھنا' بچے ہونا' مشوروں میں غلطی کرنا' یہ سب خصوصیات انبیاء کرامؑ میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ آپ کی ذات والا صفات میں بھی تمام بشری صفات موجود تھیں' قرآن کریم آپ کی ان بشری خصوصیات کا ذکر فرماتا ہے۔

(1) آپ مشورہ کرنے پر مامور ہیں (42:48, 42:38)

(2) آپ سے غلطیاں صادر ہوتی تھیں' جن پر تنبیہ نازل ہوئی۔ (9:43)

(3) آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کل کو اس دنیا میں یا مرنے کے بعد خدا کے ہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہونا ہے۔ آپ کا حال بھی اس بارے میں عام مسلمانوں جیسا تھا۔

(46:9)

(4) جیسا کہ شیطان عام انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے' آپ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے' آپ کو حکم تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔ ,23:97) 7:200)

(5) چونکہ حضورﷺ سہو و خطا سے منزہ نہیں تھے' اس لئے انہیں جو تکالیف پیش آتی تھیں وہ سب ان کی اپنی وجہ سے ہوتی تھیں۔ مَـا اَصَـابَکَ مِـن سَیِّـئَۃٍ فَمِن نَّفُسِکَ (4:79) اور جو مصیبت آپ پر آتی وہ آپ کے نفس کی وجہ سے ہے۔

(6) حضورﷺ غیب دان بھی نہیں تھے۔ (7:188)

قرآنِ کریم سے حدیث کے وحی ہونے کی کوئی سند نہیں ملتی۔ صرف قرآن کے وحی ہونے کا بار بار ذکر ہوتا ہے' تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (25:1)' بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان نازل فرمایا' اسی طرح ارشاد ہوتا ہے: وَاُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ (6:19) مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کے نازل ہونے کی متعدد آیات ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی احادیث کے نازل ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جب علماء کرام سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اس عقیدہ کی تائید میں کہ حدیث وحی ہے' کوئی آیت پیش فرمائیں' تو وہ آیت تو پیش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ صرف چند ایسی آیات کی نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اگر وحی خفی کو تسلیم نہ کیا جائے' تو ان کے نزدیک وہ آیات سمجھی نہیں جا سکیں۔ اس لئے وحی خفی کا ماننا ضروری ہے۔ اگرچہ اصولی طور پر یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ اگر کچھ آیات سمجھ میں نہ آئیں تو کسی غیر وحی کو وحی قرار دے دیا جائے۔ تاہم اس بارے میں عرض ہے کہ ان کی پیش کردہ آیات کی تفسیر و تشریح کئی مرتبہ پیش کی جا چکی ہے۔ خصوصاً ان تفاسیر میں جو تصریف آیات کے اصول کے تحت تحریر کی گئی ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی بار بار ہمارے علماء کرام اس مطالبہ کا اعادہ کرتے ہیں' تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

علماء کرام کے اس متذکرہ مطالبہ میں کہ احادیث (وحی خفی) کے بغیر وہ چند آیات سمجھ میں نہیں آئیں، دو مغالطے Involve ہیں۔

پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام ان چند آیات کی تفسیر روایات کے ذریعے کرتے ہیں، جو درست نہیں ہوتی، اور اس روایت کے ذریعے کی ہوئی تفسیر کو بطور سند و حجت کے پیش کرتے ہیں، وہ روایات کے وحی ہونے کی تائید میں خود روایات کو ہی پیش کر دیتے ہیں یعنی جو دعویٰ ہوتا ہے، اسی کو دلیل کے طور پر پیش کر دیتے ہیں، اس کی اور واضح مثال یہ ہے کہ وہ غیر مسلم جن کو قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر شک ہو، ان کے سامنے یہ آیت پیش کی جائے، اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ (15:9)۔ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، تو وہ معترض یہی کہیں گے کہ جب ہم قرآن کو محفوظ نہیں مانتے تو ہم اس آیت کے منشاء کو بھی سند تسلیم نہیں کرتے۔ جو دعویٰ ہو اگر اسی کو دلیل کے طور پر پیش کر دیا جائے اس کو مناظرہ کی اصطلاح میں مصادرہ علی المطلوب کہتے ہیں جو بالہدایت غلط ہوتا ہے۔

ان کے اس مطالبہ میں دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام آیات کا جو مُحکی عنہٗ طلب کرتے ہیں وہ خود روایات میں بھی مذکور نہیں ہوتا ہے، اس لئے ان کی یہ دلیل تام نہیں ہے۔ اس مغالطہ کو سمجھنے کے لئے بطور مثال ایک آیت پیش کی جاتی ہے، تاکہ یہ بات واضح ہو جائے۔

جناب مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی کی کتاب ''حجت حدیث'' میں تحریر ہے: ایک بار آنحضرت نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کو راز کی بات بتلائی تو انہوں نے یہ راز کسی اور کے سامنے ظاہر کر دیا، جب آپ کو معلوم ہوا کہ راز ظاہر ہو چکا ہے تو آپ نے اس زوجۂ مطہرہ سے وضاحت طلب فرمائی، انہوں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس افشائے راز کی خبر آپ کو کس نے دی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے مجھے مطلع کر دیا، یہ واقعہ قرآنِ کریم میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ واذ اسر النبی بعض ازواجه حدیثاً۔ الخ۔(ترجمہ) اور جبکہ پیغمبر

نے اپنی کسی بی بی سے ایک بات چپکے سے فرمائی پھر جب اس بی بی نے وہ بات بتلا دی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے تھوڑی سی بات تو بتلا دی اور تھوڑی سی بات کو ٹال گئے۔ سو جب پیغمبر اس بی بی کو وہ بات بتلائی وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر دی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے خبر رکھنے والے نے خبر کر دی''۔

ترجمے کے نمایاں الفاظ (خط کشیدہ الفاظ) اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو افشائے راز سے مطلع کر دیا تھا لیکن یہ اطلاع بھی قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے اور اس طرح اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے سوا ایک اور قسم کی وحی کا نزول بھی رسول اللہ پر ہوتا تھا اور یہی ''وحی غیر متلو ہے''۔ (اقتباس ختم شد)

آپ نے جسٹس صاحب کی کتاب سے اقتباس ملاحظہ فرمالیا۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو افشائے راز سے مطلع کر دیا تھا لیکن یہ اطلاع قرآن میں نہیں ہے''۔ ہمارے علماء کرام اس سے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ اطلاع حضورﷺ کو وحی خفی سے ملی تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو افشائے راز سے بذریعہ وحی خفی مطلع کر دیا تھا لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ احادیث میں کسی جگہ بھی وہ الفاظ نہیں ملے جن کے ذریعے افشائے راز کی اطلاع دی گئی تھی۔ جب احادیث میں کسی آیت کا مُحکیٰ عنہ کے ملتا ہی نہیں' تو ان کا یہ اعتراض درست نہیں ہوسکتا' ہاں اگر وہ حدیث میں محکیٰ عنہ' دکھادیں تو بے شک ان کا اعتراض درست ہوسکتا ہے۔ جب احادیث میں کسی آیت کا محکیٰ عنہ' ملتا ہی نہیں' تو ہمارے علماء کرام کا یہ دعویٰ کہ آیات کا محکیٰ عنہ' وحی خفی کی رو سے مل جاتا تھا درست نہیں ہے۔

ہمارے علمائے کرام چند آیات کو پیش کر کے ان کو تحویل قبلہ سے متعلق قرار دیتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ یہ آیات بغیر وحی خفی کی مدد کے سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ لیکن ہمارے علماء کرام ان آیات کا مفہوم ہی غلط لیتے ہیں' اس لئے اس وحی خفی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 142 دوسرا پارہ سیقول کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔آیت نمبر 140 سے آیت نمبر 150 تک آپ قرآن کریم کے نسخے سے اپنے پیش نظر انہیں پھر ان آیات کی روایتی تفسیر کا ملخص ملاحظہ فرمائیں۔

مکہ میں حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ درآنحالیکہ آپ کی خواہش یہی تھی کہ مکہ کی طرف رخ ہو۔مکہ میں آپ اس طرح نماز ادا فرماتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف رخ ہو جاتا تھا لیکن مدینہ منورہ میں یہ صورت نہیں ہو سکتی تھی' کیونکہ یہ دونوں مقامات مختلف سمتوں میں تھے۔ مدینہ آ کے کر بھی حضور ﷺ نے تقریباً سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔اس کے بعد خدا کی طرف سے وحی ہوئی کہ آپ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں' چنانچہ تفسیر مظہری میں ہے کہ آپ نے بمع اصحاب کے مسجد سلمہ میں نماز شروع فرمائی۔ جب آپ دو رکعتیں پڑھ چکے تو جبرئیل نے آ کر اشارہ کیا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ۔آپ نماز میں ہی کعبہ کی طرف میزاب کی جانب پھر گئے جس جگہ مرد تھے وہاں عورتیں آ گئیں اور جہاں عورتیں تھیں۔ وہاں مرد آ گئے' غرض سب نماز میں پھر گئے اسی واسطے اس مسجد کو مسجد القبلین کہتے ہیں۔صفحہ 186۔

ان آیات کی تفسیر تمام مفسرین کرام نے بہت طویل لکھی ہے اور ان ہی آیات سے تحویل قبلہ کا ثبوت دیا جاتا ہے اور ان ہی آیات سے بیت المقدس کو قبلۂ اول قرار دیا جاتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان آیات کی پوری تفسیر نہیں آ سکتی البتہ ان کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔

ہماری مروجہ تفاسیر میں اگر چہ ان آیات کی تفسیر میں سب سے نمایاں ذکر نماز میں رخ بدلنے کا آیا ہے' لیکن یہ بات بڑی تعجب کی ہے کہ ان آیات میں نماز کا دور دور کوئی تذکرہ ہے ہی نہیں۔ان آیات کا تعلق نماز سے ہے ہی نہیں۔اس لئے ان کی یہ تمام تفسیر ہی غلط ہے۔

قرآن کریم نے جب سابقہ تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا واجب قرار دے دیا اور ان

کی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا تو یہود و نصاریٰ کو اس بات کی توقع تھی کہ اب قرآن کریم بیت المقدس کو بھی اپنی عقیدت کا مرکز قرار دے گا اب تک یہود و نصاریٰ کے عقیدتی مراکز الگ الگ تھے' جیسا کہ سلاطین باب 8 ' آیت 22 تا 30 سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کا قبلہ یروشلم تھا' لیکن یہود کا سامری فرقہ یروشلم کے ایک پہاڑ کی طرف منہ کرتا تھا اور بھی فرقوں کے قبلے الگ الگ تھے جیسا کہ: وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ (2:145)-(ترجمہ) اور ان میں ایک دوسرے کے قبلے کو نہیں مانتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے' لیکن چونکہ قرآن کریم تو پوری انسانیت کا ایک مرکز بنانا تھا اس لئے ان قبلوں میں سے کسی کو قبلہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے باوجودیکہ کعبہ اس وقت تک بتکدہ تھا' تاہم کعبہ کو ہی تمام دنیا کی عقیدت کا مرکز قرار دے دیا' چونکہ اسلام عالمگیر دنیا کا دین تھا اس لئے اس کے مرکز کو نسلی' قومی' عصبی' جغرافیائی حدود سے بلند ہونا ضروری تھا۔ کعبہ کو قبلہ بنانے کا اصل سبب ہی یہ تھا لیکن یہ بات یہودیوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اور اس دور میں عالمگیریت کا تصور آنا بھی ذرا مشکل ہی تھا۔ یہودیوں کا اصل اعتراض نماز کے بارے میں نہیں تھا ان کا اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی عقیدت و محبت اور اپنے نظام کا مرکز بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو کیوں قرار دے دیا۔

زیرِ نظر آیات کریمات جن کو تحویل قبلہ کے واقعہ سے منسلک کیا جاتا ہے اور جن کو نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے تک محدود کیا جاتا ہے' ان آیات میں **کـــذلک** کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم بن جاؤ گے جو تمام دنیا کی نگران ہو اور تمہارا رسول' اور رسول کے بعد' اس کا جانشین' تمہارا نگران رہے۔ ظاہر ہے کہ تمام دنیا کی نگرانی کے لئے قوت و غلبہ پہلی شرط ہے' لیکن نماز سے یہ قوت و غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں نماز کا ذکر نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی ان آیات کا کوئی تعلق نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنے سے متعلق ہے۔

پھراسی آیت میں دوسرا حکم ہے: وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (2:144)- اور جس جگہ تم ہوا کرو' پھیروا پنے منہ کو اسی طرف۔ اس میں بھی ہمارے علماء کرام نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کا مفہوم لیتے ہیں' لیکن قرآن کی رو سے یہ بات صرف نماز تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ میں جدوجہد سے ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی حصہ اور کسی خطہ میں آباد ہوں ان کے سامنے ہر وقت وہ ضابطۂ حیات رہنا چاہئے جو کعبہ کے پیش نظر ہے' کعبہ یعنی کعبہ سے جاری شدہ نظام حیات ان کا مقصد زندگی ہو اور بھی مقصد حیات کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ اس سے مسلمانوں میں یک جہتی اور یک نگاہی پیدا ہوگی اور حصول مقصد کی خواہش اور تحریک تیز سے تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔

(محض ضمناً) عرض ہے کہ قرآنِ کریم کے اس اعلیٰ وارفع تصور کو صرف نماز تک محدود کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ حج کے دوران بھی سارے مسلمان ایک امت واحدہ نہیں بنتے' وہاں بھی مسلمان مختلف اقوام میں منقسم ہوتے ہیں اور ہر قوم کے پیش نظر صرف اپنے وطن کا مفاد ہوتا ہے حج اسلامی نظام کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے یہ عجب بات ہے کہ اس نظام کو تو منقرض ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ گذر گئے' لیکن اس نظام کا سالانہ اجتماع ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہی اجتماع اسلامی نظام کی موجودگی میں ہوتا' تو اس وقت حج کے وہی نتائج آتے جن کا وعدہ قرآن کریم نے کیا ہے۔

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہو گا

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ طلوعِ اسلام کے ناقدین کی خدمتِ عالیہ میں

تحریکِ طلوعِ اسلام کی ابتداء دین کے قیام کی خاطر کی گئی تھی۔ دین کا قیام ہمیشہ انبیاء کرام ہی نے کیا ہے۔ حضرت نوحؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک جتنے بھی انبیاء کرامؑ تشریف لائے انہوں نے سب نے ہی دین کے قیام کی کوششیں کیں۔ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں دین قائم فرما بھی دیا۔ حضور ﷺ کی مملکت دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ حضور ﷺ کے بعد چونکہ انبیاء کرامؑ کا سلسلہ ختم ہوگیا اس لئے دین کے قیام کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کا قائم کردہ نظام خلافت راشدہ تک جاری رہا لیکن بدقسمتی سے ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے وہ نظام منقرض ہوگیا۔ علماء کرام جو خود کو وارث انبیاء بلکہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے برابر سمجھتے ہیں یہ ان کا فرض تھا کہ وہ دین کے قیام کی کوشش کرتے لیکن افسوس، صد افسوس کہ انہوں نے اس کے برعکس خود ملوکیت کا ساتھ دیا اور دین کے قیام میں رکاوٹ بنے رہے۔ بنو عباس کے وہ خلفاء جو نہایت ہی بدکردار اور بدچلن تھے اور جن کے حرم میں دو دو ہزار لونڈیاں رہتی تھیں ہمارے علماء کرام ان کی مدح وستائش کرتے رہے اور انہیں ظل اللہ فی الارض کہتے رہے۔ ان خلفاء کا کردار اس درجہ گھناؤنا تھا، کہ انہوں نے اپنے دفاع کے لئے کوئی راہ ہی نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے دور تک کے علماء المامون جیسی کتابیں لکھتے رہے اور اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کے قصیدے پڑھتے رہے۔ اس ڈیڑھ ہزار سال کے بعد اس سارے طویل عرصہ میں صرف تحریک

طلوع اسلام وہ تحریک ہے جو دین کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کم از کم اس تحریک کے قیام کے بعد تو علماء کرام کو چاہئے تھا کہ وہ لپک کر اس تحریک کا ساتھ دیتے لیکن افسوس کہ انہوں نے اس کی مخالفت ہی جاری رکھی۔ قیام پاکستان سے پیشتر طلوع اسلام نہایت عاجزی وانکساری سے ان حضرات کو دین کی دعوت دیتا رہا لیکن افسوس کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام بجز معدودے چند' کہ جن پر الشاذ کالمعدوم کا اطلاق ہوتا ہے' آخر وقت تک قیام پاکستان کے مخالف رہے' کیونکہ ان کے ہاں دین کا تصور نہ اس وقت تھا اور نہ اس وقت ہے۔

تحریک طلوع اسلام کے خلاف تقریباً دوسو کتابیں شائع ہو چکی ہیں' جس درجہ طلوع اسلام کی تحریک نہایت تیزی سے پھیلتی جارہی ہے' اسی تناسب سے اس کی مخالفت میں بھی شدت آتی جارہی ہے۔ شروع میں تو اس تحریک کا اصل مقصد ہمارے علماء کرام کے سر کے اوپر سے گذر گیا تھا' وہ سمجھے ہی نہیں کہ اس تحریک کا مقصد دین کا قیام ہے وہ صرف غلطی سے یہ سمجھتے رہے کہ یہ تحریک خدانخواستہ حدیث کی منکر ہے۔ لیکن وقت گذرنے کے بعد اس کے مخالفین وناقدین کے زمرہ میں جب ایسے علماء کرام بھی شامل ہوتے گئے جو جدید تعلیم سے واقف اور ڈاکٹریٹ جیسی اعلیٰ سندات کے زیور سے آراستہ تھے' وہ اس تحریک کے اصل مقصد تک پہنچ گئے کہ اس تحریک کا اصل مقصد تو دین کا قیام ہے جس کے لئے طلوع اسلام مرکز ملت کی اصطلاح بھی استعمال کر لیتا ہے۔ شروع میں ہمارے علماء کرام نے اس تحریک کی مخالفت میں فتنۂ انکار حدیث کے عنوان سے کتابیں شائع کیں۔ ان کتابوں میں کسی میں بھی مرکز ملت کا حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی اس کی تردید کی گئی ہے۔ سب سے پہلے مولوی عبدالرحمٰن صاحب کیلانی مرحوم کی کتاب ''آئینۂ پرویزیت'' شائع ہوئی جس میں مرکز ملت پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد' اب اس موجودہ دور میں' جو ضخیم کتابیں' ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل تصنیف کی جارہی ہیں' ان میں البتہ پورے پورے باب مرکز ملت' یعنی قیام دین کی تردید میں رقم کئے جارہے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام کے خلاف جن حلقوں سے یہ کتابیں آ رہی ہیں ہمیں ان کا احترام ہے۔ ان کے اور ہمارے درمیان قرآن کریم کا اشتراک ہے۔ وہ بھی قرآن کے حافظ و عالم ہیں۔ ہم بھی قرآن کریم کے ادنیٰ طالب علم ہیں۔ قرآن سے زیادہ مضبوط اور کوئی رشتہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن فہمی میں سب سے غلطیاں ہوسکتی ہیں لیکن یہ غلطیاں یا نظریات کا اختلاف اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی حافظ و عالم سوقیانہ زبان استعمال کرنے لگے۔ ان محترم حضرات سے اس سے پیشتر بھی درخواست کی گئی تھی کہ سوقیانہ زبان آپ کو زیب نہیں دیتی' اس لئے اس سے اجتناب فرمائیں۔ لیکن یہ حضرات ہمیشہ اس تحریک کے بانی کے متعلق' جھوٹا' دغاباز' دروغ گو' مکار' چالباز جیسے مکروہ الفاظ استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سے پھر گذارش ہے کہ جب وہ قرآن کریم کے حافظ و عالم ہیں' تو پھر قرآن کریم کے اس حکم کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ (49:11)-(ترجمہ) ایک دوسرے کو برا نام نہ دو۔

ناقدین تحریک طلوع اسلام کو اختیار ہے کہ وہ تحریک کے ہر نظریہ کی تغلیط و تردید کرتے رہیں' اور جس قدر چاہیں ضخیم کتب تحریر فرماتے رہیں لیکن یہ بات ہمیشہ خیال شریف میں رکھیں کہ علماء کرام اور تحریک طلوع اسلام کے مابین اصل مبحث و اختلاف مقام حدیث کا ہے۔ اور سارے اختلافات و تنازعات حدیث کے صحیح مقام کے تعین سے ہی پھوٹتے چلے آ رہے ہیں اور اس اختلاف کا باعث مذہب اور دین کے تصور کا اختلاف ہے۔ مذہب میں اگر آپ حدیث کو وحی کا درجہ دیتے ہیں تو اگرچہ یہ نظریہ قرآن کریم کے خلاف ہے لیکن اس سے مسلمانوں کی عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حدیث کے اس مقام سے مسلمانوں کی زندگی میں اثر دین کے قیام پر پڑتا ہے۔ کیونکہ حدیث شریف کو وحی تسلیم کر لینے اور اس کے ذریعے حضور ﷺ کی اطاعت کرنے کے بعد دین کے قیام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی' تحریک طلوع اسلام کو خدانخواستہ حدیث سے کوئی عناد و انکار نہیں ہے۔ تحریک کا اختلاف اس کو وحی قرار دینے پر ہے کیونکہ پھر یہ دین کے قیام میں

مانع اور ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

تحریک طلوع اسلام کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت ایک اطاعت ہے اور وہ اطاعت صرف دین کے قیام کے بعد اس طرح ہوتی ہے کہ اس نظام کے سربراہ کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ زندہ اتھارٹی ہوتی ہے اور یہ زندہ اتھارٹی قرآن وحدیث کے مطابق نظام چلاتی ہے۔ یہ زندہ اتھارٹی قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی ہمیشہ پیش نگاہ رکھتی ہے اور اس نظام کے فیصلوں کی اطاعت ہی اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ حدیث کو وحی قرار دے لیں تو پھر قرآن وحدیث کی دو اطاعتیں بن جاتی ہیں اور ان دونوں کی اطاعت کے لئے پھر زندہ اتھارٹی یا دین کے قیام کی ضرورت نہیں رہتی یہ ہے وہ اصل اختلاف جو علماء کرام اور تحریک کے مابین ہے۔ ہمارے علماء کرام چونکہ دین کے قیام کے مخالف ہیں' اس لئے' اور صرف اس لئے' یہ حضرات حدیث کو وحی قرار دینے پر مصر ہیں تا کہ کہیں دین کا قیام نہ ہو جائے۔

لیکن ہمارے علماء کرام خواہ جس قدر بھی کوشش کر لیں وہ احادیث کو وحی ثابت نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم میں کہیں دور دور بھی وحی خفی کا اشارہ تک نہیں ملتا' ہمارے علماء کرام حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے دو طریقے استعمال کرتے ہیں' ایک تو سورہ نجم کی آیۂ کریمہ' دوسرا طریقہ ہمارے علماء کرام جو اختیار فرماتے ہیں اس کے لئے اردو زبان کا ایک محاورہ بہترین محاکاتی انداز کا ہے۔ چونکہ وہ بے معنی وغیر سنجیدہ ہے اس لئے وہ بصد معذرت تحریر کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات الٹے ہاتھ سے ناک پکڑتے ہیں بجائے اس کے کہ یہ حضرات قرآن کریم میں کسی ایک ایسی آیت کی نشاندہی فرما دیں کہ قرآن کی اس آیت سے حدیث وحی ثابت ہوتی ہے' یا مستنبط ہوتی ہے' یہ حضرات دس یا بارہ آیات کا انتخاب کرتے ہیں' اور اس سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ آیات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتیں جب تک کہ آپ وحی خفی کا اقرار نہ کر لیں۔ چونکہ یہ آیات سمجھ میں نہیں آتیں' اس لئے آپ حدیث کو وحی تسلیم کریں' حالانکہ ان تمام آیات کی تفسیر بار بار پیش کی جا چکی

ہے۔

مقام حدیث کی گفتگو شروع کرنے سے پیشتر بصد معذرت' ایک تسامح کی نشاندہی کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ محترم پرویز صاحب کے حالات کے بارے میں تحریر ہے کہ "اسی دور کے قربِ اختتام پر جناب غلام احمد پرویز صاحب متولد ہوئے۔" اسی طرح ایک اور مقام پر تحریر ہے "1903ء میں متولد ہونے والے پرویز صاحب"۔ یہ متولد ہونا کون سی عربی ہے' عربی قواعد کی رو سے اس موقع کے لئے یہ لفظ ہی غلط ہے۔ درست فقرہ یوں ہونا چاہئے کہ "جناب پرویز صاحب تولد ہوئے۔" بہر حال یہ صرف ضمناً تحریر کیا گیا ہے۔

مقام حدیث کے بارے میں دو اصولی باتیں ہمیشہ پیش نگاہ رکھیں جو نہایت واضح ہیں اور چٹان کی طرح مضبوط ہیں جن کی کوئی شخص تغلیط وتردید نہیں کرسکتا۔

(1) پہلی اصولی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی علم حضور ﷺ کو ملا وہ صرف اور صرف جبریلؑ کی معرفت ملا تھا۔ جبریلؑ کے واسطہ کے بغیر کوئی علم اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو نہیں ملا۔

(2) حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی علم ملا وہ کلام اور الفاظ پر مشتمل ملا تھا۔ بغیر کلام یا بغیر الفاظ کے کوئی علم حضور ﷺ کو نہیں ملا۔

لیکن افسوس کہ ہمارے علمائے کرام ان دونوں شقوں کے مخالف نظریہ کے حامل ہیں۔

پہلی شق کے بارے میں غفران مآب' خلد آشیانی' جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم' سابق خطیب جامع مسجد سریاں والا بازار' لاہور نے اپنی تفسیر میں تمام علماء کرام کو (تحدی) چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص الی یوم القیامت قرآن مجید سے یہ ہرگز ثابت نہیں کر سکے گا کہ محمد رسول اللہ سلام کے ساتھ تمام عمر میں مرتے دم تک صرف ایک دن کوئی ایک بات بھی اللہ تعالیٰ کی بالا بالا بلاواسطہ جبریلؑ ذرہ بھر کبھی ہوئی ہو۔ جملہ آیات قرآن مجید سے صرف یہی امر ثابت ہوتا ہے کہ

بذریعہ جبریل سلام علیہ محمد رسول اللہ سلام علیہ پر وحی صرف قرآن مجید ہی منزل من اللہ ہوتا رہا ہے اور بس"۔ جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم کی تفسیر میں اس نظریہ کی تائید میں دلائل نہیں دیئے گئے ہیں لیکن اس مقام پر انہوں نے صرف یہ دعویٰ ہی تحریر فرمایا ہے اس جگہ انہوں نے کوئی دلیل تحریر نہیں کی ہے لیکن اس کی دلیل اور اس کی تائید میں دیگر مستند تفاسیر کے اقتباسات ہماری طرف سے پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

ارشاد جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ ہوتا ہے: وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی O اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی O عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (53:3-5)-اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا، اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے (ترجمہ جناب شیخ الہند) حاشیہ میں تحریر ہے کہ "یعنی وحی بھیجنے والا تو اصل میں اللہ تعالیٰ ہے لیکن جس کے ذریعے سے وہ وحی آپ تک پہنچتی ہے اور جو بظاہر آپ کو سکھلاتا ہے وہ بہت سخت قوتوں والا بڑا زورآور حسین و وجیہہ فرشتہ ہے جسے جبریلؑ امین کہتے ہیں۔ یہاں حضرت نے اعتراف فرمایا ہے کہ ساری وحی جبریلؑ کی معرفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہے، وحی کی بھی تعریف حضرت عثمانی کی زبانی ہی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں "یعنی کوئی کام تو کیا ایک حرف بھی آپ کے دہنِ مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں "وحی متلو" کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہا جاتا ہے۔" اس اقتباس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت اقدس کے نزدیک وحی کی دو قسمیں ہیں اور دونوں طرح کی وحی جبریل کی معرفت آئی ہے <u>یعنی قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں جبریلؑ کی معرفت آئے ہیں۔</u> آپ اس خط کشیدہ فقرہ کو ذہن مبارک میں محفوظ رکھیں۔

صرف تبعاً یہ تحریر کیا جاتا ہے کہ حضرت اقدس نے اس حاشیہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس میں خود تضاد واقع ہوتا ہے پہلے تو یہ فرمایا "ایک حرف بھی آپ کے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا

جوخواہشِ نفس پرمبنی ہو‘ اس کے بعد فوراً اگلے فقرہ میں ارشاد ہوتا ہے ”بلکہ آپ جو دین کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے مطابق ہوتا ہے“ اس جگہ انہوں نے دین اور دنیا کی تفریق فرمادی ہے۔ لیکن آیۂ کریمہ اور ان کے اپنے ترجمہ سے دین کی تخصیص نہیں ہوتی۔ ان کی دین کی تخصیص سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین کے علاوہ حضورﷺ کے دہن مبارک سے جو الفاظ نکلتے تھے وہ معاذ اللہ خواہش نفس پرمبنی ہوتے تھے یہاں حضرت نے نادانستہ طور پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے‘ وہ ہمارا ہی موقف ہے‘ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے علاوہ جو گفتگو حضورﷺ فرماتے تھے وہ عقل وفراست پرمبنی ہوتی تھی حضرت اقدس نے خواہش نفس کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں‘ ہم عقل وفراست کہتے ہیں۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

(2) علمہ شدید القویٰ کے ذیل میں امام راغب نے فرمایا ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا یہاں قوت والے سے حضرت جبریلؑ علیہ السلام مراد ہیں۔ (مفردات امام راغب)۔

(3) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اکثر اہل تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ شدید القویٰ سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ (تفسیر مظہریٰ جلد 12‘ ص 90)

(4) علمہ‘ ایاہ‘ ملك شديد القوىٰ ذومرةٍ قوةٍ شدةٍ او منظر حسن ای جبریلؑ ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے۔ جو بڑا طاقتور ہے۔ پیدائشی قوی ہے۔ نہایت مضبوط خوبصورت یعنی جبریل علیہ السلام۔ (جلالین)۔

(5) علمہ‘ شدید القویٰ۔ کلام اور صاحب کلام کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ اس فرشتہ (جبریل) کی صفت بیان ہو رہی ہے جس نے اس کلام کو نبی علیہ السلام کو تعلیم دی۔ فرمایا کہ وہ شدید القویٰ یعنی تمام اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور اور اس کی ہر صفت اور صلاحیت نہایت

محکم اور مضبوط ہے۔ (تدبر قرآن' جلد 8' ص 53)۔

(6) علمہ' شدید القویٰ کا ترجمہ آموختہ است اور افرشتہ باقوت صاحبِ حسن۔ اس کی تفسیر میں ارشاد ہوتا ہے علمہ' بیاموز انید و پرا این وحی وآ وردید وفرشتہ شدید القویٰ سخت باقوت یعنی جبریل۔ (از فتح الرحمٰن وتفسیر حسینی)۔

(7) اس تفسیر کو کہ شدید القویٰ سے مراد جبریل ہیں ایک گروہ کثیر نے اختیار کیا ہے۔ من جملہ ان کے طبرسی نے مجمع البیان میں۔ بیضاوی نے انوار التزیل میں' زمخشری نے کشاف میں' قرطبی نے تفسیر روح البیان میں' فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں' سید قطب نے ظلال القرآن میں' مراغی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ طباطبائی نے تفسیر المیز ان میں سب نے یہی تحریر فرمایا ہے۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو اتنے زیادہ حوالہ جات کو مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ تمام حوالہ جات اپنی تائید میں اس لئے پیش کئے ہیں کہ آپ کو حد درجہ یقین آ جائے کہ یہ ہمارا کوئی منفرد موقف نہیں ہے' بلکہ ان تمام تفاسیر کا بھی یہی موقف ہے کہ وحی صرف جبریلؑ کی معرفت آئی ہے۔ جبریلؑ کے واسطے کے بغیر وحی کا ایک لفظ بھی حضورﷺ کو نہیں ملا۔

قرآن کریم کے اس واضح حکم کے بعد اب آپ تحریک طلوع اسلام کے ایک نہایت نمایاں اور سخت گیر اور برافروختہ ناقد صاحب کا بیان بھی ملاحظہ فرمالیں۔ انہوں نے جناب مولانا مودودی صاحب مرحوم کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے اور اس کو درست قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

سہ گونہ وحی

> خدا کی یہ وحی' اس کے نبیوں اور رسولوں کو کن شکلوں اور صورتوں میں کی جاتی تھی؟ سورہ الشوریٰ میں اس کا تذکرہ بایں الفاظ موجود ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَن یُکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیاً اَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُولاً فَیُوحِیَ بِاِذْنِہِ مَا یَشَاءُ اِنَّہُ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (42:51)-

(ترجمہ) کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے' اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ چاہتا ہے وہ کرتا ہے وہ برتر و حکیم ہے۔

اس آیت میں وحی کی تین صورتیں مذکور ہیں۔

(1) القاد الہام' یعنی کسی خیال یا بات کو براہ راست دل میں ڈال دینا' یا خواب کے ذریعے کوئی بات سمجھا دینا یا دکھا دینا جیسے حضرت ابراہیمؑ و حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا۔

(2) پس پردہ کلام' جیسا از روئے قرآن حضرت موسیٰؑ سے کیا گیا۔ وہ اللہ تعالیٰ' کو بغیر دیکھے' اس سے ہم کلامی کا شرف پا رہے تھے۔

(3) بذریعہ فرشتہ القاء و الہام' یہ فرشتہ (جبرئیلؑ) کبھی اپنی اصلی' غیر مرئی شکل میں بھی آیا کرتا تھا اور کبھی انسانی شکل میں اس طرح مرئی و مشاہد ہوا کرتا تھا کہ دیکھنے والے اس کے اصلاً فرشتہ ہونے سے ناواقف و بے خبر ہوا کرتے تھے۔

اِلّا یہ کہ خود' اللہ تعالیٰ کا رسول' اس کے بارے میں حقیقت کو واضح فرما دیتا۔''

اس بیان میں محترم ناقد صاحب نے وحی کی پہلی صورت میں القاء والہام کا جو تصور پیش فرمایا ہے

اس سے مراد یہ ہے کہ یہ علم حضور ﷺ کو بغیر جبرئیلؑ کی وساطت سے ملتا تھا اور اسی کو یہ حضرات حدیث کہتے ہیں اور حدیث کی وجہ سے ہی یہ غلط تصور قائم کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا جناب مولانا مودودی صاحب مرحوم اور عزیز محترم جناب ناقد صاحب کا یہ موقف قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور سترہ تفاسیر کے جو حوالہ جات دیئے گئے ہیں' ان سب کے بھی خلاف ہے۔ یہاں اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ اس کی تفسیر کئی مرتبہ پیش خدمت کی جا چکی ہے۔ اگر کسی صاحب کو دلچسپی ہو تو وہ میری کتاب ''قرآن فہمی کے قرآنی قوانین'' ملاحظہ فرمائیں جس کی Abriged Copy مہیا ہو جاتی ہے۔

یہاں تک گفتگو حدیث شریف کے متعلق کی گئی ہے کہ حدیث شریف کسی طرح بھی وحی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے علماء کرام حدیث کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کا قول فعل اور تقریر حدیث ہوتی ہے لیکن ان اکثر روایات میں تو حضور ﷺ کا قول ہوتا ہی نہیں۔ کل پانچ فیصدی روایات ایسی ہیں جن میں حضور ﷺ کا قول درج ہوتا ہے۔ حوالہ آگے آتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ایک بڑی غلطی ہے کہ ہم جب حدیث کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو یہ روایات ہمارے پیش نظر نہیں ہوتیں۔ ہم کہتے حدیث ہیں اور مراد اس سے یہ روایات ہوتی ہیں۔ حدیث اور روایت میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ یہ اکثر روایات حضور ﷺ کے اقوال نہیں ہیں بلکہ یہ راویوں کے وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں حضور ﷺ کے اقوال و افعال کو روایت کیا گیا ہے۔

ہمارے علماء کرام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ راویوں کے حافظے بڑے اچھے ہوتے تھے اور وہ حضور ﷺ کے الفاظ بجنسہٖ نقل کرتے تھے لیکن ہمارے علماء کرام کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ روایت بالمعنی کرنا بالکل جائز ہے۔ آپ روایت بالمعنی کی روداد ملاحظہ فرمائیں پہلے آپ روایت بالمعنی کا مفہوم سمجھ لیں کہ روایت بالمعنی سے مراد کیا ہے۔

روایت بالمعنی سے مراد یہ ہے کہ راوی حدیث کے الفاظ وکلمات کے بجائے حدیث کے مفہوم ومعنی کو اپنے الفاظ میں بیان کرے۔ یہ راوی کے اپنے الفاظ ہوتے ہیں یہ قول رسول یا نطق رسول قطعاً نہیں ہوتا۔

حافظ ابن صلاح نے روایۃ بالمعنی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

اذا اراد روایۃ ما سمعہ علی معناہ دون لفظہ۔ یعنی جب راوی حدیث کے الفاظ کے بجائے اس کے معنے ومفہوم کی روایت کرے۔

(1) امام رازی فرماتے ہیں:

یجوز نقل الخبر بالمعنی و ھو مذھب الحسن البصری و ابی حنیفہ خلافاً ابن سیرین و بعض المحدثین۔ (توجیہہ النظر۔ص 300)۔

(ترجمہ) امام حسن بصری اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک روایت بالمعنی کی اجازت ہے۔ ابن سیرین اور محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک اس کی اجازت نہیں ہے۔

(2) حافظ ابن رجب نے امام ترمذی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

اما من اقام الاسناد و حفظہ و غیر اللفظ فان ھذا واسع عند اھل العلم اذا لم یتغیر المعنی۔ (شرح علل الترمذی۔ج 1، ص 145)۔

(ترجمہ) جس راوی نے سند کو اچھی طرح حفظ کیا اور اسے برقرار رکھا، لیکن متن میں الفاظ کی تبدیلی کی، تو علمائے حدیث کے ہاں اس پہلو سے بڑی گنجائش ہے۔ بشرطیکہ لفظ کی تبدیلی سے مفہوم میں تبدیلی نہ آئے۔

(3) حافظ ابن حجر کہتے ہیں:

اما الروایۃ بالمعنی فالخلاف فیھا شھیر والاکثر علی الجواز۔ (نزھت الخواطر، ص 94)۔

جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے تو اس بارے میں علماء کا اختلاف مشہور ہے، لیکن جمہور کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے۔

(4) جریر بن حازم کہتے ہیں:

سمعت الحسن یحدث باحادیث الاصل واحد والکلام مختلف۔

(ترجمہ) میں نے حصرت حسن بصری سے کئی ایسی روایات سنیں جن کا مفہوم ایک تھا اور الفاظ مختلف تھے۔

روایت بالمعنی کے بے شمار بیانات احادیث کی کتب میں آئے ہیں۔ان سب کے نقل کرنے سے مضمون طویل ہوتا جاتا ہے لیکن ہم یہاں ایک عقلی دلیل پیش کرتے ہیں۔ہمارے علماء کرام کے نزدیک حدیث کی تعریف یہ ہے کہ قول رسول، فعل رسول اور تقریر رسول حدیث ہوتی ہے۔اس تعریف کے ذیل میں قول رسول کے باللفظ روایت ہونے کی روداد پیش کردی گئی ہے لیکن جو افعال رسول ہیں ان میں تو روایت باللفظ ہو ہی نہیں سکتی۔کیونکہ ان میں حضورﷺ کے الفاظ ہوتے ہی نہیں۔ان میں تو کوئی دوسرا شخص ہی حضورﷺ کے افعال بیان کرے گا۔آپ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(1) حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی میں رسول اللہﷺ سے ملا آپ نے مجھ سے مصافحہ ضرور کیا۔(رواہ ابوداؤد۔تفسیر مظہری، جلد 4، ص 120)۔

(2) شعبی کا بیان ہے کہ جعفر بن ابی طالب جب سفر سے واپس آئے تو رسول اللہﷺ نے

ان کا استقبال کیا اور ان کو چمٹا لیا اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان چوما۔ (رواہٗ ابوداؤد، بحوالہ تفسیر مظہری، ص 120)۔

(3) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے میں سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا، حضور ﷺ نے (سفر میں) دو رکعت سے زائد نہیں پڑھیں۔ (رواہٗ البخاری)۔

(4) صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر حکم کا انتظار کرتے تھے، یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی **قد نری تقلب** الخ اور کعبہ شریف قبلہ مقرر ہوا۔

آپ نے یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائے، یہ حضور ﷺ کی فعلی احادیث ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ ان میں حضور ﷺ کا کوئی قول نہیں ہے لیکن یہ سب راویوں کے الفاظ ہیں، لیکن ہمارے علماء کرام ان کو وحی خیال فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ''مبادی تدبر حدیث'' میں تحریر فرمایا ہے کہ پچانوے فیصدی احادیث روایت بالمعنی ہیں۔ صرف پانچ فیصدی احادیث روایت باللفظ ہیں۔

ہماری گذارش علماء کرام سے بصد ادب و عاجزی یہی ہے کہ وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کریں۔ ہماری بھی تحریک طلوع اسلام سے کوئی خونی رشتہ داری نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس تحریک کی عزت و احترام صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ تحریک خالص قرآنی نظریات کی حامل ہے اور قیام دین کی داعی ہے ہاں اگر ہمارے علماء کرام کسی طور پر بھی ان روایات کو وحی ثابت کر دیں اور دین کے قیام کو لازمی قرار دے دیں تو بے شک ہم ان کا مسلک تسلیم کر لیں گے کیونکہ ہم

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانون کی اہمیت

اللہ تعالیٰ اور انسانیت کے درمیان رابطہ کا واحد ذریعہ نبوت تھی۔ چونکہ نبوت ختم ہوگئی اور اب آئندہ کوئی نبی نہیں آئے گا' اس لئے اب اللہ تعالیٰ اور انسانیت کے رابطہ کا واحد ذریعہ قرآن کریم اور اس کا نظام ہی ہوسکتا ہے' اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور اسلامی نظام کی اہمیت نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں میں حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ وحی خفی' الہام' القاء' وجدان' کشف' رویاء جیسے نظریات اختراع کرکے' قرآن کریم کی اہمیت کو کم کردیا جائے اور اسی طرح دین کی جگہ مذہب کو لاکر' اسلامی نظام کے تصور کو ختم کردیا جائے۔ صدر اول کے بعد سے آج تک ہم مسلمان انہیں عقائد کو لئے چلے آرہے ہیں۔ غیر اسلامی نظام میں قوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں نہایت ذمہ دار حضرات اس فقرہ کو بار بار دہراتے رہتے ہیں' عوام قوت کا سرچشمہ ہیں لیکن یہ نظریہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رو سے قوت کا سرچشمہ قانون (قرآن) ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی فرد یا افراد کا مجموعہ (عوام) قوت کا سرچشمہ نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں بلند ترین مقام جناب رسول اکرم ﷺ کا ہے۔ ان سے بلند تر مقام کسی اور شخص کو نہیں مل سکتا۔ ان کے متعلق ارشاد ہے۔ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَن يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّى مِن دُونِ اللّٰهِ وَلَكِن كُونُواْ رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ**

اُلْکِتَابَ وَبِمَا کُنتُمْ تَدْرُسُونَ (3:79)- کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ خدا تو اس کو کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بنو کیونکہ تم تو (ہمیشہ) کتاب خدا دوسروں کو پڑھاتے رہتے ہو اور تم خود بھی ہمیشہ پڑھتے رہتے ہو۔ آیۂ کریمہ نے واضح کر دیا کہ خود رسول اللہ ﷺ خدا کا حکم چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں فرماتے تھے۔ خود حضور ﷺ کو حکم ہوا: فاحکم بینھم بما انزل اللہ. ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ پھر حضور ﷺ نے خود فرمایا: مَا یَکُونُ لِیٓ اَنْ اُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاء نَفْسِیٓ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحَیٰ اِلَیَّ (10:15)- یہ بات میرے اختیار سے باہر ہے کہ میں اس ضابطہ قانون میں اپنی طرف سے کچھ ردوبدل کر دوں۔ میں تو اسی قانون کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوتا ہے۔ میرا فریضہ اس کا اتباع کرنا ہے نہ کہ اس میں کوئی ردوبدل کرنا۔ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (10:15)- اگر میں بھی اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کروں تو مجھے سزا ملے گی۔ ان اور ان جیسی بے شمار آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترین شخصیت بھی قانون کی پابند ہوتی ہے اور وہ قانون کی گرفت سے باہر نہیں ہوسکتی۔ اسلامی حکومت میں قانون سے استثناء کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ کسی بھی شخصیت کو قانون سے استثنیٰ کا حق دینا قرآن کے خلاف ہے۔

ہمارے ہاں شفاعت کا مسئلہ مسلمہ عقائد میں شمار کیا جاتا ہے اس کے انکار کو توہین رسالت قرار دیا جاتا ہے اسی رمضان میں ایک چینل پر یہ شعر بار بار نشر کیا جارہا تھا۔

کیا خبر کیا سزا مجھ کو ملتی
میرے آقا نے عزت بچا لی
فردِ عصیاں میری مجھ سے لے کر
کالی کمبلی میں اپنی چھپا لی

سعدی نے فرمایا:

شُنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم
بدان را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

شفاعت کا عقیدہ مذہب میں تو چل سکتا ہے کہ اس میں جرم اور گناہ الگ الگ کردیئے جاتے ہیں اور گناہوں کی شفاعت ہوجائے گی۔ چونکہ صدر اول کے بعد سے دین کسی جگہ بھی قائم نہیں ہوا اس لئے یہ خلاف قرآن عقائد اختراع کئے گئے ہیں اور وہ اسی طرح چلتے چلے آرہے ہیں۔ دین میں جرم اور گناہ ایک ہوتا ہے۔ ہر گناہ جرم ہوتا ہے اور ہر جرم گناہ ہوتا ہے۔ جس قوم میں یہ نظریہ ہو کہ آپ جتنے بھی جرائم کرلیں، اور کرتے چلے جائیں، ان کی شفاعت ہوجائے گی، اس معاشرہ کے نظم و نسق کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے وہ ہی ہوگا جو آج ہمارا ہے جس قوم کے یہ عقائد ہوں اور وہ ان عقائد میں تیرہ سو سال سے غرق چلی آرہی ہو اس میں قانون کا احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔

اسی طرح آپ اتباع سنت کے مسئلہ کو لیں، مذہب میں چونکہ حضور ﷺ کے ذاتی اور پرائیویٹ اعمال کو بھی سنت شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا اتباع اپنی پرائیویٹ زندگی میں کرلیا جاتا ہے، ایک مخصوص طرح کا لباس زیب بدن کرنا، ڈاڑھی کو خاص وضع کی تراش وخراش، مسواک، اونچے پاجامے، لمبی لمبی قمیض، بیٹھ کر پانی پینا، کھانے کے بعد اور رات دن مختلف اوقات میں مختلف دعائیں کرکے اتباع سنت کرلیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، ہمارے ہاں برابر امریکہ اور لندن کے حوالے دیئے جاتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ انگلینڈ جمہوریت کی ماں ہے اس لئے جمہوریت سے متعلق اس کے نظائر Precedents اہمیت رکھتے ہیں۔ جب سابقہ صدر صاحب کی Impeachment کا مسئلہ آیا تو یہاں تو کسی کو یہ سزا نہیں دی گئی تھی اور نہ عوام کو اس اصطلاح کا علم تھا تو برابر برطانیہ کا حوالہ دیا جاتا تھا کہ وہاں چارلس کو Impeach

کرنا چاہا تھا۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے نظائر بھی ہماری عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اتباع سنت صرف ذاتی، پرائیویٹ زندگی میں پیشوائیت تک محدود ہو جاتا ہے لیکن اگر آپ دین قائم کریں گے، تو اس میں سارے قوانین قرآن کے جاری ہوں گے اور جو فیصلے حضورﷺ نے اور خلفاء راشدین نے حکومت چلانے کے لئے فرمائے تھے ان کا اتباع سنت نبوی کا اتباع ہوگا اور وہ فیصلے جو یہ نظام قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے بارے میں باہمی مشاورت سے کرے گا، اس بارے میں وہ ان فیصلوں کو بھی سامنے رکھے گا جو اس سے پیشتر حضورﷺ نے فرمائے یا جو خلافتِ راشدہ میں طے پائے تھے، اور یہی اتباع سنت ہوگا۔ اگر اسلامی نظام قائم ہی نہیں ہے، جیسا کہ آج کل نہیں ہے، تو اتباع سنت نہیں ہوسکتا۔ حدیث وسنت کا اتباع صرف اسلامی نظام کی موجودگی میں ہوسکتا ہے اور بس۔

آج کل چونکہ ایک دوسرے کو منکرین حدیث کہنے کا فیشن بہت عام ہوگیا ہے اس لئے اس نکتہ کی مزید وضاحت پیش کی جاتی ہے، حضورﷺ کے ذاتی افعال واعمال سنت میں شامل نہیں تھے۔ اگر حضورﷺ کسی روز چاول تناول فرماتے تھے، تو مدینہ میں تمام صحابہؓ اس روز چاول نہیں کھاتے تھے، کیونکہ یہ حضورﷺ کا ذاتی فعل تھا۔ اگر حضورﷺ اپنے نواسوں کو کندھے پر بٹھا کر بازار میں گھومتے تھے، تو ہمارے لئے ضروری نہیں کہ ہم اپنے نواسوں کو کندھوں پر بٹھا کر بازار میں جائیں۔ اس بات کا کا بھلا دین سے کیا علاقہ؟ سنت حضورﷺ کے صرف وہ افعال تھے جو حضورﷺ نے دین کے قیام کی کوشش یا دین کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں سرانجام دیئے۔ حضورﷺ کے ذاتی اعمال سنت میں شامل نہیں ہیں۔ آج بھی جو لوگ دین کے قیام کی کوشش کریں گے وہ سنت نبوی کا اتباع کریں گے اور جو لوگ دین کے قیام کی کوشش نہیں کرتے وہ نہ سنت کا اتباع کرتے ہیں اور نہ حدیث کا۔ اور وہی لوگ منکرین سنت کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں۔

جہاں تک قانون کی اور جرائم کے انسداد کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ سیکولر سٹیٹ میں جرائم کا انحصار اس سٹیٹ کے نظام اور معاشرہ کے عام حالات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کے معاشی حالات درست ہیں' اور تفتیشی نظام بھی اچھا ہے اور قانون کا اطلاق ہر شخص پر یکساں ہو رہا ہے' تو اس ملک میں جرائم کم ہوں گے' لیکن وہاں بھی اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس ملک کا بااثر طبقہ جرائم کا ارتکاب کرنے کے باوجود قانون کی گرفت سے بچ جائے۔ لیکن اگر ایک سیکولر حکومت میں نظام بھی اچھا نہ ہو' تو وہاں جرائم کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں پاکستان میں ہو رہا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں دین کی بالکل منفرد اور ممتاز حیثیت ہے' دین میں جرم اور گناہ ایک ہی چیز ہے۔ نظام دین کا ہر باشندہ اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ اس کے جرم کے اثرات اس کے نفس پر اسی طرح مرتب ہوتے ہیں جس طرح گناہ کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وَمَن يَكْسِبْ إِثْماً فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ (4:111)-اس لئے دینی معاشرہ میں جو لوگ گناہ نہیں کرتے وہ جرم بھی نہیں کرتے۔ اس کو آپ ایک عام مثال سے سمجھیں۔ جو آپ رات دن اپنے اردگرد ملاحظہ فرماتے رہتے ہیں' اگر ایک شخص سخت گرمی کے موسم میں روزہ سے ہے' وہ گھر میں بالکل تنہا ہے اور اس کو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس فرج میں ٹھنڈا پانی دستیاب ہے لیکن پیاس کی شدت کے باوجود روزہ نہیں توڑے گا' لیکن یہی شخص جب اپنے مکان سے باہر نکل کر' کار چلائے گا تو یہ ٹریفک سگنل کی پروا نہیں کرے گا اور وہ حکومت کی خلاف ورزی کرتا رہے گا۔ وہ زکوۃ تو ضرور ادا کرے گا لیکن ٹیکس چوری کرے گا' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سیکولر حکومت میں جرم کرنے سے اسکو کوئی گناہ نہیں ہوگا' جبکہ روزہ توڑنے سے اسے گناہ ہوتا ہے۔ دین میں چونکہ حکومت کی خلاف ورزی بھی ایسا ہی گناہ ہے جیسا روزہ توڑنا گناہ ہے' اس لئے دین میں جرائم کی روک تھام از خود ہو جاتی ہے۔

آپ کسی سخت بھوکے شخص کے سامنے نہایت لذیذ کھانا رکھ دیں تا کہ وہ اس کو کھا کر اپنی

بھوک دور کردے لیکن جب وہ اس کھانے کو کھانے لگے تو آپ اس کو یہ کہہ دیں کہ اس میں زہر ہے تو وہ شخص اس کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ کھانا اس کو مار دے گا' اسی طرح اگر کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ گورنمنٹ کا ٹیکس چرانے سے جو رقم بچے گی اس کا استعمال اس کے نفس پر نہایت برا اثر مرتب کرے گا۔ جب وہ نفس پر اثرات کے نتیجہ سے بخوبی واقف ہے تو وہ گورنمنٹ کا وہ ٹیکس کبھی چوری نہیں کرے گا' اس طرح ٹیکس بچانے کا جرم از خود ختم ہو جاتا ہے۔ دینی معاشرہ میں جرائم اس وجہ سے نہیں ہوتے چونکہ اس میں جرم اور گناہ ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ ہر گناہ جرم جیسا ہے اور ہر جرم گناہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جرائم کے انسداد کے لئے اور تدابیر بھی ہوتی ہیں۔

(1) قصاص۔ ہمارے ہاں غلطی سے قصاص کے معنے جرم کی سزا دینا خیال کیا جاتا ہے' لیکن یہ درست نہیں ہے' قرآن کی رو سے قصاص کے معنے مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا ہے کہ وہ سزا سے بچ نہ سکے۔ یعنی دین میں کوئی مجرم ایسا نہیں ہوتا جس کو Trace نہ کر لیا گیا ہو۔ اس قسم کے نظام تفتیش کے لئے قرآن کریم فرماتا ہے: **وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ** (2:179)-

(2) عدل یعنی سزا دیتے وقت مجرم کا مقام اور اس کی پوزیشن عدل کے تقاضے پورا کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ جس نے جرم کیا اسے ہی سزا ملے۔ یہ نہ ہو کہ مجرم کی اعلیٰ پوزیشن کی وجہ سے اس کے بجائے' اس کے بدلہ میں کسی اور کو سزا دے دی جائے۔ **الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ** (2:178)- آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے دے غلام۔ آپ غور فرمائیں کہ جس معاشرہ میں کوئی شخص بھی سزا سے نہ بچ سکے۔ اور سزا صرف اسی شخص کو دی جائے جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے' تو وہاں جرائم کس طرح کم ہوتے جائیں گے۔ اسی لئے قرآن کریم نے قصاص کو زندگی محفوظ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

(3) قرآنِ کریم جسمانی سزائیں Corporal Punishments تجویز کرتا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ مجرم کو تو جیل بھیج دیں جہاں وہ آرام سے رہے اور اسکے بیوی بچے بھوکے مر جائیں یعنی جرم وہ شخص کرتا ہے اور سزا اس کی بیوی اور بچوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔

آپ جسمانی سزاؤں کو اپنے موجودہ مقامی حالات کے تناظر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے ملک میں جو جرائم اور خصوصاً مالی لوٹ مار اس طرح ناسور کی طرح پھیل رہی ہے اسکی واحد وجہ سزاؤں کا فقدان ہے۔ ہمارے عمایدین، سربرآوردہ لیڈر اور سیاسی راہنما، قتل، ڈاکہ، زنا، لوٹ مار جیسے بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور ان کو کچھ عرصہ کے لئے قید میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اخبارات، ٹی وی، .A.C سب کچھ تو انہیں مہیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر سے زیادہ آرام سے وہاں رہتے ہیں۔ کھانے ان کی مرضی کے مطابق ان کو دیئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ بااثر ہوتے ہیں، اس لئے کچھ ہی عرصہ بعد رہا ہو کر، ملک سے باہر چلے جاتے ہیں تاکہ حکومت کی گرفت سے باہر نکل جائیں، اور اس آزادی کے بعد وہ پھر اسی طرح کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، اس کا واحد حل یہ ہے کہ ان کو جسمانی سزائیں دیں، ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ کی جسمانی سزا کے بعد ان میں سے کوئی شخص جان بوجھ کر کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اور ہمارا معاشرہ لیڈروں، اور سیاستدانوں کے جرائم سے پاک ہو جائے گا۔

واخردعوانا ان الحمد لله رب العالمين

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق تو یہ ہے عصرِ حاضر عصر ہے پرویز کا

پرستش میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے اور خوئے پرستش ترک کرنے کے لئے بڑا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دو نبیوں نے مل کر بنی اسرائیل کی تربیت کی اور انہیں فرعون کے چنگل سے باہر نکال لائے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی صرف چند روز کی غیر حاضری میں ساری قوم سامری کے جال میں پھنس گئی اور بچھڑے کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اس میں سامری کا کمال کم تھا۔ اس میں انسان کی خوئے پرستش نے زیادہ کردار ادا کیا تھا۔ پرستش کا دارومدار مذہب پر' اور مذہب کا دارومدار پرستش پر ہوتا ہے۔ مذہب یا پرستش کی اگلی اور شاید آخری شکل تصوف ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ایک مرتبہ اس کوچہ میں داخل ہو گیا' اس کا اس سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہماری ساری مسلمان قوم ایک ہزار سال سے تصوف میں ڈوبی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ پرستش' مذہب اور تصوف' تینوں ایک ہی چیز ہیں اور تینوں کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہوتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں اس بات کا دعویٰ ہی نہیں کرتیں کہ ان میں سے کوئی چیز انسانیت کے مسائل حل کر سکتی ہے' یہ مسائل حیات کو نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں بلکہ ان کی طرف توجہ کرنا اور ان کو اہمیت دینا بھی غیر مناسب سمجھتی ہیں۔ پرستش کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کی بے شمار شاخیں ہیں جن کا احصاء کرنا مشکل ہے۔ پہلے معاشرہ میں طبقات پیدا کرنا' اور پھر غریب طبقہ میں خیرات تقسیم کرنا' رمضان میں روزہ افطار کرانا' مساجد کی تعمیر میں چندے دینا اور

ان کی تعمیر میں مدد دینا (9:19)- مزارات پر حاضری دینا' عبادت کے وہ سارے Modes جن میں اسلامی حکومت کی اطاعت شامل نہیں ہوتی' وہ پرستش ہے۔

واضح رہے کہ مذہب اور پرستش کی بنیاد روح اور انفرادی نجات کے غلط تصور پر قائم ہوتی ہے۔ مذہب میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پرستش کرنے سے روح انسانی کا تزکیہ ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی رو سے روحِ انسانی کا تصور ہی غلط ہے۔ قرآن کریم میں روح خداوندی کا ذکر تو ملتا ہے' لیکن روحِ انسانی کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ جب قرآن میں روحِ انسانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے' تو روحانیت کا تصور بھی غلط ہے اور روحانیت سے متعلق تمام عقائد' رسوم' پرستش' تصوف کی پوری عمارت' یہ تمام چیزیں بے بنیاد قرار پا جاتے ہیں۔ روح کے برخلاف قرآن کریم نے نفس انسانی کا تصور دیا ہے اور اس کی نشوونما کو ہی مقصد حیات قرار دیا ہے' لیکن اس کی نشوونما کے لئے پرستش کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی' نفس انسانی کی نشوونما قرآنی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ جو صرف اسلامی نظام میں ہی ہوسکتی ہے۔ نفس انسانی کی نشوونما کے لئے ہی اسلامی نظام کا قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مذہب کے برخلاف دین مسائل حیات حل کرتا ہے۔ دین کی اصل ہی یہ ہے کہ قانون خداوندی کے مطابق فیصلے کرنے سے انسانیت کے مسائل حل ہوتے ہیں: ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَاَحْسَنُ تَاْوِيلاً (4:59)- قانون خداوندی سے مسائل حل کرنے کا طریقہ بہترین طریقہ ہے اور یہ انجام کار معاشرہ کا توازن قائم رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔ دین کی کسوٹی اور اس کی میزان یہ ہے کہ: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (6:135)- ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ' میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں اور اس کے بعد نتائج خود بہت جلد بتا دیں گے کہ آخرالامر کامیابی کس کو نصیب ہوتی ہے اور ظلم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یعنی دین میں نتائج اسی

دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :وَيَا قَوْمِ اعْمَلُواْ عَلَى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُواْ إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ (11:93)- میری قوم تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے چلا جاتا ہوں۔نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ کس پر رسوا کن تباہی کا عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ یہ تحدی اور چیلنج صرف دین ہی کرسکتا ہے۔دین کا وجود خارج میں ہوتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے :وَقُلِ اعْمَلُواْ فَسَيَرَى اللّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ (9:105)- تم عمل کرتے جاؤ' اللہ اور اس کا رسول (اسلامی حکومت کا مرکز) اور مومنین (اس نظام کے ارکان) تمہارے اعمال کی نگرانی کریں گے۔ یہ ہے وہ دین جس کی نگرانی خود رسول کرتا ہے یا اس کے بعد اس نظام کا مرکز کرتا رہتا ہے۔ جو وعدے اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے کئے ہوئے ہیں۔وہ اقامتِ دین کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کے مسائل حل کرتا ہے۔اس کے ذریعے ہی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔دین اور صرف دین ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے توسط سے انسانیت کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے واسطہ سے اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔اگر دین قائم نہ ہو' جس طرح کہ آج کل نہیں ہے تو اللہ و رسول کی اطاعت کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی۔

آپ اس بات پر توجہ فرمائیں کہ ہم مسلمانوں پر پرستش کا اس قدر غلبہ ہے کہ جو چند جماعتیں اقامتِ دین کی داعی ہیں وہ بھی ''پرستش'' کو ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جماعتِ اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مرحوم کی تنظیم اسلامی' دونوں اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہیں لیکن انہوں نے بھی پرستش کو ترک نہیں کیا۔ ایران میں وہاں کے علماء نے اپنے تصور کے مطابق حکومت بھی قائم کرلی' لیکن انہوں نے بھی پرستش کی رسوم کو جاری رکھا۔

صدر اول کے بعد سے ہم مسلمان اسی تاریکی میں ڈوبے چلے آرہے تھے اور پرستش کی

وجہ سے قعر مذلت میں پڑے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں' اور رحمتِ کاملہ سے جناب پرویز صاحب مرحوم نے تحریک طلوع اسلام کی طرح ڈالی یہ تحریک خالص قرآنی عقائد و نظریات کی داعی تھی اور قرآنِ کریم کے خلاف جس قدر عقائد مسلمانوں میں در آئے تھے' اس تحریک نے ان عقائد کو قرآن کی روشنی میں پرکھا اور جو عقیدہ قرآن کے خلاف نظر آیا' اس کو جھٹک کے الگ کر دیا۔ قرآن کریم اور خود تحریک طلوع اسلام شخصیت پرستی کے خلاف ہے' اس لئے پرویز صاحب نے قرآن کی جو خدمت کی ہے' ان کی جگہ تحریک طلوع اسلام کا نام تحریر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ تحریک طلوع اسلام اور پرویز صاحب ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ اس مضمون میں جو Credit تحریک طلوع اسلام کو دیا گیا ہے وہ سب پرویز صاحب کی ذات عالی صفات کے متعلق ہے۔

''پرستش'' اور مذہب کے غلبہ کے اس پس منظر میں جو آپ کے سامنے پیش خدمت کیا گیا ہے تحریک طلوع اسلام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد سے یہ پہلی تحریک ہے جو اقامتِ دین کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ جب نبوت جاری تھی اس دور میں نوح علیہ السلام سے لے کر حضورﷺ تک اقامتِ دین کے داعی صرف انبیاء کرام ہوتے تھے۔ حضورﷺ پر نبوت ختم ہوگئی۔ اس لئے دین قائم کرنا اور اس نظام کو جاری رکھنا خود مسلمانوں کی ذمہ داری تھی لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے ذہن سے وہ تصور ہی جاتا رہا۔ اس وضاحت سے تحریک طلوع اسلام کی اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں اور یہ اندازہ بھی آپ کو ہو گا کہ کس درجہ خوش قسمت ہیں جو اس تحریک سے وابستہ ہیں اور اس طرح آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس بخوبی ہوگا۔

اس تحریک کا Corner-Stone ہی یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر قطعاً حرام ہے' نزول قرآن کے وقت انسانیت بالغ ہو چکی تھی اس لئے قرآن کریم نے شخصی حکومت کو بالکل منع کر دیا۔ انسانیت کے بالغ ہونے کی یہ تین علامات ہیں۔ پہلی علامت تو یہ ہے کہ اس دور کی

انسانیت نے اس ضابطۂ حیات کے مطابق اپنا نظام تشکیل کرلیا۔ دوسری علامت یہ ہے کہ انسانیت وحی کے اصولوں کی جزئیات مقرر کرنے کی اہل ہوگئی تھی۔ اور انسانیت کے بلوغ کی تیسری علامت ختم نبوت ہے۔ انسانیت کے بلوغ کی وجہ سے قرآن کریم نے شخصی حکومت کے بجائے نظام کا تصور روشناس کرایا۔ اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا۔ یہ ہمارے علمائے کرام کا تسامح ہے کہ وہ اللہ ورسول کی اطاعت کو دو اطاعتیں قرار دے کر، حضورﷺ کے بعد حضورﷺ کی ذاتی اطاعت کا ذریعہ احادیث کی اطاعت کو قرار دیتے ہیں اور اس طرح اسلامی نظام کا تصور ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ حضورﷺ کے دور اقدس میں اسلامی مملکت دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی، اتنی بڑی حکومت کا انتظام حضورﷺ خود کرتے تھے۔ حضورﷺ نے جگہ بجگہ شہر بشہر اپنے مقامی اولی الامر (4:83) اور مقامی حکام مقرر کئے ہوئے تھے (2:188) جولوگ مدینہ شریف سے دور افتادہ مقامات پر رہائش پذیر تھے وہ اپنے تنازعات طے کرانے کے لئے دور دراز سے مدینہ شریف حاضر نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے مقامی اولی الامر یا مقامی حکام کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان مقامی حکام کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہو جاتی تھی، کیونکہ اصل مقصود اس نظام کی اطاعت تھی۔ ہم بھی جب چوراہے پر کھڑے ہوئے سپاہی کی اطاعت کرتے ہیں، تو یہ اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے۔ یہ تحریک طلوع اسلام کا منفرد نظریہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ آج بھی اگر ہم اسلامی نظام قائم کر کے اس کی اطاعت کریں گے تو یہ اللہ ورسول کی ہی اطاعت ہوگی۔ اس طرح ''پرستش'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے الصلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن کریم کی رو سے عبادات اور معاملات الگ الگ نہیں ہوتے۔ قرآن کی رو سے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں حکم ہے کہ جب کسی کو قرض دو تو اس کو لکھ لیا کرو جب ہم کسی کو قرض

دیتے ہوئے لکھ لیتے ہیں اس طرح ہم عبادت الٰہی کرتے ہیں۔قرآن کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ اور اقامت دین ایک ہی چیز ہے کیونکہ

(1) قرآن کریم نے الصلوٰۃ اور الدین دونوں کے لئے اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے اور دونوں چیزوں پر عمل ان کی اقامت سے ہوتا ہے، پرستش سے نہیں ہوتا۔

(2) سابقہ تمام انبیاء کرام کو اقامت دین اور اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا جو دونوں ایک ہی چیز تھیں تمام انبیاء کرام نے دین اور صلوٰۃ قائم کی تھی: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ (42:13)- تمہارے لئے دین کا راستہ مقرر کیا گیا، اسی طرح صلوٰۃ کے لئے بھی حکم تھا۔ يَا بُنَيَّ اَقِمِ الصَّلاةَ (31:17, 19:55)-

(3) دین میں فرقہ بندی نہیں ہوسکتی: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيْهِ (42:13)- دین قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بناؤ۔ اسی طرح صلوٰۃ کے بارے میں ارشاد ہوا: وَاَقِيْمُوا الصَّلاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ o مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ (30:31)- اور نماز پڑھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے بنائے۔

(4) ایک آیت تو اس بارے میں کہ اقامت صلوٰۃ اور اقامت دین ایک ہی چیز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَيُقِيْمُوا الصَّلاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (98:5)- نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو تو یہی سچا دین ہے۔ ایک جگہ قرآن نے صلوٰۃ الوسطیٰ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ فرمایا: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (2:238)- اسلامی حکومت کے تمام اداروں کی حفاظت کرو اور خاص طور پر مرکزی حکومت Central Govt. کی حفاظت کرو اور اس کی وضاحت وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ سے کر دی۔ احکام خداوندی کو لے کر کھڑے ہو جاؤ اور اس پر استقامت رکھو۔ اقامت صلوٰۃ میں کسی جگہ پرستش کا تاثر نہیں ملتا۔ یہ جو ہماری پانچ وقت کی نمازیں ہیں یہ بھی اس نظام کا اہم حصہ ہیں۔

احکاماتِ الٰہیہ نافذ کرنے سے پیشتر ہم سجدہ ریز ہوکر اور رکوع میں جاکر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ ہم اس نظام کے فرمانبردار ہیں اور دل سے اس کی فرمانبرداری کرنے کے لئے کمربستہ ہیں۔

قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ اور انسانیت کا رابطہ نبوت کے ذریعہ ہی ہوسکتا تھا' جب حضورﷺ پر نبوت ختم ہوگئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے رابطہ قرآنِ کریم یا قرآن کے نظام کی معرفت ہی قائم ہوسکتا ہے۔لیکن مسلمانوں نے قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے وحی خفی' الہام' القا' کشف' استخارہ' تفاول' ضمیر' خواب' وجدان کے دروازے کھول دیئے جس سے یہ مراد تھی کہ قرآن کے علاوہ ان ذرائع سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جو قرآن کریم کو اس کے اصل مقام پر رکھتی ہے اور قرآن کے علاوہ کسی ذریعہ کو بھی درست قرار نہیں دیتی۔

قرآنِ کریم نے خود ہی قرآن فہمی کے لئے دو اصول مقرر کردیئے ہیں جنہیں قرآن فہمی کے لئے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ایک اصول تو محاورۂ عرب ہے۔کیونکہ قرآن کریم اسی طرز تکلم میں نازل ہوا ہے جس میں عرب خود کلام کرتے تھے۔''بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اور اس کا انداز بیان وہی ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو' قرآن فہمی کا دوسرا اصول جس کی خود قرآن کریم نے نشاندہی کی ہے وہ تصریف آیات ہے۔ارشاد ہوتا ہے: **انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ** (6:65)-آپ غور فرمائیں ہم کس طرح مختلف پہلوؤں سے دلائل پیش کرتے ہیں شاید کہ وہ سمجھ جائیں۔نیز قرآن کے بیان کے مطابق خود حضورﷺ کا طریقہ قرآن فہمی بھی یہی تھا: **وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُواْ دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ** (6:105)-اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیں) اور تاکہ یہ لوگ کہنے لگ جائیں کہ آپ نے قرآن خوب

سمجھا دیا ہے (اورتصریف آیات کی دوسری وجہ یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیات کی خود ہی تبئین کردیں۔

ان بیان کردہ دو اصولوں کے علیٰ الرغم ہمارے مفسرین کرام نے قرآن کی تفسیر میں زیادہ زور شان نزول اور روایات پر دیا ہے لیکن شان نزول کا نظریہ بالبداہت درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔شان نزول کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو اس متعلقہ واقعہ کے بارے میں آیۂ کریمہ نازل ہوجاتی تھی' اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس کی مثالیں پیش خدمتِ عالی کی جائیں۔لیکن یہ بات بادی النظر میں ہی غلط معلوم ہوتی ہے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات کا نزول پیش آمدہ واقعات کے ساتھ وابستہ تھا اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا تو وہ آیت نازل نہ ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر واقعات زیادہ پیش آجاتے تو آیات بھی زیادہ تعداد میں نازل ہوتیں۔ اصل یہ ہے قرآن کریم کا نزول اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق ہوا ہے اور اس میں وہ تمام ہدایات نازل کردی گئی ہیں جو قیامت تک کے لئے انسانوں کے تقاضوں کو پورا کردیتی ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام آیت تو قرآن سے لے لیتے ہیں پھر اس آیت کی شان نزول کتب روایات میں ڈھونڈ ھتے ہیں۔ایک ایک آیت کی کئی کئی شان نزول ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کون سا شان نزول درست ہے اور کونسا غلط ہے۔اس طرح قرآن کریم جو بالکل حق ہے اس کی تفسیر ہمارے مفسرین کرام ضعیف و وضعی احادیث سے کرکے' اس تفسیر کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ تفسیر کرنے میں سابقہ تفاسیر سے سر مو انحراف نہ کریں اور ''سلف صالحین'' نے جو تفسیر کی ہے اس کو من وعن تسلیم کرلیں۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہماری موجودہ دور کی تفاسیر' خواہ وہ عراقی و مصری ہوں' یا ہمارے برصغیر میں تحریر کی گئی ہوں' وہ ''سلف صالحین'' کی سابقہ تفاسیر سے بدرجہا بہتر ہیں' آپ تفسیر طبری اور ابن کثیر کا موازنہ تدبر قرآن' اور تفسیر ''تفہیم القرآن'' سے کریں۔موجودہ دور کی یہ تفاسیر بھی اگرچہ غیر قرآنی اصولوں

کے ماتحت تحریر کی گئی ہیں لیکن سلف صالحین کی سابقہ تفاسیر سے یہ تفاسیر بہت بہتر ہیں۔تحریک طلوع اسلام کا پیش کردہ مفہوم القرآن دینی نقطۂ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے۔اس میں تفسیر و تفہیم کے وہ اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں جو خود قرآن کریم نے متعین فرمائے ہیں۔اس مفہوم میں قرآن کے الفاظ کے وہ معانی لئے گئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت متداول تھے اور چونکہ آیات کی تفسیر آیات سے کی گئی ہے' اور تفسیر کرنے میں کوئی خارجی سہارا نہیں لیا گیا ہے اس لئے اس تفسیر میں خارجی نظریات داخل نہیں ہوسکے ہیں۔اس میں صرف قرآن کریم کے نظریات ہی پیش کئے گئے ہیں۔اس تفسیر کی آیات خود بول کر اپنا مفہوم بیان کردیتی ہیں۔یہ واضح رہے کہ اب تک جس قدر بھی تفاسیر تحریر کی گئی ہیں وہ سب مذہبی نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں اور سب قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ان ہزاروں ہزار تفاسیر میں سے ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو موجودہ ذہن کو مطمئن کرسکے۔تحریک طلوع اسلام کی یہ تفسیر ''مفہوم القرآن'' عصر حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

جہاں تک قرآن کریم کی لغات کا تعلق ہے اس سارے طویل عرصہ میں صرف امام راغب کی مفردات ہی سب حضرات Consult کرتے ہیں۔اس کے علاوہ قرآن کی اور کوئی معتمد علیہ لغت موجود نہیں تھی۔تحریک طلوع اسلام نے قرآن فہمی کے لئے لغات القرآن پیش کی۔اس لغت میں قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی تحریر کئے گئے ہیں جو معانی نزول قرآن کے وقت لئے جاتے تھے۔ یہ لغت 4 ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس لغت کو صرف وہ حضرات ہی Appreciate کرسکتے ہیں جن کو عربی ادب پر عبور حاصل ہو۔ ہمارے علماء کرام میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس ''مفردات'' اور ''کشاف'' موجود ہے تو اس شخص کو قرآن فہمی کے لئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔لیکن کشاف اس دور کے لئے قطعاً کافی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس دور میں قرآن فہمی کے لئے جس شخص کے پاس ''لغات

القرآن‘‘ اور’’مفہوم القرآن‘‘ موجود ہے‘ اسے مزید کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔تحریک طلوع اسلام کی پیش کردہ یہ دو کتابیں قرآن فہمی کے لئے کافی ہیں اور یہ موجودہ دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور یہ لغت اور تفسیر ایسا نظام زندگی پیش کرتی ہیں جو زندگی کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے اور جس میں زمانہ کے ساتھ آگے چلنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ہماری تفاسیر چونکہ ملوکیت کے دور کی تحریر کردہ ہیں اس لئے ان میں سرمایہ داری اور ملکیت زمین کو حددرجہ سمُونے کی کوشش کی گئی ہے۔ملکیت زمین کا تصور اس دور کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں تمام خرابیوں کا اصل سبب یہی جاگیرداری نظام ہے۔قرآن کریم نے ملکیت زمین بالکل ناجائز قرار دی ہے کیونکہ زمین تو انسان کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھی۔اس دور میں زمین کس کی ملکیت تھی۔لیکن قرآن کریم نے یہ بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ زمین کی ملکیت اور جاگیرداری نظام ختم ہوتا چلا جائے گا۔ارشاد ہوا ہے: اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِیۡ الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُھَا مِنۡ اَطۡرَافِھَا (13:41, 21:44)- کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین کو بڑے بڑے جاگیرداروں (اطراف) کے ہاتھ سے چھین کر ان کی مقبوضات کو ختم کرتے چلے جارہے ہیں۔اس موضوع پر تحریک نے بے شمار مضامین اور ایک پوری مبسوط کتاب ’’نظام ربوبیت‘‘ شائع کی ہے۔جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

قرآن کریم کی وہ آیات جو خواتین کے حقوق سے متعلق ہیں‘ ہمارے مفسرین کرام نے ان کی ایسی تفسیر کی جس سے خواتین کے حقوق بالکل پامال وتلف ہو جاتے ہیں۔گذشتہ ادوار میں تو یہ بات چل سکتی تھی جبکہ خواتین کی بڑی تعداد ناخواندہ تھی‘ اور ان کی نگہداشت مردوں کے ذمہ تھی‘ لیکن عصرِ حاضر میں جب خواتین نے بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرلی ہے تو انہیں ابھی اپنے حقوق کے حصول کا احساس ہو گیا ہے۔قرآنِ کریم نے خواتین کے اس درجہ حقوق دیئے ہیں کہ اگر ان حقوق کو ہی واضح کر دیا جائے تو خواتین بالکل مطمئن ہو سکتی ہیں۔اس تحریک نے خواتین

کے حقوق کے سلسلہ میں خاص طور پر توجہ دی ہے۔ اس بارے میں بے شمار مضامین رسالہ طلوع اسلام میں شائع ہوئے اور ایک الگ کتاب ''طاہرہ کے نام'' بھی تحریر کی گئی۔ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوئی ہے کہ یہ خواتین کے حقوق حاصل کرنے کے تمام N.G.Os اور عورت فاؤنڈیشن میں موجود ہوتی ہے۔ آج کل تمام وکلاء اور دانشور اس کتاب سے کماحقہ استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب عصر حاضر کی ایک ایسی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر خواتین کو قرآن کریم پر شبہ کرنے کا موقع ملتا رہتا۔

اس دور میں روس کے زوال سے پیشتر کمیونزم نے بھی بڑی اہمیت حاصل کی ہوئی تھی۔ اصل تو یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء کے بعد سے آج تک انسانی ذہن کوئی ضابطۂ حیات بنا ہی نہیں سکا تھا۔ جس کو اسلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے' کمیونزم کا فلسفہ اور اس کی آئیڈیالوجی پہلی آئیڈیالوجی ہے جو اسلام کے مقابلہ پر آ سکتی تھی۔ اس کی تردید کرنا ہماری پیشوائیت کے بس کی بات نہیں تھی۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

تحریک طلوع اسلام نے کمیونسٹ آئیڈیالوجی کا علمی سطح پر مقابلہ کیا۔ روسی اور چینی دونوں نظریات پر الگ الگ تبصرہ کیا۔ یورپ اور امریکہ جو کمیونزم کے سخت مخالف ہیں ان کے ہاں بھی کمیونزم کی تردید میں اس قدر مضبوط لٹریچر تحریر نہیں کیا گیا جس قدر مضبوط اور عالمانہ لٹریچر اس تحریک نے مہیا کیا ہے۔ آپ اس بات سے اندازہ فرمالیں کہ ہماری پیشوائیت ان مضامین کے Contents تک سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ اسی وجہ سے پیشوائیت کے کسی حلقہ کی طرف سے ان مضامین پر کوئی تبصرہ یا ان مضامین کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اسے شرک (30:31) کے مرادف قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے

رہتا ہے اور نہ رسول سے (6:159) اس کی وجہ سے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی رسوائی ملتی ہے۔ لیکن یہ ایک حیرت کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں میں فرقہ بندی ایک ہزار سال سے چلی آرہی ہے اور اس کو مسلمان تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مزید حیرت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح آیات کے باوجود ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی چلی آرہی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے اور ہماری پیشوائیت اس کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتی۔ بلکہ ہر عالم خود کو کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ منسلک کر لیتا ہے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف ہیں کہ فرقے آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ کریں۔ اور ملک میں فساد برپا نہ ہو اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری اور تعاون کے ساتھ زندگی بسر کرلیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ اتحاد بین المسلمین کے معنے ہی یہ ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی ہی منع ہے خواہ وہ آپس میں کتنی محبت اور الفت سے کیوں نہ رہیں۔ ہماری حکومتیں سارے سال اور خصوصاً محرم سے پیشتر خصوصی طور پر علماء کرام سے امن وامان قائم کرنے کے لئے اپیل کرتی ہیں اور فرقہ بندی کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ جب فرقے علماء نے خود ہی بنائے ہیں' تو یہ فرقہ بندی کو کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ فرقہ بندی میں تو ان نظریات وعقائد کو اور زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے جو باہم مختلف فیہ اور متنازع فیہ ہوتے ہیں۔ اگر ان امتیازی خطوط کو نظر انداز کردیں تو پھر فرقہ کا کمزور ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

اس دور میں ہر وہ نظریہ جو 'مذہب' پیش کرتا ہے' عصرِ حاضر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عصر حاضر میں صرف دین کے نظریے قابل قبول ہوسکتے ہیں۔ تحریک طلوع اسلام نے کوشش کی ہے کہ قرآن جس نظام کو انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے' اسے عصر حاضر کی انسانیت کے سامنے پیش کردے اس امید کے ساتھ کہ آج کی دکھی انسانیت علیٰ وجہ البصیرت

اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس ضابطۂ حیات پر غور کرے۔ اگر عصر حاضر کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچیں کہ واقعاً اس ضابطۂ حیات میں انسانیت کے مسائل کا حل موجود ہے' تو اس پر عملاً تجربہ کریں' اس لئے کہ کسی بھی ضابطۂ حیات کے نتائج جب ہی سامنے آ سکتے ہیں جب اس پر عملاً تجربہ کیا جائے قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے پیش کردہ نظام کو عملاً آزما کر دیکھ لو' اس کے نتائج اس دعویٰ کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔

تحریک طلوع اسلام نے جس قدر بھی نظریات پیش کئے وہ سب اس دور کے مصائب و نوائب کو حل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسلام کا نظام قیام قیامت تک جاری رہے گا اور میری رائے میں اس کی صرف وہ تعبیر قابل عمل ہوگی جو طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی ہے اور وہاں سے ہی پیش کی جائے گی' کیونکہ یہ دور صرف اسی تحریک کا دور ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کُن فیکون کا قرآنی مفہوم

ایک محترم شخصیت جو سیکولر مزاج کے حامل ہیں انہوں نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ تخلیق کائنات کے متعلق قرآن کریم نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ یہ کائنات ایک لمحہ میں کُن کہنے سے وجود میں آ گئی ہے' تو یہ سائنس کی تحقیق اور عام مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ یہ کائنات بتدریج وجود میں آئی ہے۔ان صاحب کے اعتراض کے پیش نظر قرآن کریم کے ان الفاظ کی تشریح پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

اگرچہ قرآنِ کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن یہ تخلیق کائنات اور تخلیق آدم کے متعلق واضح اشارات کرتی چلی جاتی ہے' یہ محسوس کائنات جسے ہم اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہ کس طرح عدم سے وجود میں آ گئی۔اس کا علم فکر انسانی کے بس کی بات نہیں ہے' کوشش مسلسل کے باوجود فکر انسانی اس مسئلہ کا جواب نہیں دے سکتا کہ یہ کائنات از خود کس طرح وجود میں آ گئی۔اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ علت ومعلول کے قانون کے مطابق وجود میں آتا ہے۔کائنات کے وجود کے بارے میں فکر انسانی اس مقام پر جا کر رک جاتا ہے۔یہاں یہ کائنات تو آنکھوں کے سامنے موجود نظر آتی ہے۔لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کس طرح وجود میں آ گئی یعنی اس مقام پر اگرچہ معلول تو نظر آتا ہے لیکن اس کی علت سامنے نہیں آتی۔

سائنس اور قرآنِ کریم دونوں کے مطابق یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کائنات جس شکل

میں آج موجود ہے یہ شروع میں اس شکل میں نہیں تھی یہ کائنات مختلف مدارج طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی ہے۔کائنات کے ارتقاء کے بارے میں رب کے لفظ کو ایک خاص اہمیت ومناسبت حاصل ہے۔دنیا کی کسی زبان میں اللہ کے اسماء میں کوئی ایسا نام نہیں پایا جاتا جو رَبّ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔رب کے تو مفہوم میں ہی یہ شامل ہے کہ وہ کائنات اور اشیائے کائنات کو نشو ونما دیتے ہوئے ان کے نقطۂ آغاز سے مقام تکمیل تک پہچانے والا اور اس طرح اشیائے کائنات اور کائنات کو ارتقائی مراحل طے کراتے ہوئے ان کی مضمر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے والا ہے۔ انگریزی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لئے Lord یا god کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو ان میں یہ وسیع مفہوم کبھی بھی نہیں سما سکتا۔رب کا لفظ خود کائنات کے بتدریج وجود میں آنے پر دال ہے۔

سائنسی امور اور قوانین فطرت کے متعلق قرآن کریم کا اپنا ایک واضح نظریہ بیان فرما دیا گیا ہے۔اس کا ارشاد ہے:اَلاَ لَہُ الْخَلْقُ وَالاَمْرُ (7:54)-آگاہ رہو کہ عالم امر اور عالم خلق دونوں اللہ کے لئے ہیں۔خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔خدا اس وقت بھی خدا تھا جب کائنات وجود میں نہیں آئی تھی۔خدا کی پیدا کردہ صرف یہ دنیا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بہت کچھ اس کا تخلیق کردہ ہے۔عالم امر کے متعلق کوئی سائنس دان نہیں جان سکتا کہ وہ کیا ہے بس اتنا معلوم ہے کہ وہاں خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔اسی عالم امر میں ہر طرح کے فیصلے ہوتے ہیں اور وہاں ہی ہر طرح کی تدبیر امور کی جاتی ہے۔یَفْعَلُ مَا یَشَاء (22:18)-وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (22:14)-خدا اپنے ارادہ کے مطابق جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْد (5:1)-وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (11:107)-بے شک تیرا رب اپنے ارادوں کے مطابق جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے لیکن خدا کا وہ ارادہ جو وہاں بالکل آزاد تھا عالم خلق میں آ کر قانون کا پابند ہو جاتا ہے۔وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَراً مَّقْدُوراً (33:38)-خدا کا امر پیمانوں کا پابند ہو گیا۔قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ

قَدْرًا (65:3)- خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔اس کائنات میں خدا کے مقرر کردہ یہی وہ پیمانے ہیں جنہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں وَاِذَا قَضَىٰ اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ (2:117)- جب وہ ایک امر (تدبیر) کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا' تو وہ ہو جاتا ہے۔خدا کا یہ امر کیا ہوتا ہے اور یہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق عالم امر سے ہے اس لئے یہ سائنس یا فہمِ انسانی کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔البتہ جب یہ عالم خلق کی منزل میں آتا ہے تو اس منزل میں وہ شے محسوس شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ مرحلہ ہے محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا قرآن کریم نے اس کے لئے فطر اور بدع کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ (2:117)- اور فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ (12:101)- دونوں الفاظ استعمال کئے ہیں۔یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لایا ہے۔اس سے آگے کوئی بات ذہنِ انسانی میں نہیں آ سکتی کہ کوئی شے عدم سے وجود میں کس طرح آ سکتی ہے۔لیکن یہ تمام اشیاء ہمارے سامنے ہیں۔ان کے وجود سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ عدم سے وجود میں کس طرح آ گئیں۔

تخلیق کائنات کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: خدا ہی تو ہے جس نے سارے آسمانوں اور زمین اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں ان کو چھ ادوار میں پیدا کیا (32:4)- پھر اس آیۂ کریمہ سے بالکل متصل اگلی آیت میں ادوار کی خود ہی وضاحت فرما دی جب ارشاد فرمایا کہ: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (32:5)- آسمان سے زمین تک کے ہر امر کی وہی تدبیر کرتا ہے۔پھر اس دن کی مقدار تمہارے شمار سے دس ہزار برس کی ہوگی۔ان دونوں آیات میں تخلیق

کائنات کے طریقے کی وضاحت آ گئی ہے کہ ارض وسمٰوٰت اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اللہ نے ہی تخلیق کیا ہے اور یہ کائنات ایک دن میں اس طرح سامنے نہیں آئی بلکہ اس کے لئے طویل عرصہ درکار رہوا ہے جو ہمارے شمار میں نہیں آ سکتا۔ قرآن کریم نے ان ہی اشارات پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مختلف مقامات پر مزید تشریحات بھی آتی گئی ہیں۔ اللہ نے زمین کو دو ادوار میں پیدا کیا: خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (41:9)- زمین کو دو ادوار میں پیدا کیا۔ اس طرح سماء کو بھی دو ادوار Stages میں پیدا کیا: فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (41:12)- اس نے دو ادوار میں بہت سے آسمان بنائے اور زمین اور آسمانوں کے مابین جو کچھ ہے دو مراحل میں ان کو پیدا کیا۔ اس طرح زمین و آسمان اور ان کے مابین جو کچھ ہے سب کو اللہ تعالیٰ نے چھ مراحل میں پیدا کیا' جن کا شمار ہمارے لاکھوں سالوں میں ہوتا ہے اور وہ آج بھی اس تخلیق میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ یَزِیْدُ فِیْ الْخَلْقِ مَا یَشَاءُ (35:1)- اس میں تو اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں تک سیکولر حضرات کے اعتراض کا جواب پیش خدمت عالی کیا گیا ہے۔ سیکولر مزاج کے حضرات یہاں تک ہی پہنچتے ہیں۔ ان کا غور وفکر اور ان کی بحث صرف کائنات کی تخلیق تک ہی رہتی ہے۔ انہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ اور یہ کب تک معرضِ وجود میں رہے گی۔ قرآن کریم تو وحی الٰہی ہے۔ وہ ان تمام سوالات کا احاطہ کرتا ہے جو کسی بھی دور میں عقل انسانی کے سامنے آسکتے ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ:

(1) اللہ تعالیٰ نے ارض وسمٰوٰت کو بالحق پیدا کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (6:73)-

وہی تو وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔

(2) اس نے کائنات کو باطل (بغیر کسی مقصد کے) پیدا نہیں کیا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلاً (38:27)-

اور ہم نے آسمان وزمین اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہے بیکار پیدانہیں کیا۔

(3) اس کائنات کوکھیل تماشے کے لئے پیدانہیں کیا گیا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لاعِبِيْنَ(44:38)-

اور ہم نے سارے آسمان وزمین اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہے ان کوکھیل کے لئے پیدانہیں کیا۔

(4) تخلیق ارض وسما کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کواس کے اعمال کا بدلہ مل سکے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22)-

اور خدا نے سارے آسمان وزمین کو بامقصد پیدا کیا تاکہ ہر شخص کواس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اوران پرکسی طرح کا ظلم نہ کیا جائے۔

(5) ارض وسمٰوٰت کی تخلیق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک متعینہ معیاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (46:3)-

ہم نے سارے زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو بامقصد اورایک خاص وقت تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

(6) ساری کائنات اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔

اَلا اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (10:55)-

آگاہ رہو جوکچھ آسمانوں اورزمین میں ہے وہ اللہ کے پروگرام کی تکمیل کر

رہا ہے۔

(7) کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً مِّنْهُ -(45:13)

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

تخلیق کائنات کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَا هُمَا (21:30)- یہ لوگ جو کافر ہو بیٹھے ہیں کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بستہ تھے۔ پھر یہ پھٹ کر الگ الگ ہوئے ہیں، زمین و آسمان الگ الگ ہونے سے پیشتر دھوئیں کی صورت میں تھے: وَهِيَ دُخَانٌ (41:11)- یہ دُخان Nebula کی قسم کی تھی جس میں اجرام فلکی کی پہلے پہل نمود ہوئی۔ پہلے یہ ہیولیٰ ایک ہی تھا اس کے بعد اس میں سے اس کے Splinters اس سے پھٹ کر الگ ہوتے رہے اور مختلف اجرام الگ الگ ہو گئے، اس کا ذکر سابقہ آیۂ کریمہ (21:30)- میں ہوا ہے، موجودہ دور میں سائنس کی اصطلاح میں اس کو Big Bang Theory کہتے ہیں۔ زمین کے متعلق قرآن کریم میں بار بار تذکرہ ہوا ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا (79:30)- اس کے بعد زمین کو اس طرح دور پھینکا اور یہ کرے اس طرح تیزی و سرعت سے الگ الگ ہوئے کہ: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (21:33)- ان میں سے ہر ایک کرہ اپنے مدار (Orbit) میں گھومتا چلا جا رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ زمین برابر محو گردش ہے، لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور ہم سکون و آرام سے اس میں چلتے پھرتے رہتے ہیں -(16:15)

کائنات کا یہ سلسلہ اس قدر وسیع وعریض اور حیران کن ہے کہ انسانی فکر اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ستاروں اور کروں کی نئی پیدائش کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے۔وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ (50:38)-اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ مراحل میں پیدا کر دیا (لیکن اس کے باوجود) ہم کو تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں۔اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ستاروں اور کرّوں کی پیدائش کا سلسلہ اب بھی جاری ہے' کیونکہ خدا اب تک نہیں تھکا۔پھر اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا:يَسْـاَلُـهُ مَـن فِـيْ السَّـمَـاوَاتِ وَالْاَرْضِ كُـلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ (55:29)-کائنات کی ہر چیز اپنی نشوونما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے اور کائنات کی تمام اشیاء کے تقاضے ہر دور میں مختلف ہوتے رہتے ہیں'ان کی مختلف حالتوں میں نشوونما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں' اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر حالت کے مطابق ان کی نشوونما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے (14:34)-

یہ عظیم الشان اور حیرت انگیز آیات ہیں جن کا ثبوت ہزاروں مشاہدوں اور تجربوں کے بعد موجودہ سائنس نے فراہم کیا ہے اور سائنس دان حضرات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تخلیق وتخریب کا ایک ہی قانون ساری کائنات کو محیط اور اس میں کارفرما ہے اور اسی وجہ سے تمام کائنات ایک وحدت میں منسلک ہے' جس کی تدبیر ایک ہی مدبر اعلیٰ کے اختیار میں ہے اور وہی مدبر اعلیٰ و بزرگ وبرتر ہستی اللہ تعالیٰ کے مبارک نام سے موسوم ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ کریم کے الفاظ ہی وحی الٰہی ہونے کی دلیل ہیں

قرآن کریم نے اپنے وحی الٰہی ہونے کے دعویٰ کو قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ نزول قرآن کریم کے وقت بھی اور ابھی بھی اس کا وحی ہونے کا دعویٰ اس کی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کتاب سے بہتر ''ضابطہ حیات'' اور کسی کتاب میں نہیں مل سکتا (28:49)- ہمارے علمائے کرام نے قرآن کی اس تحدی کو اس کی زبان اور عبارت تک محدود کیا ہے ان کا خیال ہے کہ چونکہ قرآن کریم جیسی بے مثل زبان کوئی اور تحریر نہیں کرسکتا اس لئے یہ وحی الٰہی ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں عرب کے شعراء وفصحا کے کلام ہی کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بات یقیناً درست ہے کہ زبان کے اعتبار سے بھی قرآن کریم ایک منفرد معجزہ ہے۔لیکن اس کا اصل اعجاز اس کا ''بے مثال ضابطۂ حیات'' ہے۔انسانی ذہن اس بات سے عاجز ہے کہ وہ کوئی ایسا ضابطۂ حیات وضع کرسکے جس میں انسانی نفس اور انسانی جسم دونوں کی پرورش ہو سکے۔انسانی جسم کا تقاضہ دوسروں کے مفادات کو پامال کرکے' اپنے لئے مال ودولت جمع کرنا ہے' اس کے برخلاف نفس انسانی کی نشوونما کا تقاضا' اپنے مال و دولت کو دوسروں پر خرچ کرنا اور دوسروں کے مفادات کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دینا ہے۔ان دونوں کی نشوونما کرنے میں ہر وقت یہ Tie پڑی رہتی ہے۔سیکولر نظامہائے زندگی میں صرف جسم کے مفادات کو پیش نگاہ رکھا جاتا ہے' اس نظام میں نفس انسانی کی پرورش نہیں ہوسکتی۔کیونکہ اس نظام میں اقدار کا کوئی تصور

نہیں ہوتا۔ جہاں تک رہبانیت کی زندگی کا تعلق ہے وہ چونکہ گوشوں اور زاویوں میں بسر ہوتی ہے اور وہاں مفادات کا ٹکراؤ ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہاں بھی اقدار کا تصور یا ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم ہی ایک ایسا منفرد ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے کہ اگر اس کے مطابق معاشرہ قائم کر دیا جائے تو اس میں نفس (جان' زندگی) اور جسم دونوں کی پرورش بیک وقت ہوتی چلی جاتی ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کی زبان کا تعلق ہے اگر آپ قرآن کے دعویٔ اعجاز کو صرف اس کی زبان تک محدود کر دیں گے تو اس دعویٰ کا مخاطب غیر عرب نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کا ایک عذر یہ ہوسکتا ہے کہ چونکہ عربی ان کی مادری زبان نہیں ہے' اس لئے وہ اس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآنِ کریم کی زبان بھی اس معنے میں ایک معجزہ ہوسکتی ہے کہ اس میں وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معانی نزول قرآن کے وقت فہم انسانی کی دسترس سے باہر تھے۔ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرتا چلا جا رہا ہے ان الفاظ کے وہ معانی نمودار ہوتے چلے جا رہے ہیں جو ان کا اصل مفہوم و منطوق ہیں۔ اس بارے میں بے شمار آیات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس مضمون میں صرف چند الفاظ و آیات کا مفہوم پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

(1) ارشاد ہوتا ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ O وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ O فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ O يَسْئَلُهٗ مَنْ فِى السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ O (55:26-29)- جو (مخلوق) زمین پر ہے سب فنا ہونے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات' جو عظمت و کرامت والی ہے' باقی رہ جائے گی۔ تو تم دونوں اپنے مالک کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے۔ اور جتنے لوگ آسمان و زمین میں ہیں (سب) اسی سے مانگتے ہیں۔ وہ ہر روز مخلوق کے ایک کام میں ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں دو الفاظ فان وشان بڑے غور طلب ہیں۔ کل من علیھا فان کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(1) جو کوئی زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے۔ حضرت شیخ الہند۔

(2) روئے زمین پر جو بھی ہے فانی ہے۔(تدبر قرآن)۔حضرت شیخ الہند۔

(3) وہ تمام لوگ کہ جو زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔تفسیر نمونہ۔

(4) جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے۔تفسیر معارف القرآن۔

(5) جلالین نے فانٍ کا ترجمہ ھالک کیا ہے۔

تمام مفسرین نے فانٍ کا ترجمہ فنا ہونے والا کیا ہے اوراس کی تفسیر میں سب نے تقریباً یہی کہا ہے کہ ایک دن یہ ساری چیزیں فنا ہو جائیں گی صرف اللہ تعالیٰ کی باعظمت اور سزاوار تعظیم ذات باقی رہ جائے گی جس کے حضور سب کی پیشی ہونی ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ سزاوار ہوگا کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کے آگے دم مار سکے یا اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لئے زبان کھول سکے۔

ان تمام تفاسیر کے علی الرغم ''لغات'' میں اس لفظ کا وہی مفہوم دیا گیا ہے جو قرآن کریم کے وحی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔''لغات'' میں تحریر ہے کہ'' فنا کے معنے تغیر پذیر ہونا ہے۔ **کل من علیھا فان** میں **فان** اسم فاعل ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ سب کچھ معدوم ہو جائے گا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس میں ہر وقت تغیر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر چیز تغیر پذیر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔خدا چونکہ مکمل اور مطلق ذات ہے'اس لئے اس میں تغیر کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ہمارے دور کی علمی سطح یہاں تک ہی پہنچی ہے کہ ہر چیز میں ہر وقت تغیر ہو رہا ہے۔قرآن کریم کی یہ آیت اس مفہوم کو ہی ادا کر رہی ہے۔

آیت کریمہ کے اگلے حصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔**یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ** (55:29)-اس کے تراجم ملاحظہ فرمائیں:

(1) اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں اور زمین میں' ہر روز اس کو ایک دھندا ہے۔

(حضرت شیخ الہند)۔

(2) اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں اور زمین میں۔ ہر روز اس کو ایک دھندا ہے۔ (تفسیر معارف القرآن)۔

(3) اسی سے مانگتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ہے۔ (تفسیر تدبر قرآن)۔

اس آیۂ کریمہ میں لفظ شان کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند نے تحریر فرمایا ہے۔ ہر وقت اس کا الگ کام ہے اور ہر روز اس کی نئی شان ہے۔ کسی کو مارنا' کسی کو جلانا' کسی کو بیمار کرنا' کسی کو تندرست کر دینا' کسی کو بڑھانا' کسی کو گھٹانا' کسی کو دینا' کسی سے لینا' اس کی شیئون میں داخل ہیں۔

اس آیت کا درست مفہوم ''لغات'' میں اس طرح تحریر ہے'' اس آیت میں ھو سے مراد اللہ لیا جاتا ہے' اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ ہر آن ایک شان میں ہوتا ہے۔ خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے۔ جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے۔ اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں ھو سے مراد من فی السمٰوٰت والارض لیا جائے تو بہتر ہے۔ اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو ونما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے اور ان اشیاء کی نشو ونما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشو ونما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے (14:34)- اور اس طرح اشیائے کائنات کی Development کا سلسلہ' قانون ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح قرآن کریم کی زبان وعبارت اپنے معانی کی ادائیگی

اور اس کے اظہار سے وحی الٰہی ثابت ہو رہی ہے۔

اب ایسی ہی دوسری آیہ کریمہ ملاحظہ فرمائیں جس کے الفاظ ہی قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وَهُوَ الَّذِىَ اَنشَاَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (6:98)-(ترجمہ) وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے۔ پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی جگہ۔

اس آیہ کریمہ کے دو الفاظ مستقر اور مستودع نہایت قابل توجہ ہیں۔

ہمارے سابقہ مفسرین کرام نے عموماً مستقر سے مراد دنیا اور مستودع سے مراد قبر لیا ہے۔ چنانچہ تفسیر مظہری میں تحریر ہے مستقر اسم مفعول ہے یعنی تم میں سے بعض (زمین کے اوپر) ٹھہرائے گئے ہیں' یا مصدر میمی یعنی تمہارے لئے زمین میں ٹھہراؤ ہے۔ تفسیر معارف القرآن نے بھی یہی معنی لئے ہیں فرمایا اور علماء تفسیر کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ کسی نے فرمایا مستودع ماں کا پیٹ اور مستقر یہ دنیا ہے کسی نے فرمایا کہ مستودع قبر ہے اور مستقر دار آخرت' حضرت شیخ الہند نے تحریر فرمایا۔ مستقر ٹھہرنے کی جگہ جسے ٹھکانا کہا اور مستودع سپرد کئے جانے اور امانت رکھے جانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اب اس بارے میں قرآن کریم کی سنئے۔

نزول قرآن کے وقت کسی جگہ بھی زندگی کی ابتداء اور اس کے نشو ونما کے طریقوں سے کوئی آگاہی نہیں تھی۔ عرب سوسائٹی میں یہ مباحث اس وقت زیر غور ہی نہیں تھے۔ قرآن کریم نے ان مباحث کی ابتدا کی اور زندگی کو جامد شے کے بجائے متحرک قرار دیا۔ قرآن کریم کی رو سے زندگی اپنے اولین جرثومہ (Proto Plasm) سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتے چلی گئی۔ اس کے بڑھنے کی یہ صورت ہوتی تھی کہ یہ ایک مقام پر آ کر تھوڑی دیر کے لئے رکتی وہاں کے ماحول سے سامان نشو ونما حاصل کرتی اور اتنی توانائی حاصل کر لیتی کہ اگلی منزل میں قدم رکھ سکے۔ زندگی

اس طرح چلتی رکتی اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے' ان منازل کے لئے قرآن کریم نے مستقر اور مستودع کے الفاظ استعمال کئے ہیں' مستقر وہ مقام ہے جہاں فطرت نے زندگی کو بطور امانت کے رکھا ہے اور جب یہ امانت اگلی منزل میں داخل ہوتی ہے یہ اس کا مستودع ہے۔ گویا یہ امانت اس کے سپرد ہو گئی جس کی وہ امانت تھی اور اس طرح مستودع اور مستودع کی منازل طے کرتی ہوئی زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری حد کو پہنچ گئی۔ قرآن نے فرمایا کہ ہم نے اپنی آیات کو غور و فکر کرنے والوں کے لئے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

نزول قرآن کے دور میں یہ دو اصطلاحات صرف قرآن ہی بیان کر سکتا تھا لیکن افسوس کہ ہمارے مفسرین کرام ان کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکے۔

قرآن کریم نے اپنے لئے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ فرمایا اور تحدی کی کہ اس کی آیات پر غور و فکر کرو تو اس کی تعلیم خود اس کے وحی ہونے کو ثابت کر دے گی' قرآن کریم بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس موضوع پر اتنی آیات ہیں کہ ان کا احصاء کرنا مشکل ہے' اس بارے میں سورۃ محمد میں ارشاد ہوتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلَى قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا (47:24)۔ اس کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(1) کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں؟ یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب)

(2) بالکل یہی ترجمہ حضرت شیخ الہند نے فرمایا ہے۔

(3) کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔

(4) پکتھال نے اس کا ترجمہ لکھا ہے۔

Will they then not meditate on the Quran or are there locks on their hearts.

آپ تمام تراجم وتفاسیر ملاحظہ فرمالیں سب نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ کیا ان کے دلوں پر قفل پڑ گئے ہیں۔ ان سب حضرات نے اقفالھا میں ھا کی ضمیر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ آیت کا اصل ترجمہ یہ ہے کہ کیا ان کے دلوں پر دلوں کے ہی قفل پڑ گئے ہیں۔

دلوں پر دلوں کے قفل پڑنا' اس دور میں قرآن ہی کہہ سکتا تھا اور اس کو آج کے دور میں سائیکولوجی کے ماہرین ہی Appreciate کر سکتے ہیں۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ کیا ان کے دلوں پر ان کے دلوں کے تالے پڑ گئے ہیں جو وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمان ممالک میں بیداری کی لہر

مسلمان خواہ وہ مسلم ممالک میں رہ رہے ہوں اور خواہ وہ غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہوں' انہوں نے تقریباً دوسوسال تک مغربی ممالک کے زیر حکومت مُردوں کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں دنیا کے سیاسی حالات کے تبدیل ہونے سے انہیں ازخود آزادی حاصل ہوگئی ہے۔ اگر یورپ کی دو جنگیں نہ ہوتیں اور امریکا کا دباؤ نہ ہوتا' تو ہندوستان بھی شاید آزاد نہ ہوتا۔ مسلم ممالک میں مسلمانوں کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے۔ تو اس کے حصول میں مسلمانوں کا اپنا کردار بہت معمولی تھا۔ سیاسی حالات کے تقاضوں کی وجہ سے انہیں آزادی حاصل ہوئی ہے۔ یہ آزادی برقرار رہتی لیکن مسلمانوں کی بدنصیبی کہ ان کے ہر ملک کی قیادت بددیانت' نااہل اور اقتدار کے لئے مرمٹنے والی ہے۔ وہ لیڈرز اپنی جان تو دے سکتے ہیں' لیکن اقتدار چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ پھر اقتدار کی یہ ہوس ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کی حد درجہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بعد یہ اقتدار ان کی اولاد میں پشت در پشت چلتا رہے۔ سیریا کے حافظ الاسد' مصر کے حسنی مبارک اور لیبیا کے قذافی اور ہمارے ملک کے قائدین و اکابرین' اس ہوس کے محسوس پیکر ہیں۔ آج مسلم ممالک میں جو بیداری کی لہر آئی ہے۔ اگرچہ وہ ایک خوش آئند بات ہے لیکن جس طرح وہاں نااہل اور کرپٹ قیادت کی ہدایت پر جوانوں کا خون بہایا جارہا ہے' اس پر خوں کے آنسو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں۔ جس طرح مسلمان خواتین کا

شیر، مسلم مما لک کی گلیوں میں' لہوہو کر بہہ رہا ہے' وہ مسلم امت کو خاک وخوں میں غلطاں کررہا ہے۔ قومیں قربانیاں دیتی ہیں لیکن جن قربانیوں کا سبب غیر نہیں بلکہ اپنے ہی ہوں اور جن قربانیوں کے خون کا رائیگاں جانے کا خدشہ ہو' ان قربانیوں پر دل اور بھی بے تاب ہوتا ہے' مصری اخبارات میں ایسی تصاویر شدت سے آتی ہیں جن میں مصری نوجوان جیل کی کوٹھڑیوں میں قید بھگت رہے ہیں اور ان سے ملنے کے لئے ان کی جوان بیویاں کوٹھڑی کے باہر کھڑی ہیں۔ ان نوجوان لڑکیوں کی گود میں ننھے ننھے بچے بھی ہوتے ہیں۔ وہ اتنے معصوم ہوتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کا باپ جیل کے اندر ہے اور وہ کسی اپنے جرم کی وجہ سے جیل میں نہیں ہے بلکہ اپنی قوم کی خاطر یہ قربانی دے رہا ہے۔ اس قسم کے فوٹو دیکھ کر دل کٹ جاتا ہے اور جگر پھٹنے لگتا ہے۔ ان فداکاروں اور جانثاروں کے لئے قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا** (33:23)- ایمان والوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خدا سے انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا' اسے پورا کر دکھایا۔ غرض ان میں سے بعض وہ ہیں جو مر کر اپنا وعدہ پورا کر گئے اور ان میں سے بعض منتظر بیٹھے ہیں۔ لیکن انہوں نے (اپنے تمام مصائب ومشکلات کے باوجود) اپنا مشن نہیں بدلا اور اپنی بات پر قائم ہیں۔ کیا اعلیٰ مقام ہے ان لوگوں کا اور کس درجہ تعریف وتوصیف کے حقدار ہیں یہ لوگ۔

مسلمانوں کی تباہی کا کوئی ایک سبب نہیں ہے بلکہ ان کی تباہی کے کئی اسباب ہیں مگر اس تباہی کا بنیادی سبب مسلمانوں کا اپنی آئیڈیالوجی' یعنی قرآن کریم کے نظام کو چھوڑنا ہے۔ کسی قوم کی ترقی کے لئے دو اسباب ہونے ضروری ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسی آئیڈیالوجی' جو وقت کے تقاضے پورے کرنے کے علاوہ آئندہ کے تقاضوں کو بھی Face کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور دوسرا سبب اس قوم کی اچھی قیادت۔ اگر آئیڈیالوجی مضبوط اور صحت مند ہے تو قیادت خودبخود اس

سے نکل آتی ہے کیونکہ ایک صحت مند آئیڈیالوجی کی یہ اپنی خصوصیت اور اس کی یہ تنومندی ہوتی ہے کہ وہ ایک صالح قیادت پیدا کرے جس کی وجہ سے دنیا میں اقتدار ملتا ہے اور یہ اقتدار خود اس آئیڈیالوجی پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے (24:55)- مسلمانوں کی بدقسمتی کہ انہوں نے اپنی آئیڈیالوجی بھی چھوڑی اور پھر اس کے نتیجہ میں ان کی قیادت بھی نااہل پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ قرآن کریم ہماری آئیڈیالوجی اور حضور اکرم ﷺ ہمارے اولین قائد تھے۔ قرآن کریم نے انسانیت کو پہلی بار نظام کے تصور سے آشنا کرایا اور اس نظام کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیا۔ اس میں اطاعت حضور ﷺ کی ذاتی شخصی نہیں تھی بلکہ اطاعت اس نظام کی مقصود تھی جو ساری انسانیت کی پرورش کرنے کا ذمہ دار ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز ان کا یہ نظام اور حضور ﷺ کی قیادت تھی۔ حضور ﷺ کی قیادت سے بہتر قیادت کسی قوم کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ پھر مسلمانوں کی بدقسمتی ان کے آڑے آئی کہ انہوں نے اپنا نظام چھوڑ کر اپنے وضع کردہ نظریات کو اپنا ضابطۂ حیات بنایا وراس طرح دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا اور حضور اکرم ﷺ اور خلافت راشدہ جیسی بے مثال قیادت کی جگہ ملوکیت نے غلبہ حاصل کرلیا۔ جس میں ایک ایک خلیفہ کے حرم میں دو دو ہزار کنیزیں ہوتی تھیں۔ یہ خود بڑی حیرانی کی بات ہے کہ صدر اول کے صرف 30 سال کا یہ اتنا قوی اثر تھا کہ مسلمان کئی صدیوں تک اسی Momentum پر چل کر سپر پاور بنے رہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں روحانیت کا تصور در آیا جس کا خاصّہ دنیا سے نفرت اور آخرت کی تیاری ہوتا ہے۔ دین میں چونکہ اجتماعیت ہوتی ہے اور مذہب میں انفرادی نجات کا تصور ہوتا ہے۔ اس لئے مذہب پرست قوم اس دنیا میں ترقی کر ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم کی وہ آیات جو اس دنیا میں سرفرازی اور قیادت کی داعی تھیں اور اب بھی ہیں۔ مذہب نے ان کو آخرت سے وابستہ کر دیا۔ آپ ان آیات میں سے چند آیات کے دینی اور مذہبی مفاہیم ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو دین کے مذہب میں تبدیل ہونے کے نقصان کا صحیح اندازہ ہو

گا۔

(1) ارشادِ عالی ہے:وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143)-(ترجمہ)اوراسی طرح ہم نے تمہیں ایک عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنواور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے اوراس طرح تم اس دنیامیں ساری انسانیت کی نگرانی کرتے رہو۔

''تدبرقرآن'' میں تحریر ہے:''ہمارے ارباب تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں گواہی دے گی کہ گمراہوں کواللہ کا دین پہنچ چکا تھا۔اس کے باوجود انہوں نے گمراہی کی روش اختیار کی۔'' (جلداول'ص 365)۔

تفسیر کثیر میں اس آیت کی تفسیر میں یہ تحریر ہے کہ:''مُسند احمد میں ہے رسول اللہﷺ فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا اوران سے دریافت کیا جائے گا کہ تم نے میرا پیغام میرے بندوں کو پہنچا دیا تھا وہ کہیں گے کہ ہاں اللہ' پہنچایا تھا۔ان کی امت کو بلایا جائے گا اوران سے پوچھ ہوگی کہ کیانوح علیہ السلام نے میری باتیں تمہیں پہنچائی تھیں!وہ صاف انکار کریں گےاور کہیں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والانہیں آیا۔نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ تمہاری امت انکار کرتی ہےتم گواہ پیش کرو۔وہ کہیں گے کہ ہاں محمدﷺ اور آپ کی امت میری گواہ ہے۔یہی مطلب ہےاس آیت کـذلک جـعـلـنـا کـم کا''۔(تفسیر کثیر'جلداول' ص208)۔

اس آیت کے بارے میں تفسیر مظہری میں ہے:''علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ قیامت کےدن اللہ تعالیٰ اولین وآخرین کوایک جگہ جمع کرے گا۔پھر گذشتہ امتوں کے کفار سے خطاب فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والانہیں پہنچا۔وہ صاف انکار کردیں گے کہ ہمارے

پاس کوئی نہیں آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ انبیاءؑ سے گواہ طلب کرے گا اس وقت امت محمدیہؐ حاضر ہوگی اور گواہی دے گی کہ انبیاءؑ نے سب احکام پہنچا دیئے۔'' (جلد اول' صفحہ 183)۔

اس آیت کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے: ''باشد رسول شما بر شما گواہ۔ زیرا نکہ او مطلع است بنور نبوت رتبۂ ہر متدین بدین خود کہ در کرام درجہ دین من رسیدہ حقیقت ایمان اور چیست وحجابے کہ بداں از ترقی محجوب ماندہ است کدام است۔ (ترجمہ) تمہارا رسول تم پر گواہ رہے گا' کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنی نبوت کے نور سے اپنے دین کے ہر ماننے والے کے رتبہ کو کہ میرے دین میں اس کا کیا درجہ ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس سے اس کی ترقی رکی ہے۔''

ایک دوسری آیت ملاحظہ فرمائیں: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)۔(ترجمہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے وہ سارے ادیان پر غالب کردے خواہ مشرک کیسا ہی ناراض ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بہت روشن خیال اور موجودہ دور کے تقاضوں سے باخبر مفسر شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اس غلبہ کے متعلق لکھا ہے ''بہت مفسرین اس طرف بھی گئے ہیں کہ اسلام کے غلبۂ دین کامل کا ظہور و مشاہدہ قرب قیامت میں ہوگا جبکہ نزول مسیحؑ کے وقت دوسرا دین موجود نہ رہ جائے گا۔

حضرت شیخ الہند کے ترجمہ پر تفسیری نوٹ میں حضرت العلامہ مولانا عثمانی رقم طراز ہیں ''اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کرکے بالکل صفحۂ ہستی سے محو کردے یہ نزول مسیح کے بعد قربِ قیامت کے ہونے پر ہوگا۔''

تفسیر مظہری میں تحریر ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور ضحاک نے کہا یہ بات حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے وقت ہو جائے گی۔ تمام مذاہب والے مسلمان ہو جائیں گے۔

تفسیر نمونہ میں تحریر ہے ''البتہ مختلف روایات جو منابع اسلامی میں وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق اس پروگرام کا تکامل اس وقت ہوگا جب حضرت مہدی علیہ السلام ظہور کریں گے۔اور اسلام کے عالمی پروگرام کو تحقق بخشیں گے اور عالمی طور پر اس کو نافذ کریں گے۔''

مضمون کی طوالت کے خوف سے صرف ان دو آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ اس طرح کی بے شمار آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جن کا اس بات پر شدید اصرار ہے کہ مسلمان غلبہ حاصل کر کے، قرآن کریم کے نظام کو ساری دنیا میں نافذ کریں اور اس نظام کے اجراء و نفوذ سے ساری دنیا کی نگرانی اور انسانیت کی خدمت کریں۔ ان کے مسائل حل کریں اور ان کے تنازعات کا فیصلہ کریں۔لیکن ہمارے سارے مفسرین کرام نے اس دنیا کے حالات سے بالکل صرف نظر کر کے اپنا مطمح اور مقصد صرف آخرت کو بنایا ہوا ہے۔اس دنیا کے افلاس، زبوں حالی، غربت، بدحالی، محکومی کو وہ بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں اور صرف آخرت کی سرخروئی اور کامیابی کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ آیات کریمات مسلمانوں کے لئے اس دنیا کے غلبہ اور اقتدار کے لئے اس قدر واضح ہیں کہ ان آیات کی تفسیر معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ آیت کی تفسیر معلوم کرنے کی ضرورت صرف ان آیات میں ہوتی ہے جن کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی ہو۔اس دنیا میں اسلام کا نظام جاری کرنے کے لئے جو آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان میں سے کسی ایک آیت میں بھی کسی مفسر کی تفسیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔آپ خود اس موضوع سے متعلقہ آیات ملاحظہ فرمالیں اور اگر ترجمہ خود نہ کر سکیں تو البتہ ان کا ترجمہ قرآن کریم کے کسی نسخہ میں ملاحظہ فرمالیں۔ وہ آیات خود اپنے منہ سے بولتی ہیں کہ وہ اس دنیا میں مسلمانوں کی حالت درست کرنے کے لئے ہیں۔آخرت سے ان کا کوئی تعلق نہیں لیکن ایسی بے شمار آیات کو ہمارے مفسرین کرام آخرت سے منسلک کر دیتے ہیں۔

اس دنیا کی تحقیر اور اس سے بے نیازی اور آخرت کی فکر اور ہمہ وقت اس کے لئے

تیاری میں مصروف رہنے کی واحد وجہ روحانیت کا غلط تصور ہے اور جب تک مسلمانوں میں روحانیت اور پرستش کا تصور باقی رہے گا' خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرلیں' اس دنیا میں کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

روح کے غلط تصور کے متعلق اس سے پیشتر اس رسالہ میں متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔اس لئے قارئین کرام کا وقت ضائع نہ کرنے کے خیال سے صرف تجدید یادداشت کے لئے صرف اتنا عرض ہے کہ روح کا یہ تصور مسلمانوں میں روایات کے ذریعے داخل ہوا ہے کہ جب جنین چار ماہ کا ہوتا ہے تو اس میں روح داخل ہوتی ہے۔لیکن واضح رہے کہ قرآن کریم میں روحِ خداوندی کا ذکر تو موجود ہے لیکن روح انسانی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور نہ ہی تزکیۂ روح کا کوئی حوالہ ملتا ہے۔ کیونکہ نطفہ تو خود زندہ ہوتا ہے اس لئے اس میں روح ڈالنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ قرآن کریم نے جنین کی نشوونما کے مراحل سلسلہ وار واضح کر دیئے ہیں۔جنین کی ساری Stages از اول تا آخر قرآن کریم نے ترتیب وار کئی جگہ بیان کر دی ہیں 23:14, 40:67, 22:5 لیکن کسی ایک جگہ بھی ادخالِ روح کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس لئے روح اور روحانیت کا تصور ہی خلافِ قرآن ہے لہٰذا قرآن کریم سے پرستش کرنے کی کوئی اجازت نہیں ملتی۔ پرستش کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہمارے نزدیک تو ہر وہ کام جو اسلامی نظام سے بالا بالا' بغیر اسلامی نظام کو Involve کئے' خوشنودئ خداوندی کی خاطر کیا جائے' وہ پرستش ہے' اس کی جس قدر بھی اقسام ہوں' اس میں نظام اسلامی کو Ignore کرنے کا عنصر ضرور پایا جائے گا۔

ہمارے سامنے مغربی ممالک کی مثال بہت واضح ہے' جب تک مغربی ممالک مذہب کی گرفت میں رہے۔ان کی توجہ آخرت پر تھی' اس دنیا کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی وہ بھی روحانیت کے عقیدے میں پھنسے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے مذہب اور روحانیت کے دائرہ سے قدم باہر

نکالا اور دنیاوی معاشروں کی اصلاح کی طرف توجہ دی' انہوں نے بھی دنیاوی ترقیاں کیں' نہایت عمدہ معاشرے قائم کئے لیکن افسوس کہ ان کے پاس وحی الٰہی کی روشنی نہیں تھی اس لئے انہوں نے وہ معاشرے صرف اپنی عقل کے زور پر قائم کئے ۔ان معاشروں کی بنیاد باطل پر تھی ۔ان کے ہاں مستقل اقدار اور مکافاتِ عمل کا تصور ہی نہیں ہے۔اس لئے ان تمام معاشروں میں صرف اپنے مفادات پیش نظر رہے اور دوسری اقوام کی لوٹ کھسوٹ ان کا مطمح نگاہ رہا۔ چونکہ ان کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم تھے' اس لئے یورپ میں جو عظیم جنگیں برپا ہوئیں ۔وحی الٰہی کی محرومی کی وجہ سے ان کے پاس کوئی ایسی اساس محکم نہیں تھی جس پر وہ نظام عالم کو تعمیر کرسکیں۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے اس سقم اور ان کی اس کمزوری کے متعلق فرمایا تھا۔

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے

جُستہٖ اورا اساس محکمے

روح کے تصور کے برخلاف قرآن کریم نفس انسانی یا ذاتِ انسانی کا تصور دیتا ہے اور یہ وہ اساس محکم اور عروۃ الوثقیٰ ہے جس پر وہ اپنا نظام تعمیر کرتا ہے' ہر بچہ کو قدرت کی طرف سے ایک ذات عنایت ہوتی ہے' اس ذات کی نشو ونما انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ بچہ بھی بہت چھوٹا پیدا ہوتا ہے' فطرت کے قوانین کے مطابق اس کا جسم ترقی کرتا ہوا' پانچ یا چھ فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ بیج بہت چھوٹا سا ہوتا ہے۔ فطرت کے قوانین کے مطابق یہ ایک بہت بڑا درخت بن جاتا ہے' اسی طرح ذات انسانی کی نشو ونما ہوتی ہے' اس ذات کی نشو ونما میں فطرت کے قوانین کا کوئی دخل نہیں ہوتا' اس ذات کی نشو ونما وحی الٰہی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے ذریعہ ہوتی ہے' اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کو وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی ذات کی نشو ونما معاشرے کے اندر رہتے ہوئے باہمی تعاون اور ایثار کے ذریعے ہوتی ہے ۔انسانی ذات میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مضمر ہوتی ہیں' ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان صفاتِ الٰہیہ کو علی حدِ بشریت اپنے

اندر Develop کرے۔ انسان میں جس قدر یہ صفات نمود حاصل کریں گی۔ اسی قدر اس کو قربِ الٰہی حاصل ہوتا چلتا ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جو محسوس نہ ہو سکے۔ جس فرد میں جس قدر زیادہ صفات منعکس ہوں گی ہر دنیاوی معاملہ میں اس کا ردعمل اس صفت کے مطابق ہوگا۔ اگر کسی شخص میں اللہ تعالیٰ کی صفت عفو کا ظہور ہو گیا تو وہ انتہائی سخت معاملات میں بھی عفو و درگذر سے کام لے گا۔ اگر کسی شخص میں صفت عدل منعکس ہوگئی تو وہ ہر جگہ عدل سے کام لے گا' قرآن کریم پر غور وفکر سے خود انسان کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی کس صفت کا ردعمل کرنا برمحل ہوگا۔ ہر فرد میں صفات خداوندی کے انعکاس سے معاشرہ میں سکون واطمینان' دیانتداری' صبر' ایثار' تعاون' ہمدردی جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کا نفس انسانی یا ذات انسانی کا عطا کردہ تصور اسلامی نظام کی اساس اس طرح بھی بنتا ہے کہ قرآن کی رو سے اپنی کمائی ہوئی دولت کو دوسروں پر صرف کرنے سے انسانی نفس کی پرورش ہوتی ہے (92:18)-اس طرح دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔ جس معاشرہ کے ہر فرد کو اس بات کا علیٰ وجہ البصیرت یقین ہوگا کہ دوسروں کی پرورش سے اس کی اپنی ذات کی پرورش ہوتی ہے وہ جنتی معاشرہ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم جسم انسانی کی پرورش کو بھی Ignore نہیں کرتا۔ یہی وہ Vehicle ہے جس کے ذریعہ نفس کی پرورش ہوتی ہے۔ البتہ نفس اور جسم کی پرورش کے ذرائع بالکل مختلف اور ایک دوسرے کے متضاد ہیں کہ ان میں ہر ہر مقام پر آپس میں Tie آ کر پڑتی رہتی ہے۔ جسم کی پرورش اپنے مال کو اپنے اوپر خرچ کرنے سے ہوتی ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ عمدہ سے عمدہ غذا کھائے۔ خوبصورت لباس استعمال کرے۔ گرمی میں .A.C اور سردی میں Heater استعمال کرے۔ ٹرین کی بجائے جہاز میں سفر کرے' غرض جسم کو جس قدر سہولتیں مہیا کر سکے وہ مہیا کرے اور اپنی ساری کمائی اپنے پر صرف کر دے' اس کے برخلاف نفس کے ارتقاء کا یہ تقاضہ ہے کہ اپنے لئے کم سے کم سہولتیں مہیا کر کے' زیادہ

سے زیادہ کمائی کو دوسروں پر صرف کرے اس سے نفس انسانی ترقی کرتا ہے۔ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں دونوں چیزوں یعنی جسم اور نفس کی پرورش ساتھ ساتھ ہوتی چلتی ہے۔ عقل انسانی ایسا نظام وضع کرنے سے قاصر ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ نظام میں یا جسم کی پرورش ہوسکتی ہے یا ذات کی۔ یورپ کے سیکولر نظام میں صرف جسم کی پرورش ہوتی ہے' اور خانقاہی نظام میں ان کے دعویٰ کے مطابق صرف روح کی۔ دونوں کی پرورش غیر اسلامی نظام میں کبھی نہیں ہوسکتی۔ مستقل اقدار پر مبنی ہر عمل فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے خوشگوار نتائج پیدا کرتا ہے۔

انسانی ذات کا تصور اسلامی نظام کی اساس محکم اس طرح بنتا ہے کہ ذات کی نشوونما کے لئے جو احکامات دیئے گئے ہیں' ان پر عمل کرنے سے معاشرہ میں ازخود ان کے اثرات پڑتے ہیں۔ قرآن نے حکم دیا چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' مال پورا تول کر دو' دھوکا نہ دو' ہمیشہ عدل و انصاف کی بات کرو (6:153)- دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہو۔ اپنے گھر میں جاؤ یا دوسروں کے گھروں میں جاؤ اہل خانہ کو سلام کرو (24:6)- حسد نہ کرو' دوسروں کو معاف کرو' کسی کو قتل نہ کرو' یہ تمام احکامات نفس انسانی کی نشوونما کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ جس معاشرہ کے افراد ان تمام احکامات پر عمل کریں گے ان کا اثر معاشرہ پر ازخود ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے برخلاف جس معاشرہ میں ذات کے خلاف جرائم کا انسداد نہیں ہوگا وہ معاشرہ حسن تدبر سے معاشرہ کے زوال کو نہیں روک سکتا۔ جو معاشرہ بدسیرت لوگوں پر مشتمل ہوگا' جیسا کہ آج کل ہمارا پاکستانی معاشرہ بن گیا ہے' وہ معاشرہ پختہ سیرت لوگوں کے تعمیری کاموں سے محروم رہتا ہے۔ اس کی وضاحت کسی مغربی ملک اور ہمارے پاکستانی معاشرہ کے تقابل سے سامنے آسکتی ہے اور اسی کو قرآن نے لوگوں پر لوگوں کی لعنت فرمایا ہے۔

نفس انسانی وہ محکم اساس ہے جس پر قرآنی نظام قائم ہوتا ہے' اس نفس کی پرورش جو

انسان کا مقصد حیات ہے۔صرف مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے جن کا اجراء اور نفاذ اسلامی نظام میں ہی ہوسکتا ہے۔قرآن کی رو سے خدا پرستی' پرستش یا گوشوں زاویوں میں بیٹھ کر اور وظائف کے ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ اسلامی نظام قائم کر کے خدا کے قوانین کو عملاً اس دنیا میں جاری کر کے' اس کی اطاعت کرنے سے خدا پرستی ہوتی ہے اور ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا نیک عملی ہے' خدا پرستی کے علاوہ بھی قبولیت دعا' حصول ثواب' مغفرۃ' رزق حلال' شفاعت سب اسلامی نظام کے ذریعے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں آج کل جو بیداری کی لہر بلند ہو رہی ہے اور نوجوان طبقہ اپنے حکمرانوں سے بغاوت کر کے نئے معاشرے تشکیل دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔کسی ملک میں بھی دین کا تصور سامنے نہیں ہے صرف پرستش کا ہی غلبہ ہے۔بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ افراد بدل جائیں گے نظام نہیں بدلے گا' ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے' اس بات پر سخت افسوس ہوتا ہے کہ تحریک طلوع اسلام کے وسائل اس درجہ محدود ہیں کہ اس تحریک کی آواز ان تک نہیں پہنچ سکی۔ ورنہ یہ بڑا Crucial موقع تھا' جس کو Mis کرنے کا بہت افسوس رہے گا۔ورنہ موجودہ دور کے تقاضے پکار پکار اقامتِ دین کا مطالبہ کر رہے ہیں' لیکن یہ کمزوری ہماری ہے کہ ہم انہیں قرآن کی روشنی نہ پہنچا سکے اور ہم نے انہیں اس روشنی سے محروم رکھا۔یاد رکھیں جب بھی کسی اسلامی ملک میں الیکشن کے ذریعے حکومت قائم ہوگی وہ یا تو سیکولر ہوگی اور یا تھیوکریسی ہوگی۔اقامتِ دین کی امید بہت ہی کم ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اتباع رسول کے خوشگوار ثمرات ونتائج

مذہب کی تو اساس ہی پرستش کی چند رسوم پر ہوتی ہے اور یہ خصوصیت سارے مذاہب عالم میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور یہ بات بھی تمام مذاہب میں مشترک ہے کہ پرستش کے نتائج اُخروی زندگی میں حاصل ہوں گے' ان نتائج کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن دین کی یہ صورت نہیں ہے۔ دین پر عمل کرنے کے نتائج اس محسوس دنیا میں ہی برآمد ہو جاتے ہیں اور ان نتائج سے ہی اس دین کی صداقت وحقانیت ثابت ہوتی ہے۔ دین جن نتائج کا وعدہ کرتا ہے اور دین پر عمل کرنے سے وہ نتائج برآمد نہ ہوں تو وہ دین باطل ہے یعنی برحق نہیں ہے۔ قرآن کریم نے دین پر عمل کرنے کے نتائج میں مسلمانوں کے لئے غلبہ حاصل ہونا لازمی ٹھہرایا ہے (9:33, 61:9, 4:141' نیز مزید دیگر آیات) دینی نظام ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتا ہے 11:6, 6:151, 17:31' دعائیں بھی اسلامی نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہیں 40:60, 4:75' اقامتِ دین سے امن وامان قائم ہوتا ہے 3:97' اس میں ہی ارکانِ دین کے نتائج برآمد ہوتے ہیں 29:45, 2:185, 22:37' نیک اعمال کے ثواب بھی صرف دین میں حاصل ہوتے ہیں 28:80' طاغوتی نظام میں اعمال کے ثواب حاصل نہیں ہو سکتے۔ دین پر عمل کرنے کے یہ ثمرات اتباع واطاعت رسول کی وجہ سے ہی حاصل ہوتے ہیں' قرآن کریم نے اس کے علاوہ بھی اتباعِ رسول کے ثمرات کی نشاندہی کی ہے اور یہی اس مضمون کا

موضوع ہے۔

ارشاد حضرت باری عزّ اسمہٗ ہوتا ہے: اِنۡ كُنتُمۡ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ (3:31)-اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں اس آیہ کریمہ سے اللہ کی محبت کا جواز فراہم کیا جاتا ہے اور پھر سارے تصوف اور پرستش کی عمارت اس محبتِ خداوندی کے تصور پر قائم کر دی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کا یہ تصور خلافِ قرآن ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہہ و ماہیت انسانی ادراک سے ماوراء ہے۔ اس لئے اس قسم کی محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے۔ کوئی آدمی اَن دیکھی چیز سے محبت کر ہی نہیں سکتا اور یہی وجہ تھی جس کی بناء پر خدا کو انسانوں (اوتاروں) کی صورت میں متشکل کیا اور اس کی مورتیاں بنائی گئیں۔

امام راغب اصفہانی نے محبت کے معنے کسی چیز کو عزیز ترین سمجھنا کئے ہیں۔ انہوں نے عربی محاورہ نقل کیا ہے کہ: حبب اللہ الی 'کذا' فلاں چیز خدا نے مجھے عزیز کر دی، قرآن کریم میں ہے: وَلَكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ (49:7)- لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔ دوسری جگہ ارشاد عالی ہے: اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَن يَشَاء (28:56)- جسے تو عزیز جانتا ہے تو اسے راہ پر نہیں لا سکتا مگر ہاں خدا جسے چاہے اس کو راہ پر لا سکتا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں بھی محبت کے معنے کسی کو عزیز سمجھنا ہے۔ تصوف کا وضع کردہ محبوب بنانا نہیں ہے۔ آیت کا مفاد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کی ذات اور عملی شکل میں اس کا نظام دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو جائے اور وہ ہر چیز اس نظام پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ وَآتَى الۡمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِىۡ الۡقُرۡبَى وَالۡيَتَامَى وَالۡمَسَاكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِىۡ الرِّقَابِ (2:177)- اور اس کی الفت میں اپنا مال قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسیوں اور مانگنے والوں اور لونڈی غلام کو آزاد کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَیُطْعِمُو نَ الطَّعَامَ عَلَی حُبِّهٖ مِسْکِیْناً (76:8)-اللہ کو عزیز ترین سمجھنے کی وجہ سے محتاج، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ان آیات میں عَلٰی (صلہ) کی وجہ سے ایثار اور ترجیح کے معانی پیدا ہو گئے ہیں۔یعنی اللہ کو عزیز ترین جانتے ہوئے، اس کی خاطر، اس پر ایثار کرنے کی وجہ سے وہ کھانا کھلاتے ہیں۔سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِن کَانَ آبَاؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسَاکِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَیْکُم مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُواْ حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لاَ یَهْدِیْ الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ (9:24)-

اے رسول تم کہہ دو کہ تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبہ والے اور وہ مال جو تم نے کما کے رکھ چھوڑے ہیں اور وہ تجارت جس کا مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں خدا سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں، تو تم ذرا ٹھہرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم (عذاب) موجود کرے، اور خدا نافرمان لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

اس طویل آیت میں یہی حکم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور عملاً اس کے نظام سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہونی چاہئے اور اگر مسلمانوں کے کسی دور میں بھی اسلامی نظام سے یہ دنیاوی چیزیں زیادہ عزیز ہو گئیں تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان پر خدا کا عذاب بھی آئے گا اور وہ اللہ کے نافرمان بھی رہیں گے۔

ان تمام آیات کریمات کا ملخص اور مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا کوئی غیر محسوس اور مجرد شے نہیں ہے بلکہ اس سے محبت کرنے کی یہ عملی صورتیں ہیں۔ ان کو پورا کرنے سے اس کی محبت ثابت ہوتی ہے اور ان کو عملاً سرانجام نہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت خداوندی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ البتہ اس محبت کے ثبوت میں پرستش کا کوئی کردار نہیں ہے۔ پرستش خواہ کتنی ہی کرلی جائے' اس سے محبت خداوندی ثابت نہیں ہوتی۔

آیۂ کریمہ کا دوسرا جزو اتباع رسول ہے۔ مذہب میں اتباع رسول روایات کے ذریعے کرایا جاتا ہے اور عملاً اس کا طریقہ بھی پرستش پر ہی جا کر ختم ہوتا ہے اور اتباع رسول میں خالص پرستش پر ہی زور دیا جاتا ہے' جس کی آخری شکل تصوف اور رہبانیت ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اتباع رسول کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم بھی اتباع رسول کرے گی' تو اللہ اس سے محبت کرنے لگے گا (یحبکم الله)۔ اب آپ کے سامنے وہ آیاتِ کریمات پیش کی جاتی ہیں' جن میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کن قوموں سے محبت کرتا ہے۔

1- اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (2:195, 2:134, 3:148)-
بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

2- اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ (2:222)-
بے شک خدا توبہ کرنے والوں اور ستھرے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

3- فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (3:76, 9:4)-
بے شک خدا پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

4- وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ (3:146)-
بے شک خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

5- اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ (3:159)-

بے شک خدا بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

6- اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ(5:42 ,49:9 ,60:8)-

خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

7- اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُونَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُم بُنیَانٌ مَّرْصُوصٌ (61:4)-

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں۔

8- فَسَوْفَ یَاْتِیْ اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّونَہٗ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (5:54)-

عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو ظاہر کر دے گا جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے، ایمانداروں کے ساتھ منکسر اور کافروں کے ساتھ سخت۔

آپ ان آیات کو ملاحظہ فرمائیں، اگرچہ ان سب کا روایاتی ترجمہ درج کیا گیا ہے، تاہم اس کے باوجود یہ بات ظاہر ہے کہ ان تمام آیات کا تعلق اس محسوس دنیا سے ہے، کسی کا تعلق صرف اُخروی دنیا سے نہیں ہے۔ اتباع رسول کرنے والی قوم میں یہ تمام صفات وخصوصیات موجود ہونی لازمی ہیں جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ ان تمام آیات میں سے کسی ایک آیت میں بھی پرستش کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔

جو قوم اتباع رسول نہیں کرتی اور اللہ تعالیٰ جن کو عزیز نہیں سمجھتا، قرآن کریم نے ان کی بھی نشاندہی کر دی ہے، ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

(1) اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبِّ الْمُعْتَدِیْنَ (2:190)-

خدا زیادتی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

(2) وَاللّٰهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيمٍ (2:276)-

جتنے ناشکرے اور گناہ گار ہیں خدا ان کو دوست نہیں رکھتا۔

(3) فَاِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْكَافِرِيْن (3:32)-

اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

(4) وَاللّٰهُ لاَ يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ (3:57, 3:140)-

اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

(5) اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّاناً اَثِيماً (4:107)-

بے شک خدا ایسے شخص کو دوست نہیں رکھتا جو دغا باز' گناہ گار ہو۔

اللہ تعالیٰ اس قوم کو عزیز نہیں سمجھتا جس میں یہ نقائص وعیوب ہوں۔ان نقائص میں بھی پرستش کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ جو قوم پرستش نہیں کرتی وہ اللہ کو عزیز نہیں ہوتی۔

ان چند سطور میں یہی عرض کرنا تھا کہ اتباع رسول روایات کے ذریعے نہیں ہوسکتا' اتباع رسول اسلامی نظام کی اطاعت کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے اور اس اتباع کے ثمرات ونتائج اس دنیا میں سامنے آتے ہیں کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جس میں یہ متذکرہ بالا تمام صفات وخصائص موجود ہوتے ہیں اور ان خالص قرآنی نصائص میں پرستش کا کہیں دور دور بھی تذکرہ نہیں ہے۔

جس طرح حضورﷺ نے اس قرآن کو پہنچانے اور اسلامی نظام قائم کرنے میں دن رات کوشش کی' اسی طرح اس موجودہ دور میں ہر مسلمان کے لئے یہ حکم ہے کہ رسول اللہﷺ کی طرح رات دن قرآن مجید پہنچانے اور اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کرتا رہے۔یہی اتباع رسول ہے۔اسی لئے حضورﷺ نے بحکم الٰہی فرمایا: قُلْ اِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (3:31)-اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو' تو میری پیروی کرو (اور رات دن کوشش

میں گذار دو) پھر اللہ تم سے محبت کرے گا۔یعنی جس طرح میں اس قرآن کو پڑھنے پڑھانے‘اس کو پہنچانے اوراس کے مطابق معاشرہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوں‘ اسی طرح تم بھی کرو کہ یہی میرا اتباع رسول ہے۔

کرد ایزد مر ترا از نیست ہست
از برائے آنکہ باشی حق پرست

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اطاعتِ رسول کے بارے میں دو متضاد زاویۂ فکر

انبیائے کرامؑ پر فرض ہوتا تھا کہ جب بھی وحی کا نزول ہو وہ فوراً اس کو انسانیت تک پہنچا دیں' خواہ وہ نزول چلتی تلواروں کے دوران ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ **بلغ ما انزل الیک من ربک.** نیز یہ بھی فرض ہوتا تھا کہ وحی کے مطابق معاشرہ کی تعمیر کریں۔ اس دین کو متمکن کریں اور اس کو غالب کرنے کی کوشش کریں **لیظھرہ علی دین کلہ.** حضورﷺ نے ان ہدایات کے مطابق وحی کی تبلیغ فرمائی اور اس کے مطابق قرآنی حکومت قائم فرمائی' جو انسانیت کا بہترین دور تھا اور جسے چشم فلک دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام' جسے حضورﷺ نے عملاً اس روئے زمین پر قائم فرمایا۔ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضورﷺ چونکہ اپنے دور میں اس نظام کے سربراہ تھے' اس لئے عملاً اس نظام کی اطاعت کے لئے حضورﷺ کی اطاعت لازمی قرار پائی۔ کیونکہ اس نظام کی اطاعت حضورﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ حضورﷺ کے بعد' حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور جب تک بھی وہ دور ممتد رہا' اس نظام کے سربراہ کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ جب ہم مسلمانوں میں ملوکیت در آئی' تو وہ نظام درہم برہم ہو گیا لیکن اللہ و رسول کی اطاعت تو ہر حال میں فرض تھی اس لئے یہ نظریہ رواج دیا گیا کہ قرآن کریم سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث شریف پر عمل کرنے سے حضورﷺ کی اطاعت ہو جائے گی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے

لئے احادیث کے ذخیرے جمع کئے گئے تاکہ حضورﷺ کی اطاعت کا فرض ان پر عمل کر کے، پورا کر دیا جائے۔ اس مشکل کو حل کر دینے کے بعد اسلامی حکومت یا دین خداوندی کے قیام کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن و حدیث پر الگ الگ عمل کرنے سے اللہ و رسول کی اطاعت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت حال ہم مسلمانوں میں تقریباً ایک ہزار سال سے چلی آرہی تھی۔ ملوکیت کے طویل دور، اور اس کے بعد یورپ کے سامراجی غلبہ کی لمبی مدت کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلامی نظام کا تصور بالکل محو ہو گیا تھا۔ اور اس طویل عرصہ میں اطاعت رسول کے بارے میں بھی کبھی دو آراء پیدا نہیں ہوئیں۔ صرف ایک ہی طریقہ، یعنی احادیث پر عمل کرنا، اطاعت رسول کا مستند ذریعہ گردانا گیا۔ لیکن زمانے کے تقاضے اور فطرت کے اشارے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ عقل انسانی کے خودساختہ نظام ہائے زندگی نے انسانیت کو فوز و فلاح کی راہ نہیں دکھلائی۔ دکھ اور درد کا مارا ہوا مسلمان پھر اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ قرآن کریم کے دامن میں اور اس کے نظام میں پناہ لے۔ گزشتہ تقریباً ایک سو سال سے رجعت الی القرآن کی آواز، مختلف گوشوں سے بلند ہونی شروع ہوئی۔ پہلے یہ آواز کمزور اور ضعیف بھی تھی اور قدرے غیر واضح بھی۔ لیکن مسلمانوں کے حالات اس درجہ نا مساعد اور تباہ کن تھے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ قرآن کریم کا نظام قائم کیا جائے اور اسی کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔ اس میں اولیت کا شرف پاکستان کے مفکرین کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد ایران، الجیریا، مصر، سیریا، سوڈان اور دیگر مسلمان ممالک میں یہ فکر عام ہوا۔

لیکن اس سارے فکر و عمل میں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ روایتی اور ملوکیت کے تراشیدہ اسلام (جو ہمارے ہاں مروج ہے اور جو ہمارے دینی مدارس میں تعلیم دیا جاتا ہے) میں نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس میں اللہ و رسول کی اطاعت بھی قرآن و حدیث کے اتباع سے بخوبی ہو رہی ہے۔ پھر کونسی مشکل ہے جس کے باعث نظام قائم کیا جائے۔ اسلامی نظام کی

ضرورت تو صرف اس صورت میں پیش آتی ہے کہ جب آپ اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیں اور اس سے مقصود اسلامی حکومت کے سربراہ کو قرار دیں۔

اطاعت رسول کے دو الگ الگ اور واضح طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے' یعنی قرآن وحدیث کا اتباع کریں اور ''اللہ ورسول'' کی اطاعت سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس میں کسی قسم کے تردد کی ضرورت ہے نہ اسلامی نظام کی ضرورت۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کی جا سکتی ہے اور اسی طرح اللہ ورسول کی اطاعت ہم کرتے ہیں آ رہے ہیں۔ لیکن دوسرا طریقہ اللہ و رسول کی اطاعت کا اسلامی نظام کے ذریعے ہے۔ آپ نظام قائم کریں۔ اس نظام کی اطاعت کریں اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس میں عملاً اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس صورت میں وہ نظام قرآن کریم کے اصول واقدار کی روشنی میں' اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق' احکامات جاری کرے گا اور ان احکامات کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ یہ اطاعت رسول کا دوسرا طریقہ ہے۔ جو اول الذکر طریقہ سے بالکل منفرد ہے۔ چونکہ یہ طریقہ' مروجہ طریقہ سے مختلف ہے۔ اس لئے اس طریقے کے داعین' خصوصاً ادارہ طلوع اسلام نے' اس طریقہ کے جواز میں واضح دلائل بھی پیش کئے اور تقریباً 50 سال میں کثیر تعداد میں مبسوط مضامین شائع کئے۔ جن کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ موضوع اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتا۔ فی الوقت گفتگو کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اطاعت رسول کے دو جدا جدا طریقے پیش کئے جا رہے ہیں جن پر بالکل مختلف طور پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ حدیث کے اتباع کے ذریعے اطاعت رسول ہر معاشرہ میں (حتیٰ کہ سیکولر معاشرہ میں بھی) ممکن ہے' لیکن اسلامی نظام کے ذریعے اطاعت رسول صرف اس نظام میں ہی ممکن ہے جس نظام کے قیام کی اس دور میں دعوت دی جا رہی ہے۔ جو بات گہرے غور کی متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ جو حضرات اسلامی نظام کے داعی ہیں انہیں تو ہر حال میں نظام کی اطاعت

ہی اللہ و رسول کی اطاعت کا ذریعہ قرار دینا پڑے گی۔ ورنہ ان کے پاس نظام کے قیام کا کوئی محرک Incentive نہیں رہتا۔ نیز یہ کہ حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لینا' اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے اور اس کے قیام کا جواز اور ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ہے۔ جو حضرات حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں انہیں یہ بھی غور فرمانا چاہئے کہ وہ حضرات قرآن کریم کو وحی جلی اور حدیث شریف کو وحی خفی گردانتے ہیں۔ جب وحی جلی یعنی قرآن کریم سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' تو حدیث شریف' جو کہ وحی خفی ہے' اس سے حضور ﷺ کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے' ایک وحی سے اللہ کی اطاعت اور دوسری وحی سے رسول کی اطاعت' چہ معنی دارد۔

آج سارا عالم اسلام مصائب سے دوچار ہے اور ہم مسلمان انسانیت کا آخری سہارا قرآن کریم کے نظام کو سمجھتے ہیں۔ خود قرآن کریم کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ **ولن تجد من دونہ ملتحدا** (۲۷/ ۱۸) تم اس کے سوا کہیں بھی ہرگز پناہ کی جگہ نہ پاؤ گے۔ یہ مقام شکر ہے کہ اس دور میں تقریباً ہر مسلمان ملک میں اسلامی نظام کے دعاۃ موجود ہیں۔ آج سے پیشتر کبھی بھی اسلامی نظام کے قیام پر اس قدر اصرار نہیں ہوا۔ اب کرنے کا ضروری کام یہ ہے کہ اطاعت رسول کا مسئلہ علمی انداز سے طے کر لیا جائے کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظام کے قیام میں اساسی حیثیت کا حامل ہے۔ جب تک اطاعت رسول کا مسئلہ طے نہیں ہوگا' مختلف دعاۃ و تحاریک میں آپس میں تعاون و اشتراک عمل بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کے دعاۃ کو سب سے پہلے اس مسئلہ کو ضرور طے کر لینا چاہئے۔

وھــــنا مــــا ثــم الــکــلام

عــلــی مــصــطــفٰــنــا الــوف ســلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمِ غیب اور استخارہ

قرآن کریم کی رو سے علمِ غیب کی وضاحت

قرآنِ کریم کے مطابق مومن وہ ہے جسے خدا تعالیٰ کے اس قانون کی محکمیت پر بھی پورا پورا بھروسہ ہو جو کائنات میں کارفرما ہے اور اس قانون پر بھی جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے وحی کے ذریعے انسانی راہنمائی کے لئے ملا اور جو اب صرف قرآن کریم کے اندر ہے۔ ایمان قرآن کے بیان کردہ حقائق کو صرف مان لینے کا نام نہیں ہے' ان کے سامنے عملاً سرِ تسلیم خم کر دینا بھی ضروری ہے۔ سورہ روم میں ارشاد ہوتا ہے۔ **ان تسمع الا من یومن بآیتنا فھم مسلمون** (۳۰/۵۱)۔ تو صرف انہی کو سنا سکتا ہے جو ہمارے احکام پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ان کے سامنے جھکنے والے ہیں۔ مومن کا ایمان تو اتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ جان کی بازی تک لگانے کو تیار رہتا ہے۔ وہ علمی دنیا میں بھی یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں متعدد مفکرین کی سوچ کا نتیجہ قرآن کریم کے خلاف برآمد ہوتا ہے تو وہ اس کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتا ہے کہ چونکہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے' اس لئے یہ درست نہیں ہے اور مزید غور و فکر کا متقاضی ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وحی الٰہی کی تعلیم میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مومن کا فریضہ ہے کہ عملی زندگی میں بھی بعض مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ جو بظاہر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوتے ہیں' تو وہ ان معاملات میں قرآن کریم کی تعلیم پر جم کر کھڑا رہے اور کبھی اپنے ایمان کو متزلزل نہ

ہونے دے اور اس بات پر یقین رکھے کہ مزید تحقیق و تفتیش کے بعد تمام مسائل میں درست بات صرف قرآن کریم کی ہوگی۔ البتہ مزید تحقیق اور سائنسی توجیہات میں کچھ وقت اور لگ سکتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے غیب کا علم صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔ **انما الغیب للہ** (۱۰/۲۰)۔ بجز این نیست کہ غیب کا علم صرف اللہ کے لئے ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **قل لا یعلم من فی السمٰوٰت و الارض الغیب الا اللہ** (۲۷/ ۶۷)۔ اے رسول کہہ دو کہ کائنات میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس سلسلہ میں یوں تو متعدد آیات ہیں ان میں سے صرف چند آیات پیش خدمت کی جاتی ہیں۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔ **وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب و لکن اللہ یجتبی من رسلہٖ من یشاء** (۱۳/۱۷۸)۔ خدا تمہیں غیب کی باتیں نہیں بتاتا' بے شک وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے۔ نیز ارشاد ہوتا ہے۔ **عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہٖ احداء الا من ارتضیٰ من رسول** (۷۲/۲۶)۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ اپنے علم کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اس کے کہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چن لیتا ہے۔ رسولوں کو بھی غیب کا علم وحی کے ذریعے دیا جاتا تھا۔ کیونکہ خدا سے علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وحی تھا۔ چنانچہ حضورﷺ کو بھی جب گذشتہ یا آئندہ کے امور کی اطلاع دی گئی تو واضح کر دیا گیا کہ **ذلک من انباء الغیب نوحیہٖ الیک** (۳/۴۵)۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں تیری طرف وحی کیا گیا ہے۔ کیونکہ وحی کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے اس لئے اب غیب کا علم کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے قطعی طور پر ارشاد فرما دیا کہ **وما تدری نفس ماذا تکسب غداً** (۳۱/۳۴)۔ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔

اس سلسلہ میں جو تمہید پیش خدمت کی گئی ہے' اور اس کے بعد جو آیات کریمات تحریر کی گئی ہیں ان کے بعد آپ خود غور فرمالیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان توضیحات و تشریحات کے

باوجود اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مستقبل کے حالات و واقعات بتا سکتا ہے، تو اس کا قرآن کریم پر کس درجہ ایمان ہے؟ اور اس کی عملاً یہ صورت ہو سکتی ہے کہ:

(۱) یا تو وہ خدا کا رسول ہونے کا مدعی ہے کہ اسے یہ علم وحی کے ذریعے ملا ہے۔ یا

(۲) اگر وہ رسول ہونے کا مدعی نہیں ہے تو پھر وہ یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ غیب کا علم خدا اور اس کے رسولوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ رسول نہ ہونے کے باوجود غیب کی باتیں بتا سکتا ہے۔ ان سطور کے مطالعہ کے بعد آپ خود غور فرما لیں کہ ختم نبوت کے بعد پیشگوئیاں کرنے والوں اور ان پر یقین کرنے والوں کا قرآن کریم کی رو سے کیا مقام ہے۔ ظاہر بظاہر تو یہ دعوے ءرسالت ہے اور بس۔

اصل یہ ہے کہ پیشگوئیوں کو درست تسلیم کرنے کے سلسلہ میں گمراہی کا بیشتر سبب Chance ہوتا ہے اور پیشگوئی کرنے والے صاحبان اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ کائنات میں کوئی واقعہ بھی By Chance واقع نہیں ہوتا، ہر واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب (Cause) ہوتا ہے۔ علمی تحقیقات کے بعد جن واقعات کے Cause کا ہمیں علم ہو جاتا ہے وہ معمول کے مطابق شمار ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن اسباب کا اب تک ہمیں علم نہیں ہوتا، انہیں By Chance کہہ دیا جاتا ہے۔ انسان کی ابتدائی زندگی میں زیادہ تر واقعات By Chance کے زمرے میں آ جاتے تھے لیکن جس درجہ اسباب معلوم ہوتے چلے گئے وہ معمولات کے زمرے میں آتے چلے گئے۔ جن واقعات کو ہم ابھی تک By Chance شمار کرتے ہیں جب ان کے اسباب معلوم ہو جائیں گے تو وہ بھی معمولات میں شامل ہو جائیں گے۔ جس درجہ ایسے واقعات معمولات کے زمرے میں آتے جائیں گے، پیشگوئی کرنے والوں کا اثر اسی نسبت کم ہوتا جائے گا، اور ان کا Domain اسی درجہ محدود ہوتا چلا جائے گا۔

باندازِ دیگر پیش خدمت ہے کہ غیب و شہادت کی ایک اور بھی صورت ہے، کہ محکمہ

موسمیات کے ماہرین کافی عرصہ پیشتر ''پیشگوئی'' کردیں گے کہ فلاں مقام پر فلاں دن بارش ہو گی' اسی طرح علم الافلاک کے ماہرین حساب لگا کر پیشتر سے ''پیشگوئی'' کردیں گے کہ فلاں تاریخ کو سورج گرہن ہوگا۔ دور جہالت اور ازمنۂ توہم پرستی میں اس طرح کی ''پیش گوئی'' کرنے والوں کو مافوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا' اور لوگ ان کی پرستش کرنے لگتے تھے' لیکن اب جبکہ علوم کی ترقی ہوگئی ہے۔ حقیقت سامنے آ گئی ہے کہ اس میں مافوق الفطرت کوئی عنصر نہیں ہے' یہ صرف علم کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین غیر متبدل ہیں جو شخص بھی اس قانون کا علم حاصل کرے گا وہ اس قسم کی ''پیشگوئیاں'' بآسانی کرسکتا ہے۔

لیکن یہ پیشگوئیاں ان ہی امور کے متعلق کی جاسکتی ہیں جن کا تعلق قوانین فطرت سے ہے اور جنہیں اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ جو مخلوق صاحب اختیار ہوگی' اس کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی۔ انسان تو ایک طرف اگر کوئی گائے کسی جگہ بندھی ہوتی ہے' تو کوئی سائنسدان یا عالم' یا پیشگوئی کرنے والا یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ گائے رسہ کھل جانے کے بعد کس سمت کا رخ کرے گی۔ کیونکہ اس کے ارادہ کا کسی پیشگوئی کرنے والے' یا کسی بڑے سے بڑے عالم کو علم نہیں ہوسکتا۔ کسی بھی جاندار کے متعلق جب اتنا بھی نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ آئندہ کیا کرے گا' تو انسان جیسے صاحب اختیار وارادہ کے متعلق کوئی کیسے پیشگوئی کرسکتا ہے۔ کوئی دوسرا تو ایک طرف' قرآن کریم تو یہاں تک کہتا ہے کہ کوئی شخص خود اپنے متعلق بھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور اس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ **وما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفس بای ارض فوت** (۳۱/۳۴)۔ کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کل کیا کرے گا اور نہ ہی یہ معلوم کہ وہ کس جگہ مرے گا۔

ایک دیوان حضرت علی المرتضیٰؓ کے نام سے منسوب دیوان علی کے نام سے موجود ہے۔ وہ دیوان اس وقت راقم سطور کمترین کے پیش نظر نہیں ہے۔ لیکن کمترین کو یاد ہے کہ مدرسہ کی بالکل

ابتدائی زندگی میں وہ دیوان فارسی شرح کے ساتھ پڑھا تھا۔اس کے بالکل ابتدائی اشعار دنوں (ایام) کے خواص سے متعلق ہیں کہ مختلف دنوں کے کیا کیا خواص و اثرات ہوتے ہیں' اور اس سلسلہ کا آخری شعر یہ ہے جو کمترین کو اب تک یاد ہے۔

وھذا العلم لم یعلمہ الا
نبی او وصی الانبیاء

یہ وہ علم ہے کہ جس کو صرف نبی یا ان کا وصی جان سکتا ہے۔

یہ اشعار قرآن کریم کے خلاف ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ یہ حضرت علی المرتضٰی کے نہیں ہو سکتے۔کیونکہ آنجنابؓ کوئی بات قرآن کریم کے خلاف کبھی بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود وہ اشعار آنجناب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور ہمارے اسلامی لٹریچر کا حصہ ہیں۔ جب بچوں کا ذہن اس طرح بنایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ انہیں خلاف قرآن عقائد پر کس طرح شبہ ہوسکتا ہے۔

دیگرے راچہ رسد خود انبیاء کرامؑ بھی غیب نہیں جانتے تھے۔**ولا اعلم الغیب** میں غیب نہیں جانتا۔اس سے بڑھ کر یہ کہ حضورﷺ خود نہ صرف غیب نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا برملا اعلان فرماتے تھے کہ وہ غیب نہیں جانتے۔**ولو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر** (۷/ ۱۸۸)۔اگر میں غیب کو جانتا تو یقیناً میں اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا' جب خود حضورﷺ غیب نہیں جانتے تھے تو پھر کوئی اور شخص کیسے غیب کی خبریں بتا سکتا ہے۔غیب کی خبریں بتانا حضورﷺ کے طریقہ اور سنت کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

☆☆☆

استخارہ

ہمارے ملک میں (دین کا نہیں) ''مذہب'' کا اس قدر غلبہ ہوا ہے کہ ٹی۔ وی چینلز بھی اس غلبہ سے محفوظ نہیں رہ سکے اور اب ہر چینل پر مذہب کے پروگرام باقاعدگی سے نشر ہونے لگے ہیں۔ اذان' عالم آن لائن' بولتے ستارے' استخارہ اور روحانی مشورے کے پروگرام ان میں ہی شامل ہیں۔ پہلے استخارہ بہت کم لوگ' اور بہت پریشانی کے عالم میں دیکھتے تھے' اور عام لوگ بڑے بڑے مقدس علماء سے استخارہ کرایا کرتے تھے۔ لیکن اب استخارہ کا رواج عام ہوتا جارہا ہے اور اب اس ٹی۔ وی چینل کی وجہ سے' اور معاشرہ میں مصائب و پریشانیوں میں اضافہ کی وجہ سے اس میں اور مزید اضافہ ہوگا۔ معاشرہ میں جس قدر پریشانیاں بڑھیں گی استخارہ کا رواج بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ استخارہ دیکھنا قرآن کریم کے خلاف ہے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل سطور پیش خدمتِ عالی ہے۔

حضور اکرم ﷺ جب کفار و مشرکین کے سامنے قرآن پیش فرماتے تھے تو مخالفین وحی کے متعلق وضع وضع کے اعتراضات کرتے تھے' ان کا مقصد قرآن کریم کی تبلیغ میں رکاوٹیں اور موانعات پیدا کرنا تھا۔ وہ برملا کھلم کھلا وحی' نبوت اور رسالت کے متعلق اعتراضات کرتے تھے۔ **وقالی الذین لا یعلمو ن لولا یکلمنا اللہ** (۲/۱۱۸)۔ ان میں سے وہ لوگ جنہیں علم نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست باتیں کیوں نہیں کرتا۔ لیکن اللہ نے ہر انسان کو علم دینے کے لئے وحی کا ذریعہ نہیں رکھا کیونکہ اگر ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست' علم یا ہدایت حاصل ہونے لگتا' تو ہر انسان مجبور محض ہو کر رہ جاتا اور انسان کی آزادی سلب ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و ہدایت دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کر لیتا اور اس کو علم عطا کرتا اور پھر اس کی معرفت تمام لوگوں کو علم دیتا تھا تاکہ تمام انسان اس کو ماننے یا

نہ ماننے میں آزاد رہیں، اور ان کی آزادی قائم رہے۔ سورہ الشوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے۔ **وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا اومن وراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنہٖ ما یشاء (۴۲/۵۱)**۔ اور کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے سے، یا کوئی فرشتہ بھیج دے، غرض وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے۔ یہاں پوری نوع انسانی تک اللہ کی ہدایت وصول ہونے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ پوری نوع انسانی۔ رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے بتائے گئے ہیں ایک وحی جو جبریل لاتے تھے۔ جیسا کہ حضورﷺ پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعے سے جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے۔ **فانه نزله علی قلبک (۲/۹۷)**۔ دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دیتی تھی لیکن متکلم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی ہوتی تھی۔ اور جس کا ذکر سورہ طہٰ میں ہوا ہے۔

یہ مذکورہ بالا دو طریقے انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھے اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام نوع انسانی مشتمل ہے اور جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کلام خداوندی کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول روانہ کرتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام عام انسانوں کو پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بشر سے بات کرتا ہی نہیں تھا اور وحی الٰہی یعنی علم خداوندی بھی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی معرفت آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ انسانوں کو خدا کی وحی اور علم صرف انبیاء کرام کی معرفت ملتا تھا۔ اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن کریم میں محفوظ ہو گیا ہے اس لئے اب علم خداوندی حاصل ہونے کا واحد ذریعہ قرآن کریم ہے اور اللہ سے کلام کرنے کا بھی واحد ذریعہ قرآن کریم ہے۔ جتنی دیر آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں آپ مکالمہ خداوندی سے سرفراز، اور مخاطبۂ الٰہی سے مشرف و سربلند ہوتے ہیں۔

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ سے کسی طرح بھی علم حاصل نہیں ہو سکتا جو علم اللہ تعالیٰ کو دینا تھا وہ دے دیا گیا۔ **و تمت کلمت ربک صدقاً و عدلاً**. کلمات خداوندی صدق و عدل کے ساتھ ختم ہو گئے ۔ختم نبوت کے معنے ہی یہ ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آنا بند ہو گیا ہے اور جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ ختم نبوت کی تردید کر دیتا ہے اور توہین رسالت کا مرتکب ہوتا ہے۔ کشف' الہام' القاء یہ سب ہماری اپنی بنائی ہوئی اصطلاحیں ہیں اور قرآن کریم کو ان سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ استخارہ بھی اسی زمرہ میں شامل ہے اور قطعاً خلاف قرآن ہے اور اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سے قرآن کو مٹا دینے کی بڑی پرفریب ترکیب اور قرآن کے خلاف گہری سازش ہے۔

وقل ربی اعوذ بک من همزات الشیاطین (۲۳/۹۲)۔

اور کہہ دو کہ اے میرے پروردگار میں شیطان کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

☆☆☆

ایک اہم سوال کا جواب

اکثر حضرات کو یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ آیا غیر مسلم جنت میں جائیں گے یا نہیں اور ان کے نیک اعمال کا بدلہ ان کو ملے گا یا نہیں اور یہ کہ کیا مسلمان بغیر نیک عمل کئے ہوئے بھی جنت میں چلے جائیں گے یا نہیں ۔اس سلسلہ میں راقم سطور کمترین کے پاس کئی ای میل اور اکثر خطوط موصول ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سوال اکثر حضرات کے لئے ذہن میں آتا ہے اور باعث خلش ہوتا ہے۔اس لئے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ سوال اکثر اس وجہ سے پریشانی کا باعث بنتا ہے کہ ہمارے اذہان میں نیک اعمال' اسلام' اور جنت کا صحیح قرآنی تصور نہیں ہوتا۔ اگر ان تینوں چیزوں کا

قرآنی تصور ہمارے پیش نظر ہو تو اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں رہتا۔

بات سمجھانے کی خاطر اس سلسلہ میں دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ فرض کیجئے کہ کوئی بد دیانت افسر ہے اور اس کے ماتحت ایک دیانتدار کلرک کام کرتا ہے۔ اس افسر کو برابر اس بات کا خوف لگا رہتا ہے کہ کسی سٹیج پر وہ کلرک اس کو نقصان دہ ثابت نہ ہو اس لئے وہ اس کو کسی ترکیب سے ملازمت سے الگ کر دیتا ہے۔ وہ کلرک ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی' اپنی پریشانی کی وجہ سے' اس افسر کے پاس آتا جاتا رہتا ہے' وہ افسر کبھی کبھی اس پر ترس کھا کر اس کی مالی مدد کی خاطر اس کو سو دو سو روپے دے دیتا ہے۔ آپ یہ خیال فرمائیں کہ اس افسر کا کبھی کبھی اس کی مدد کرنا' کیا نیک اعمال میں شمار ہوگا۔ کیا کسی درجہ میں بھی یہ نیک عملی کے زمرہ میں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کسی ملک کے بڑے بڑے تجار ملک میں غلہ کی ہورڈنگ کر کے' قحط کی حالت پیدا کر دیتے ہیں اور لوگ بھوکے مرنے لگتے ہیں' لیکن اس دوران ایک تاجر اپنے قریبی غریب رشتہ دار یا ملازموں کو کم قیمت پر غلہ فراہم کر دیتا ہے تو آپ خود خیال فرمائیں کہ یہ غلہ کی فراہمی نیک اعمال میں شمار کی جا سکتی ہے؟ اسی طرح ملک کے سیاستدان ملک میں برابر افراتفری قائم رکھتے ہیں' لیکن ساتھ ساتھ انفرادی طور پر نیک کام بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیا ان نیک کاموں کی کوئی اہمیت میزان خداوندی میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے پہلے نیک اعمال کو Def ine کرنا ضروری ہے۔

اسلام کا یہ تصور کہ اسلام محض انفرادی عبادتوں' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی ادائیگی کا نام ہے' صحیح اور قرآنی تصور نہیں ہے۔ اسلام ایک نظام حیات کا نام ہے۔ اس نظام میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مستقل اقدار کو جاری کیا جاتا ہے۔ یہ مستقل اقدار انسانی ذات پر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ہر کام کا اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ ہر وہ کام جو مستقل اقدار کے مطابق ہوتا ہے' اس

کا اچھا اثر ذات پر مرتب ہوتا ہے۔اس سے ذات میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور جس کام سے ذات میں پختگی پیدا ہوتی ہے وہ ہی نیک اعمال ہوتے ہیں اور جن کاموں سے نفس انسانی پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بداعمال اور ''گناہ'' ہوتے ہیں۔نفس انسانی پر یہ اثرات قرآنی نظام کے اندر مرتب ہوتے ہیں۔

قرآنی معاشرہ نیک اعمال کے اثرات مرتب کرنے کے علاوہ اس دنیا کی زندگی کو بھی جنت کی زندگی بناتا ہے۔معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنا' اور قرآنی معاشرہ کے قیام میں ہر طرح کی مخالفت کرنا' انسانیت کے خلاف وہ جرم عظیم ہے جس کے سامنے یہ انفرادی نیکیاں کبھی بھی قابل معافی نہیں ہوسکتیں۔اگر ایک طرف انکا وہ جرم عظیم اور دوسری طرف ان کی نیکیاں ہوں تو ان کی وہ انفرادی نیکیاں' اس جرم عظیم کے مقابلہ میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ہماری یہ بھول ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی نیکیوں کو تو ثواب کا کام شمار کرتے ہیں' اور اس بات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ وہ قرآنی اصول کیا ہیں جن کے مطابق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شے وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا ہے' اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔اگر وہ نظام درست ہے تو اس میں انفرادی نیکیاں بھی اپنے نتائج پیدا کرتی ہیں اور اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی ذاتی نیکیاں اس بدعملی اور گناہ کا بدلہ نہیں ہوسکتیں جو نظام انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جو یہودیوں کا جرم گنوایا ہے وہ عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ وہ خود ہی کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے (۲/۸۵) اور ان کے دوبارہ آباد کرنے کو وہ ثواب عظیم سمجھتے تھے لیکن قرآن کریم نے ان کے اس کام کا نتیجہ دنیا و آخرت میں ذلت وخواری بتایا ہے۔اس بارے میں قرآن کریم کا بہت واضح اصول ہے جو ہمیں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر انفرادی نیکیاں نہ اپنا نتیجہ برآمد کرتی ہیں اور نہ ہی وہ باعث ثواب ہیں۔

یہاں تک تو غیر مسلموں کے نیک اعمال کے سلسلہ میں عرض کیا گیا ہے اس کے آگے سوال کا دوسرا حصہ کہ مسلمان صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے جنت میں جائیں گے تو اس بارے میں عرض ہے کہ یہ بات بھی قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ مسلمان وہ نہیں ہے کہ جو صرف انفرادی نیکیاں کرے بلکہ قرآن کریم کی رو سے مسلمان وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل، انسانیت ساز، اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے اور ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہے) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے اور جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہاں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مخصوص نہیں ہے، اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ بھی اللہ و رسول کی اطاعت کے خواہاں ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ کے باغی، دشمن، اور نافرمان ہیں، خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔ اصل یہ ہے کہ کفر درحقیقت نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ غیر مسلم نظامِ خداوندی کی ذہنی اور اعتقادی طور پر بغاوت کرتے ہیں اور ہم مسلمان اس کو ذہنی و اعتقادی طور پر تسلیم کرنے کے باوجود اس کی عملی طور پر بغاوت کرتے ہیں۔ اس لئے انفرادی اعمال کا بدلہ نہ غیر مسلموں کو مل سکتا ہے اور نہ ہی ہم مسلمانوں کو اور نہ ہی ہم مسلمان صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے جنت میں جا سکتے ہیں اور جو شخص بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ جنت الحمقاء میں رہتا ہے۔

و ما علینا الا البلاغ.

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''حدوداللہ''

پاکستان میں حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء میں جاری کئے گئے تھے اس وقت سے لے کر آج تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان قوانین کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان قوانین کی بیشتر دفعات عقل عامہ (Common Sense) اور قرآنِ کریم کے خلاف ہیں۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے خلافِ قرآن ہونے کے باوجود ہمارا ''علماء'' کا طبقہ اس کے ساتھ ہے۔ اب تک ان قوانین کے خلاف کوئی موثر آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ مقام شکر ہے کہ ٹی۔ وی کے مشہور چینل ''جیو'' نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور گیارہ جون ۲۰۰۶ء کو اپنے چینل میں ایک لائیو مذاکرہ منعقد کیا۔ جس میں معروف علماء نے حصہ لیا۔ مجموعی طور پر چند باتوں پر اتفاق بھی ہوا لیکن افسوس کہ ''رجم'' اور زنا کی شہادت میں چار گواہوں کی شرط کو باقی رکھا گیا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ یہ قوانین اس درجہ خلاف قرآن ہیں کہ ان کو فوراً منسوخ کر دینا چاہئے تھا۔ تاہم اس مباحثہ میں جو کچھ معمولی سی ترامیم پیش کی گئیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ اس قدر معمولی سی ترامیم کی بنا پر ہی مذکراہ کے بزرگ ترین عالم دین سخت برہم ہوئے اور مذاکرہ کے نہایت سمجھدار دونوں کمپیئرز نے ان کو قابو میں رکھا لیکن انہوں نے جس برہمی کا مظاہرہ فرمایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام میں رواداری کا اس درجہ فقدان ہے کہ وہ ایک بات بھی اپنے مزاج کے خلاف سننے کو تیار نہیں ہیں اور اس عدم رواداری کے بارے میں وہ خود کو یہ فریب دے لیتے ہیں، کہ وہ یہ سب کچھ حمیتِ اسلام کی وجہ سے کر رہے

ہیں۔ ان مولانا صاحب نے نہایت ناراضگی سے یہ فرمایا کہ ہم حدود اللہ کی ہر حالت میں حفاظت کریں گے اور انہیں کسی حال میں بھی تبدیل نہیں ہونے دیں گے۔ بعد میں اخبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء کرام نے حدود اللہ کی حفاظت کے بارے میں ایک تحریک چلانے کا بھی اعلان کیا ہے۔ یہ مختصر سا خط حدود اللہ کی وضاحت کے بارے میں طلوع اسلام کو ارسال کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین اس کو ملاحظہ فرما سکیں۔

قرآنِ کریم میں 'حدود اللہ' کے الفاظ کم وبیش چودہ مقامات پر آئے ہیں۔ ہمارے علماء کرام حدود اللہ کے جو معنے لیتے ہیں وہ مذہب کی رو سے لیتے ہیں۔ دین کی رو سے حدود اللہ کا جو مفہوم ہے وہ پیش خدمت ہے۔

''حد'' کے لغوی معنے روکنے کے ہیں۔ جو دو چیزوں کے درمیان ایسی روک ہو جو ان دو چیزوں کو باہم ملنے سے روک دے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ بعض نے حدود کے معنے احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا کہ حقائق ومعانی مراد ہیں۔ امام راغب نے جملہ حدود الٰہی کو ۴ قسم پر محمول فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

(۱) ایسے حکم جن میں کمی وزیادتی دونوں ناجائز ہوتے ہیں' جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کر دی ہیں۔ ان میں کمی و بیشی قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو' لیکن کمی جائز نہ ہو۔

(۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہوں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔

(۴) اور آیۂ کریمہ ان الذین یحادون اللہ و رسولہ (۵۸/۲۰). جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں' میں یحادون اللہ و

رسولہ کے معنے اللہ ورسول کی مخالفت کے ہیں‘‘۔ (مفردات القرآن۔ جلد دوم۔ص ۲۱۷)۔

آپ کو امام راغب کی اس تصریح سے بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ امام صاحب موصوف کے نزدیک حدود صرف وہ سزائیں ہی نہیں ہیں جن کو ہمارے علماء کرام حدود قرار دیتے ہیں بلکہ دین میں تو قرآنِ کریم کے پورے پورے احکام حدود اللہ کیے جاتے ہیں۔ یہ صرف سزاؤں تک محدود نہیں ہوتے۔قرآن کریم نے حدود اللہ کی اصطلاح اکثر ان مقامات پر استعمال فرمائی ہے یہاں سزاؤں کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔ان میں سے چند مقامات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

(۱) کفارہ سے متعلق احکام کو حدود اللہ کہا گیا ہے۔(۵۸/۴)۔

(۲) احکام طلاق بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدود اللہ ہیں‘ ان سے تجاوز نہ کرنا۔(۲/۲۲۹)۔

(۳) وراثت کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ حدود اللہ ہیں‘ ان سے تجاوز نہ کرنا۔(۴/۱۳۔۱۴)۔

(۴) روزوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدود اللہ ہیں‘ ان کے قریب نہ جانا۔(۲/۱۸۷)۔

(۵) حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا‘ خود اپنے پر زیادتی کرے گا‘ اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا۔(۶۵/۱)۔

ان مندرجہ بالا آیات سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہو گا کہ حدود اللہ صرف بدنی سزائیں نہیں ہیں‘ بلکہ جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے قرآنِ کریم کے احکامات ہی حدود اللہ ہیں۔دین میں تو حدود اللہ کا مطلب اعمال کا وہ دائرہ ہے جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا قطعی طور پر منع ہے۔حدود اور اصول و احکامات ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں‘ چونکہ یہ احکام و

قوانین (حدود) وحی الٰہی نے مقرر کئے ہیں اس لئے ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں۔ **ومن یتعد حدود اللہ فاؤلئک ھم الظلمون** (۲/۲۲۹). اور جو کوئی تجاوز کرے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی ظالم ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **تلک حدود اللہ فلا تقربوھا** (۲/۱۱۸)، یہ اللہ کی حدیں ہیں، جن کے قریب نہ جانا۔

(۱) قرآن کریم کی سب سے اہم حد یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے، حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی زیب دیتا ہے۔ **لا یشرک فی حکمہٖ احداً** (۱۸/۲۶). اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ نیز یہ کہ طاغوت میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ (۴/۶۰)۔

(۲) قرآن کریم کی اہم ترین حد یہ ہے کہ ربوٰ حرام ہے اور ربوٰ کھانا اللہ و رسول کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ (۲/۲۷۹)۔

(۳) قرآن کریم کی نہایت اہم حد یہ ہے کہ فرقہ بندی حرام ہے اور شرک ہے (۳۰/۳۲)۔ جو کوئی فرقہ بندی کرتا ہے اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہتا (۶/۱۵۹)۔ اور اس موضوع پر بہت سی آیات ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں تو بہت حدود اللہ ہیں۔ آپ غور فرمالیں کہ ہمارے علماء کرام ان حدود کی طرف کوئی توجہ نہیں فرماتے۔ قبلِ قیام پاکستان، علماء کرام کا بیشتر حصہ متحدہ ہندوستان میں رہنے کے لئے تیار تھا۔ اور طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنے پر آمادہ تھا۔ کیا یہ حدود الٰہی کی کھلی کھلی مخالفت نہیں تھی۔ اب ہمارا سارا معاشی نظام سودی نظام ہے بلکہ ہماری فقہ کا تو مدار ہی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام خالص ربوٰ ہے۔ تحریک طلوع اسلام سے پیشتر آپ ڈیڑھ ہزار سال کا سارا مذہبی لٹریچر نہایت غور سے کھنگال ڈالیں۔ اس سارے لٹریچر میں آپ کو ایک لفظ فرقہ بندی کے خلاف نہیں ملے گا۔ طلوع اسلام نے فرقہ بندی کے خلاف

نہایت بلند آواز اٹھائی، چونکہ اس بارے میں آیاتِ قرآنی بہت واضح ہیں اس لئے ہمارے علماء کرام کے پاس اس کے متعلق کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ فرقہ بندی کا جواز بھی کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تاویلات کرنی شروع کر دیں کہ یہ فرقہ بندی نہیں ہے صرف مکاتب فکر کا اختلاف ہے۔ لیکن حقیقت کبھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں کئی سال سے فرقہ بندی کی وجہ سے قتل ہوتے چلے جا رہے ہیں اور فرقہ بندی نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ خود علماء کرام فرقہ بندی کا اعتراف اور اس کو برا کہنے پر مجبور ہو گئے، لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ خود فرقہ بندی کی پیداوار ہوتے ہیں وہ صرف اس کو زبانی طور پر برا کہہ سکتے ہیں عملاً کوئی اقدام لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیا فرقہ بندی حدالٰہی سے کُھلی ہوئی بغاوت نہیں ہے؟

ہمارے یہی علماء کرام جو حدودِ الٰہی کے تحفظ کی تحریک چلانے کا اعلان کر رہے ہیں وہ خود ان سب حدود کی مخالفت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان حضراتِ کرام کی کیفیت حضرت عیسیٰؑ کی اس مثال کے مانند ہے جس میں انہوں نے اپنے مخالفین کے متعلق فرمایا تھا کہ تم اونٹ کو تو نگل جاتے ہو اور مچھر کو چھان چھان کے پیتے ہو۔

حدود اللہ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا ہے یہ دین کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور یقیناً ان کا تحفظ کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو افسوس صد افسوس کہ یہی حدود اللہ صرف سزاؤں تک محدود ہو گئیں۔ مذہب میں، یعنی ہماری فقہ میں حد قرآن کریم کی مقرر کردہ سزا کو کہتے ہیں اور ہمارے علماء کرام صرف ان کے تحفظ پر ہی اصرار کرتے ہیں، چونکہ ان کے سامنے دین نہیں ہے اس لئے وہ ان حدود کی پروا بھی نہیں کرتے جو دین میں اہمیت رکھتی ہیں اور جن میں سے صرف تین کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ حدود کا اجراء صرف اسلامی حکومت میں ہی ممکن ہے۔ ان کا اجراء و نفاذ غیر اسلامی حکومت میں نہیں ہو سکتا اور اسلامی حکومت کی تعریف Def inition بھی ہمیشہ

پیش نظر رکھنی چاہئے۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک وہ حکومت جس کے قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہوں اور اس میں اسلامی فقہ جاری ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی انفرادی طور پر براہ راست اطاعت ہو رہی ہو، تو وہ اسلامی حکومت ہے۔ اس میں انفرادی طور پر نماز ادا ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پر زکوٰۃ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اس میں ذاتی نیک عملیاں بھی سرانجام دی جا سکتی ہیں لیکن اس تمام کے برخلاف قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جس کا آئین خود قرآن ہوتا ہے، اُس میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس میں اطاعت خداوندی کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ ورسول'' کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس قرآنی حکومت کی اطاعت ہی عبادتِ الٰہی ہوتی ہے۔ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ صرف حکومت کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس حکومت کے احکامات قرآنی معروف اور اس کے جرائم قرآنی منکر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اسلامی حکومت اور صرف اس طرح کی اسلامی حکومت میں حدود کا اجراء ہو سکتا ہے باقی سب بُتانِ آذری۔

وآخر دعونا ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرکِ خفی کا نادانستہ ارتکاب

قرآن کریم کے نزدیک شرک بدترین گناہ اور قبیح ترین جرم ہے۔شرک جلی بہت واضح ہوتا ہے۔ بتوں کو پوجنا شرک جلی ہے اور ہر شخص کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بت پرستی شرک ہے لیکن شرک خفی کی نوعیت ہی مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھیس بدل بدل کر سامنے آتا ہے اور اس کے مرتکب کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے خصوصاً زوال پذیر اقوام اس میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں۔ جب کسی قوم کو زوال آتا ہے تو وہ اپنے بزرگوں' انبیاء و اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں شریک کر لیتی ہے اور یہی شرک ہوتا ہے۔ کسی شخص کو صفات خداوندی سے متصف کرنا شرک ہے۔

جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ بیمار خواہ غریب ہو اور خواہ امیر ہو وہ ڈاکٹر سے ہی رجوع کرے گا۔ڈاکٹر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر' اس مریض کا علاج کرے گا' لیکن ضروری نہیں کہ وہ مریض صحت مند ہو جائے۔ممکن ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو سکے۔اس ساری حالت میں بیمار ڈاکٹر کے علاج کی طرف ہی توجہ کرتا رہے گا لیکن شفاء کے لئے دعا صرف اللہ تعالیٰ سے کرے گا کوئی مریض ڈاکٹر سے شفاء حاصل کرنے کے لئے دعا نہیں کرے گا اگر کوئی شخص' اللہ کو چھوڑ کر' ڈاکٹر سے شفا حاصل کرنے کی دعا کرے گا تو وہ شرک کا مرتکب ہو گا۔

اسی مثال کے مطابق دیگر تمام معاملات مثلاً تجارت' سفر' مقدمات ان تمام چیزوں میں

ہم دوسروں سے مدد حاصل کرتے ہیں لیکن دعا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی کرتے ہیں۔انسانوں کا آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا تو نہایت ضروری چیز ہے لیکن وہ مدد جو صرف تصرف الٰہی سے حاصل ہوتی ہے اس کو کسی اور سے چاہنا' خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنا ہے۔

وحی اور عقل میں بھی یہی فرق ہے۔آپ اپنی مدد کے لئے کسی حکیم' دانا' دانشمند سے مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن آپ کسی سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ وہ وحی الٰہی حاصل کر کے آپ کے کسی مسئلہ کا حل وحی کی روشنی میں پیش کرے۔اسی طرح کسی شخص کا اختیاری اقوال کو وحی قرار دینا' اس کو دوسرا خدا تسلیم کرنا ہے' وحی الٰہی خاص خدائی اختیار و تصرف میں ہوتی ہے۔وہ کسی بشر کے اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتی۔کسی بشر کے عقلی و اختیاری افعال و اقوال کو وحی کا درجہ دینا' اس کو خدا بنا دینا ہے اور یہ شرک خفی کے مرادف ہے۔ہمارے علمائے کرام حضور ﷺ کے ذاتی' اختیاری اقوال کو وحی خفی قرار دیتے ہیں تو وہ اسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کہ انبیاء کرامؑ کے اقوال و افعال ذاتی' بشری ہوتے ہیں اور ان سے غلطی و لغزش کا امکان بھی ہوتا ہے' سابقہ مضامین میں کئی مرتبہ کر دی گئی ہے' اسی بارے میں قرآن کریم نے حضرت داؤد و حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بھی اپنی دفتین میں محفوظ فرما دیا ہے۔جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کے اقوال بشری و ذاتی ہوتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں میں غلطی بھی کر سکتے تھے۔حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام دونوں رسول اور نبی تھے۔ دونوں نے ایک ہی مقدمہ کا فیصلہ مختلف دیا جس سے از خود واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نبی کا فیصلہ درست تھا اور دوسرے کا غلط تھا۔آپ اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وداؤد وسلیمٰن اذ یحکمٰن فی الحرث از نفشت فیه غنمم

القوم و کنا لحکمهم شهدین ففهمنا ها سلیمان و کلا اتینا

حکما و علما (۷۹/۲۱).

اور داؤد و سلیمان جبکہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں جب لوگوں کی بھیڑیں اس پر رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھنے والے تھے۔ تو ہم نے اسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا۔

اس مقدمے کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمائی ہے کہ:

''حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آ گھسیں۔ کھیتی کا نقصان ہوا۔ حضرت داؤد نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا یہ فیصلہ کیا بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ میرے نزدیک کھیتی والا بکریاں اپنے پاس رکھے اور دودھ پیئے اور بکریوں والے کھیت کی آبپاشی اور تردد کریں جب کھیتی جیسی تھی ویسی ہو جائے تو بکریاں لوٹا دیں اور کھیتی لے لیں اس میں دونوں کا نقصان نہ ہوگا۔ حضرت داؤد نے بھی یہ فیصلہ سن کر تحسین فرمائی اور اپنے اجتہاد سے رجوع کیا''۔ (صفحہ ۴۳۷)۔

تفسیر فصل الخطاب میں ہے کہ:

''جناب داؤد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں مالک کو دے دی جائیں مگر ان کے فرزند جناب سلیمان نے کہا کہ انصاف کی رو سے فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ بھیڑوں کے مالک زراعت کو دوبارہ درست کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت

پر آئے اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ ان بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آ جائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے۔ یہی فیصلہ تھا جسے خالقِ کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔"

اس آیہ کریمہ کے ذیل میں مقدمہ کی جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں وہ تمام تفاسیر میں تقریباً کچھ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک جیسی ہی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم نے ان تفاصیل میں سے کسی بات کا کوئی ذکر نہیں کیا' کیونکہ اس کا مقصد تو ایک اصول بیان کرنا تھا' اس کو مقدمہ کی تفاصیل سے کوئی غرض نہیں تھی۔

قرآن کریم سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کے ریوڑ نے کسی کھیت کو رات کے وقت چر لیا۔ وہ شکایت لے کر حضرت داؤد کے پاس آئے۔ حضرت داؤد نے اس کا فیصلہ فرما دیا۔ لیکن وہ فیصلہ کسی وجہ سے' یا تو انہیں غور کرنے کے لئے وقت کم ملا یا انہیں معاملہ کی پوری تفاصیل حاصل نہیں ہو سکیں۔ وہ معاملہ کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکے اور فیصلہ غلط فرما دیا لیکن حضرت سلیمان نے اس کا فیصلہ صحیح فرما دیا۔ یہ سوال کہ پدر گرامی نے کیا فیصلہ کیا' اور فرزند نے کیا فیصلہ کیا خارج از بحث ہے اور مفسرین نے اس معاملہ کی جزئیات فراہم کرنے میں صرف وقت ضائع کیا ہے۔ اس مضمون میں صرف اس قدر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ دونوں حضرات نبی تھے اور دونوں کا فیصلہ ایک دوسرے کے خلاف تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء کرام جو فیصلے مقدمات کے کرتے تھے وہ وحی پر نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ان کے غور و فکر اور تدبر و تفحص کا نتیجہ ہوتے تھے۔ وحی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور اسی وجہ سے ان میں صحت و سقم دونوں صورتوں کا امکان ہوتا تھا۔ انبیاء کرام کے ذاتی' بشری اقوال کو وحی کا درجہ دینے سے ان کو خدائی کا درجہ دینا ہوتا ہے۔ جو شرک خفی کے مرادف ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محدث'' کا انکارِ حدیث نمبر

ماہنامہ ''محدث'' ملتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ ہے جو عرصہ دراز سے لاہور سے شائع ہوتا ہے اور دینی حلقوں میں معروف اور پسندیدہ مجلّہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ جناب حضرت حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب ہیں۔ جو مشہور عالم دین ہیں اور اپنی علمی اور دینی وجاہت کے باعث اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اس مجلّہ میں حدیث کی اہمیت' عظمت' ضرورت اور دفاع سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگست وستمبر 2003ء کا ماہنامہ ''فتنہِ انکار حدیث'' اشاعت خاص کے طور پر شائع ہوا ہے۔ راقم کمترین چونکہ ملک سے باہر تھا اس لئے یہ رسالہ اب چند یوم پیشتر ہی موصول ہوا ہے۔ اس ماہنامہ میں انکار حدیث کے اسباب' اس کی تاریخ' اس کے نظریات اور انکار کرنے والوں کے باہمی اختلافات کو پیش کیا گیا ہے اور سارا مواد بہت محنت اور کاوش سے دستیاب کیا گیا ہے۔ زیادہ اعتراض اطاعت رسول ﷺ کی تعبیر اور مرکز ملت کے تصور پر کیا گیا ہے۔ اپنے نظریات کا اظہار اور قرآن کریم کی تعبیر کا حق سب کو پہنچتا ہے اور قرآن کریم سے محبت اور مسلمانوں کے حال پر غم خواری سب کو ہے۔ یہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہم سب مسلمانوں کو قرآن کریم سے محبت ہے' ملت مسلمہ کا مفاد پیش نظر ہے اور ہر شخص کو اس بات کی تڑپ ہے کہ مسلمان قرآن کریم پر عمل کر کے اپنی زبوں حالی سے نجات پائیں اور ایک زندہ اور متحرک قوم بن جائیں۔ نظریات کے اختلاف اور قرآن فہمی کے مختلف طریقے اختیار کرنے سے' ہمیں

ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی ایک دوسرے سے مغائرت اختیار کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر اختلاف افہام و تفہیم سے دور کرنا چاہئے۔ احقاق حق اور ابطال کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

قرآن حکیم کا اصل الاصول اور العروۃ الوثقیٰ یہ ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا واجب الاتباع ہے۔اس کےعلاوہ کسی کا حکم واجب الاتباع نہیں ہے۔ان الحکم الا للہ (۶/۵۷)۔ولا یشرك فی حکمہ احدا (۱۸/۲۶) آیات اس پر دال ہیں۔قرآن کریم نے ضابطہ حیات (Ideology) کو نا قابل تقسیم قرار دیا ہے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش کو قطعاً منع فرمایا ہے۔افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض۔قرآن کریم کا نظریہ ہے کہ اگر خالص قرآن کریم کی اطاعت نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ خزی فی الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ ہوگا۔اس لئے مسلمانوں پر لازم تھا کہ خالص قرآن کریم کے نظریات کا اتباع کرتے اور اس میں خارج از قرآن نظریات کو داخل نہ ہونے دیتے۔لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی بلکہ پوری انسانیت کی بدبختی کا وہ روز اول تھا جب مسلمانوں نے ملوکیت کے زیر اثر دو دروازے ایسے وا کردیئے جن سے قرآن کریم کے نظریات و احکامات پرکھنے کا معیار ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کی وحی الٰہی ہونے کی منفرد حقیقت بھی ختم ہوگئی۔ بلکہ اس کے خالص نظریات کی اہمیت بھی جاتی رہی۔ اس کے نظریات میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوگئی اور یوں قرآن کریم کے نظریات، عقائد و احکامات خالص نہیں رہے۔جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی خالص نہیں رہی۔

حدیث شریف کے سلسلہ میں اصل نقطہ ماسکہ اس کی اہمیت و عظمت، اس کی شرعی و آئینی حیثیت، اس کی حفاظت و صیانت اور صحت و سقم نہیں ہے۔بلکہ اصلی بحث اس کا وحی الٰہی قرار دینا ہے۔ہمارے ہاں عموماً علمائے کرام و فقہائے عظام احادیث پر برابر مضامین تحریر کرتے چلے

آرہے ہیں اور کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی جارہی ہیں۔ لیکن کوئی صاحب تصنیف عالم تھوڑی دیر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ اصل بحث ہے کیا؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟ متذکرہ صدر موقر جریدہ میں بھی اس مسئلہ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور صرف ایک مقام پر حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب مدظلہ نے اس کا تذکرہ صفحہ 218 پر فرمایا کہ ''یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کی طرح سنت وحدیث رسولؐ بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔'' مولانا روم کا شعر بھی تحریر فرمایا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

جبکہ حضرت اقدس نے سنت نبوی کو حکمت اور وحی خفی قرار دیا ہے (صفحہ ۲۱۹) (حکمت کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے اس معاملہ میں بھی حضرت سے تسامُح ہوا ہے)۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علماء کرام اس نقطۂ نگاہ سے واقف نہیں ہیں بلکہ حدیث کی ساری بحث میں یہ موضوع ایسا ہے کہ علماء کرام خوب واقف ہیں کہ ان کا یہ موقف نہایت کمزور اور انتہائی ضعیف ہے اور کسی طریقہ سے بھی احادیث جو عرصہ بعد جمع و مدون کی گئیں' وحی ثابت نہیں کی جاسکتیں اور وحی ثابت نہ ہونے کی صورت میں حدیث شریف کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل رسالہ میں حدیث پر جامع مضامین تحریر کئے گئے' عربوں کے حافظے کو سراہا گیا' جو بالکل غیر متعلقہ عنوان ہے۔ مگر اس مسئلہ کو صرف ایک جگہ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ ساری بحث کا مرکز ومحور یہی ایک نقطہ ہے اور امت مسلمہ کو جس قدر نقصان اس غلط نظریہ سے ہوا اور کسی نظریہ سے نہیں ہوا۔ جبکہ حقیقتاً حدیث شریف کے وحی الٰہی نہ ہونے سے علماء کرام کی ساری تیار کردہ عمارت خاک کے تودہ کی طرح زمین بوس ہوجاتی ہے۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ہم جن مجامع کو بطور Euphemism احادیث کا

ذخیرہ کہتے ہیں وہ اصلاً حدیث کا ذخیرہ نہیں ہے۔ وہ الفاظ جو حضورﷺ کے ذہنِ مبارک سے صادر ہوئے وہ حدیث تھے۔ لیکن جب وہ مفہوم راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تو وہ حدیث نہیں رہے۔ بلکہ روایت بن گئے اور وہ الفاظ حضورﷺ کے نہیں رہے بلکہ راوی کے اپنے الفاظ ہو گئے۔ کیونکہ علماء خود اعتراف کرتے ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت ہوئی ہیں اور اسی لئے احادیث کے آخر میں او کما قال علیہ السلام شامل کیا جاتا ہے۔ آج جن احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے اول تو یہ احادیث حضورﷺ کی احادیث ہی نہیں ہیں' بلکہ ذخیرۂ روایات ہیں' کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلٍ ایک زبان سے دوسری زبان اور دوسری سے تیسری' چوتھی' پانچویں' چھٹی پر منتقل ہوتے آرہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں رہنا بالکل ناممکن ہے۔ فلہٰذا وہ روایات احادیثِ رسولﷺ ہیں ہی نہیں اور جتنی بحث رسالہ مذکورہ میں حدیث کے بارے میں کی گئی ہے کیونکہ وہ حدیث کو وحی قرار دینے کے بعد کی گئی ہے' لہٰذا وہ اس نقطہ کے پیش نظر رکھنے سے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس اساس پر ساری عمارت تعمیر کی گئی تھی وہ اساس ہی غلط ہے۔ کیونکہ رواۃ کرام کے بیان کردہ اپنے الفاظ کسی حال میں بھی وحی نہیں ہو سکتے۔ اس نقطہ پر علماء کرام جس قدر بھی غور وخوض فرمائیں وہ کم ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ تمام دلائل جو احادیث کی شرعی و آئینی حیثیت کے سلسلہ میں پیش کئے گئے وہ بالکل غیر متعلقہ (misf it) قرار پا جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ حدیث یا صحیح معنوں میں روایات وحی نہیں ہیں' اس کا ثبوت فراہم کرنا علمائے قرآن کی ذمہ داری اور ان کا فرض تھا۔ جس کو انہوں نے خوب خوب ادا کیا اور وہ وہ دلائل و براہین پیش کئے' جن کے جوابات دینے سے علماء روایات قطعاً قاصر رہے۔

قرآن کریم نے وحی کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن کو محک و میزان قرار دے کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن حکیم تو واقعاً وحی ہے' لیکن روایات چونکہ ان امتیازی

خصوصیات کی حامل نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ وحی نہیں ہیں۔ وحی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔

وحی کی مثل نہیں بن سکتی: وحی کی ایک امتیازی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ اس کی مثل نہیں لائی جاسکتی۔

وان کنتم فی ریبِ مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسوره من مثلہٖ (القرآن ۲/۲۳)۔

(ترجمہ) اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے شک میں پڑے ہو پس اگر تم سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسی ہی سورت بنا لاؤ۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے واضح طور پر وحی کا معیار مقرر فرما دیا ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔ اس آیت کریمہ میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس آیت میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعمیم کا ہے۔ جس کے معنی ہیں معارضہ ہر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے اور صرف قرآن کا معارضہ نہیں کیا گیا۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص باآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثیل ونظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بھی بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر طرح کی روایات کتب معتبرہ میں چلی آرہی ہیں۔

وحی قطعی ہوتی ہے۔ ظنی نہیں ہوسکتی: ایمان وعمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا بھی شک وتردد واقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان نہیں لایا جا

سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تا کہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے اسی لئے حضورﷺ نے قرآن کو محفوظ کرا کرامت کے حوالہ کیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی یقینی طور پر اس وحی پر ایمان لائے اس کے علاوہ وہ برگزیدہ ہستیاں کسی وحی پر ایمان نہیں لائیں۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی طبیعت بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد حق ہے۔

ان الظن لا یغنی من الحق شیأ (۵۳/۲۸)۔

تحقیق گمان حق سے کچھ کفایت نہیں کرتا۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچو بہت گمانوں سے، تحقیق بعض گمان گناہ ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے کیا خود اللہ تعالیٰ انسان کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان و یقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہوتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہے۔ قولہ الحق۔ روایات کے مشہور جامعین بھی اس سے متفق ہیں کہ روایات قطعی نہیں ہوتیں کیونکہ ہر وہ روایت جس کا آغاز قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہوتا ہے، اس کا اختتام او کما قال علیہ السلام پر ہوتا ہے۔

وحی متلو ہوتی ہے: ہم مسلمانوں میں صدر اول کے کچھ بعد سے وحی کی تقسیم متلو اور غیر متلو میں کر

دی گئی تھی جس کی رو سے قرآن کریم وحی متلو ہے اور حدیث شریف وحی غیر متلو قرار پائی۔ لیکن قرآن کریم نے وحی کو صرف متلو قرار دیا ہے غیر متلو وحی کا تصور بھی خلاف قرآن ہے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔

کذلک ارسلنک فی امة قد خلت من قبلها امم لتتلوا علیهم الذی اوحینا الیک وهم یکفرون بالرحمن (۱۳/۳۰)۔

اسی طرح (اے محمد) ہم نے تم کو اس امت میں، جس سے پہلے بہت امتیں گزر چکی ہیں بھیجا تا کہ تم ان پر وہ جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تلاوت کر دو۔

اس آیت کریمہ سے بالکل واضح ہے کہ مطلق ما یوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضور امت کے سامنے فرمایا کرتے تھے۔ وحی کل کی کل متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس آیت کے پیش نظر غیر متلو وحی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

وحی صرف جلی ہے: وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قرآن کے باہر تسلیم کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہوتی ہے جبکہ حضور ﷺ کو حکم تھا کہ وحی کو امت تک ضرور پہنچا دیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں تو وحی خفی کس طرح ہوسکتی ہے۔ حضور ﷺ کو حکم خداوندی تھا۔

لا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک، وان لم تفعل فما بلغت رسالته (۵/۶۷)۔

اے رسول جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضورﷺ پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔لیکن حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جا سکتی تھیں۔رسول کریمﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے آ جاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضورﷺ کے خانۂ محترم میں بیٹھے رہتے تھے۔جو اگرچہ حضورﷺ کو گراں گذرتا تھا۔اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔لیکن آپ شرم و حیا اور دل جوئی کی وجہ سے ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے۔لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہوگئی تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو ہرگز مانع نہ ہو سکی۔اس سے ثابت ہے کہ وحی کو تو حضورﷺ کسی حال میں بھی خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے' فوری طور پر آپ اس وحی کو امت میں پہنچا دیتے تھے۔وحی خفی کا تصور ہی باطل ہے۔

وحی میں تضاد نہیں ہو سکتا: ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (۴/۸۲)۔(ترجمہ) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا' تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

آیت مندرجہ بالا نے یہ بات واضح کر دی کہ وحی میں تضاد واقع نہیں ہو سکتا۔لیکن احادیث رسولﷺ کا معاملہ بالکل اس کے نقیض ہے۔ہر فرقہ کی مختلف احادیث ہیں اور ہر فرقے کی احادیث دوسرے فرقے کی احادیث سے مختلف ہیں۔مختلف فرقوں کی مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد احادیث ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی نہیں ہیں۔

وحی کی مندرجہ بالا خصوصیات کے پیش نظر یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ وحی صرف قرآن کریم میں ہے اور روایات کسی طور پر بھی وحی ثابت نہیں ہو سکتیں لہٰذا وہ دین کا حصہ نہیں ہیں۔مکمل دین قرآن کریم کے اندر ہے۔

امت صرف قرآن کی وارث ہے۔ وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں:

والذی اوحینا الیک من الکتٰب ھوا لحق مصدقاً لما بین یدیہ ان اللہ لعبادہ خبیر بصیر۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا (ترجمہ) اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو (کتابیں اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں یہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے' بے شک اللہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت کریمہ میں من بیانیہ ہے اور کسی صورت بھی تبعیضیہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن چونکہ یہ بات درست نہیں ہے اس لئے یہاں من بیانیہ ہی لیا جاسکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثم اورثنا الکتٰب سے مزید وضاحت کی گئی ہے کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امت مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے۔ اگر وحی قرآن کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امت مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیت کریمہ ایسی واضح ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امت مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے اور اسی کے اتباع کی مکلّف۔

حکمت کے متعلق بھی علماء روایات کا عقیدہ ہے کہ حکمت سے مراد حدیث شریف ہے اور یہی بات حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب نے رسالہ موقرہ کے صفحہ ۲۱۸ پر مرقوم فرمائی ہے۔ ہر چند کہ یہ عقیدہ صرف حضرت مولانا صاحب موصوف کا منفرد عقیدہ نہیں ہے' بلکہ تمام علماء روایات کا یہی عقیدہ ہے۔ تاہم یہ باالبداہت قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآنی آیات سے اس

عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً منزل من اللہ ہے مگر یہ بھی قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ ہے، ہر قانون کی غایت، اس کی لم، اس کا Rationale، اس کی حکمت اور اس کی Why of it ہوتی ہے، مثلاً ان تنصر اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم میں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اللہ کی مدد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمارے قدموں کو جما دے گا۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر میں صلوٰۃ کی حکمت یہ فرمائی گئی ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے باز رکھتی ہے۔ روزوں کی حکمت لتکبر اللہ علی ما ھذکم بیان فرمائی ہے، کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانون خداوندی کو غالب کیا جائے۔ آیت کریمہ فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا یحزنون میں ہدایت خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر وحی الٰہی کا اتباع کیا جائے گا تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف و حزن باقی نہیں رہے گا۔ اتباع وحی کی حکمت یہ ہے کہ معاشرہ سے خوف و حزن جاتا رہے۔ کتاب و حکمت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہیں۔

انزل علیک الکتاب والحکمۃ (۴/۱۱۳)۔

خدا نے تیری طرف کتاب و حکمت کو نازل کیا۔

وما انزل علیکم من الکتٰب و الحکمۃ یعظکم بہ (۲/۲۳۱)۔

اور جو کچھ تمہارے پر کتاب و حکمت سے اتارا ہے، تم کو اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے۔

کتاب و حکمت کے لئے صرف ایک ضمیر بہ استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب و حکمت ایک ہی چیز

ہے۔ نیز سورۃ احزاب میں فرمایا۔

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیت اللہ و
الحکمۃ ان اللہ کان لطیفا خبیراً۔

(اے نبی کی بیویو) تمہارے گھروں میں جو آیات خداوندی اور حکمت
تلاوت کی جاتی ہے اس کو یاد رکھو' بے شک اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہے۔

اس سے واضح ہے کہ حکمت کی تلاوت ہوتی ہے اور حکمت غیر متلو وحی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی قرآن سے باہر ہوسکتی ہے۔

جریدہ موقرہ میں ایک مکمل مضمون ''پرویز اور اطاعت رسول'' کے عنوان سے بھی تحریر کیا گیا ہے۔ جو محترم المقام جناب پروفیسر منظور احسن عباسی صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ یوں تو اس موقر رسالہ کے سارے مضامین سنجیدہ ہیں اور زبان بھی متین ہے اور مضامین تحقیق پر مبنی ہیں' لیکن پروفیسر صاحب موصوف کا انداز بالکل سوقیانہ ہے اور زبان بھی متانت سے گری ہوئی ہے۔ دینی مضامین میں یہ بات بہ نظر استحسان نہیں دیکھی جاتی اگرچہ فلمی دنیا کی بات دیگر ہے۔ آپ کس قدر بھی کسی سے اختلاف فرمائیں' لیکن نہ تو شرافت کا دامن ہاتھ سے دینا چاہئے اور نہ ہی زبان سوقیانہ اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے ہاں اگرچہ علماء کرام کو متہم کیا جاتا ہے کہ وہ مجادلہ ومحاربانہ لہجہ اور تلخ اور ترش زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس جریدہ میں تمام علماء نے عموماً شریفانہ لہجہ اختیار کیا ہے' لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب نے' جن کو زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا انہوں نے پورا مضمون استخفاف' استحقار اور استہزاء کے پیرایہ میں رقم فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اور حضرت مولانا محمد رمضان صاحب سلفی نے پرویز صاحب کے حوالہ سے 'مرکز ملت' ' کے تصور سے تعرض فرمایا ہے' حضرت مولانا نے تو صرف انتقاد فرمایا ہے (جس کا جواب آگے آتا ہے) البتہ پروفیسر صاحب موصوف نے انتقاد کے علاوہ متبادل مرکز ملت ''حقیقی مرکز ملت کیا ہے'' کے نام سے پیش

بھی فرمایا ہے۔ان کے اپنے الفاظ Verbative لفظ بہ لفظ' حرف بہ حرف' تحریر کئے جاتے ہیں:

''مرکز ملت وہ نہیں ہے جو اس وقت مسٹر پرویز کے ماؤف ذہن میں ہے بلکہ وہ ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم ہوا۔اور اب تک قائم ہے اور اسی کو چمٹے رہنے اور اسی سے وابستہ رہنے کا ارشاد اس حدیث میں ہے۔ وعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدین من بعدی' عضدا علیها بالتواجذ و تمسکوا بها و ایاکم محدثات الامور ۔تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدین کے طریقے کی پیروی کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھو اور اسی پر جمے رہو' اور خبردار نئی باتوں سے بچتے رہنا۔نئی بات جس سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے یہی مرکز ملت کا ناشدنی تصور ہے جس کے نام سے بھی ملت اسلامیہ بلکہ ملل عالم ناواقف ہیں''۔(یہاں پروفیسر صاحب کا اقتباس ختم ہوا۔)

پروفیسر صاحب نے اپنے طویل مضمون کی جہاں رلم ختم کی ہے اسے علم مناظرہ میں مُصادرہ علیٰ المطلوب کہتے ہیں۔یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل۔ اہل علم خوب واقف ہیں کہ ''خصم'' کے سامنے جب دعویٰ ہی دلیل بن جائے تو وہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔جو لوگ حدیث کو حجت نہیں مانتے ان کے سامنے حدیث سے دلیل دینا کونسی عقلمندی ہے۔

اطاعت رسول کا صحیح طریقہ: علماء قرآن کے نزدیک' قرآن کریم میں غور و تفحص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتباع وحی ہی اطاعت رسول ﷺ ہے چنانچہ آیت کریمہ ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعوه و هذا النبی والذین امنوا والله لی المومنین (۳/۶۸)۔(ترجمہ) بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیم کے بعد سب سے زیادہ قریب وہ لوگ

ہیں جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت قریب ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قریب ترین شخص اس لئے بتایا گیا ہے کہ آپ ملتِ ابراہیم کے پیروکار تھے۔ نیز صحابہ کرامؓ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا اقرب کہا گیا ہے کیونکہ صحابہؓ حضورؐ کے متبع تھے اور حضورؐ حضرت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ اسی طرح وہ صحابہؓ بھی ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضورؐ کے پاس حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے موصول شدہ احادیث و روایات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا کہ آپ احادیث ابراہیمؑ کا اتباع کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اقرب بنے ہوں۔ اس کی اصل صورت' سورہ نمبر ۱۰۶/ ۹ و ۱۰۹/ ۱۰ سے واضح ہوتی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بھی وحی کے مطیع تھے اور حضورؐ بھی وحی کے متبع تھے اسی لئے حضورؐ کا اتباع بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ اسی طرح صحابہؓ کا اتباعِ قرآن حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ نیز اسی توجیہ سے یہ بات قابل تسلیم ہے کہ چونکہ حضورؐ خود قرآن کریم کے متبع تھے اس لئے قرآن کا اتباع کرنے سے ہی حضورؐ کا صحیح اتباع ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ما یوحیٰ اور ما انزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہے اور جملہ انبیاء کی طرف ما یوحیٰ اور ما انزل صرف کتاب ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی کیونکہ جملہ انبیاء کرام کی وحی اور کتب کی تعلیم ایک ہی تھی اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے جملہ انبیاء کرام ایک ہی تعلیم کے متبع تھے پس ثابت ہوا کہ قرآن کریم کا اتباع ہی حضرت ابراہیمؑ سمیت جملہ انبیاء کا اتباع ہے۔ اسی کی اتباع ملت ابراہیم یعنی ضابطۂ ابراہیم کی اتباع ہے۔ اسی (قرآن) کی اتباع اسوۂ ابراہیمی (۶۰/۴) کی اتباع ہے اور اسی کا اتباع اسوۂ محمدیؐ کا اتباع ہے (۳۳/۲۱) جس کے لئے حدیث

شریف یا وحی خفی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اللہ ورسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت تصور کرنا درست نہیں ہے۔ یعنی اللہ کا حکم الگ اور رسول کا حکم الگ' حالانکہ دو حاکم اور دو حکم ماننا قرآن کریم کی محکم آیات کے خلاف ہے۔ ان الحکم الا للہ (۶/۵۷) لا یشرك فی حکمہ احداً (۱۸/۲۶)۔ ان آیات کے مطابق اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا یہ ترجمہ ''اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' مطلقاً غلط ہے بلکہ اس میں واؤ کے معنی بذریعہ ہیں جیسے کہ براٰۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر و اعلموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکٰفرین (۹/۱)۔ (ترجمہ) بیزاری ہے اللہ کی بذریعے اپنے رسول کے ان لوگوں سے جن کے ساتھ تم نے مشرکوں سے عہد کیا تھا۔ (اور اعلان اور فیصلہ ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے کہ اے مشرکو) تم زمین پر چار ماہ حرمت والے چل پھر لو۔ اور جان لو یہ کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

اسی طرح آذان من اللہ و رسولہ الخ' میں ''وٗ'' بذریعہ کے معنی میں آئی ہے (ترجمہ) اعلان ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے حج اکبر کے دن کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان اپنے رسول کے ذریعے کرایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ اللہ اور رسول کے دو اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی اعلان تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے کرایا تھا کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے۔ نیز ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غروراً (۳۳/۱۲) (ترجمہ) (منافق کہنے لگے) نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے بذریعہ اپنے رسول کے مگر فریب دینے کو) یہاں بھی واؤ بمعنی بذریعے آیا ہے' کیونکہ اللہ

تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ذریعے ہی وعدہ فرماتا ہے' خود آ کر نہ کوئی وعدہ لیتا ہے اور نہ کوئی وعدہ دیتا ہے۔

اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت ہے: اصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت دو مطاعوں کی اطاعت نہیں ہے۔ جیسا کہ تین مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا اور کسی کی بھی ہے حتیٰ کہ خود رسولؐ کے متعلق بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائیں۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز دین وہ Central Authority ہے جہاں سے قرآنی احکامات نافذ ہوں اور جہاں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے کی جاسکتی ہو۔ یہ حقیقت کہ اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت ہے قرآن کریم میں اس قدر واضح ہے کہ جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ' ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸/۲۰) اے مومنو' تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو' درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔

یہاں اللہ و رسول دو کا ذکر ہے اور عنہ' کی ضمیر واحد ہے۔ اسی طرح سورہ انفال میں دوسری جگہ ہے۔

(۲) یاایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴)۔ اے جماعت مومنین تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے۔

یہاں بھی اللہ و رسول کا ذکر ہے اور صیغہ (دعاکم) واحد ہے۔ اسی طرح سورہ نور میں ہے۔

(۳) واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم

معرضون وان یکن لھم الحق یاتوآ الیہ مذعنین (۲۴/۴۸)۔(ترجمہ) اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے متنا زعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے لیکن بعد میں لیحکم میں صیغہ واحد ہے اور الیہ میں ضمیر واحد ہے۔

(۴) یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ و للرسول (۸/۱) (ترجمہ) تجھ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ان سے کہہ دو کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

اس آیت سے آگے چل کر ہے۔

(۵) واعلموا انما غنمتم من شئٍ فان للہ فمسہ و للرسول (ترجمہ) اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مال غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ ''اللہ اور رسول'' کا ہے۔

(۶) کتب اللہ لا غلبن انا و رسلی (۵۸/۲۱)۔(ترجمہ) ضرور ہے کہ میں اور میرے رسل غالب رہیں گے۔

ان تمام مقامات نیز (۳۳/۵) میں اللہ اور رسول سے مراد امام' امیر' مرکزی اتھارٹی' یا مرکز ملت ہے۔یہ مفہوم کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس پر ہمارے دور کی دو تفسیریں ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اور تفہیم القرآن جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم کی شاہد ہیں۔

ثابت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام حضور ﷺ نے قائم فرمایا ہے اور اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی الگ اطاعت نہیں ہے جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

ہمارے ہاں چونکہ ملوکیت کے درآنے کی وجہ سے اسلامی نظام کا تصور محو ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نظام کے چلانے کی آخری اتھارٹی کے تصور کی بھی ضرورت نہیں رہی' لیکن آپ جب بھی اسلام بطور نظام مانیں گے' آخر کوئی نہ کوئی تو حاکم اعلیٰ کا مقام متعین فرمائیں گے۔ اگر آپ کو مرکز ملت کا لفظ خوش آئند معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اس کا کوئی اور نام قرار دے لیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھنا ہوگا۔ ہاں البتہ اگر آپ نظام کا تصور ساقط کر دیں' اور مذہب کو نجی' ذاتی معاملہ قرار دے لیں تو پھر بے شک کسی فائنل اتھارٹی کی ضرورت نہیں رہے گی' اور یہی علماء کرام کی دلی خواہش ہے اور یہی اسلام کا تصور ان کا ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہے' اس صورت میں عملاً اطاعت رسول کا مفہوم روایات پر عمل کرنا رہ جاتا ہے۔ لیکن اس میں اسلام کے بحیثیت نظام کے غلبہ حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں رہتا۔ کیونکہ روایات پر عمل غیر اسلامی حکومت میں بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔

تاکید مزید اور تائید قرآنی کے طور پر عرض ہے کہ سورۂ یٰسین شریف میں ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ' ان ھوالا ذکر و قرآن مبین۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی حضور اکرم کو انسانیت کی راہنمائی کے لئے ملا وہ صرف اور صرف قرآن کریم ہے۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی علم حضور ﷺ کو ذات باری تعالیٰ سے حاصل نہیں ہوا۔ عربی دان حضرات اور بالخصوص ہمارے علماء کرام اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو' تو صرف استثنیٰ یعنی الا حصر کا فائدہ دیتا ہے کہ نہیں وہ تعلیم ہماری کچھ بھی مگر وہ صرف قرآن ہے' ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے جو قرآن کریم

میں متعدد مقامات پر آئی ہے گذشتہ واقعات کا جو علم حضرت مریمؑ اور حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں حضور ﷺ کو عطا ہوا اس کی وضاحت فرمادی کہ ذالک من انباء الغیب نوحی الیک۔ اسی طرح فتح مکہ کا علم حضور کو ہوا' وہ قرآن کریم کے ذریعے ہی ہوا' قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی ذریعۂ علم حضور کے پاس گذشتہ اور آئندہ واقعات معلوم کرنے کا نہیں تھا۔ جو روایات حضرت امام مہدی کی تشریف آوری' نزولِ مسیح' دجال' دابۃ الارض کے واقعات کی تفصیل ہیں ان میں سے کسی کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے لہٰذا یہ سب موضوع اور قرآن حکیم کی صریح تعلیم کے خلاف ہیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہ تمام نظریات ہم میں موجود ہیں اور ان ہی غلط عقائد کی وجہ سے باطل فرقے موجود ہیں۔

ابتدائے مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ جن میں سے ایک کی تفصیل عرض کر دی گئی ہے کہ حدیث کو وحی قرار دینے سے قرآن کریم کے اصل نظریات پس پشت کر دیئے گئے اور غیر قرآنی نظریات پیش نظر رہنے لگے۔ دوسرا سبب قرآن فہمی کا غلط طریقہ ہے جس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

ہماری تفاسیر میں ایک نظریہ شان نزول کا پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی تھی اور یہ آیت اہل بیت کے فلاں محترم فرد کے لئے' اس طرح قرآنی احکام کی عمومیت' عالمگیریت' ابدیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے ہے' صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ اس طرح شان نزول کا عقیدہ فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ جو کسی بھی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اور حالت یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے' اور شان نزول تفسیروں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اور صورت یہ ہے کہ ایک

ایک آیت کے کئی کئی شان نزول ہیں۔ پھر ہر فرقے کے الگ الگ شان نزول اور ہر شان نزول باندازِ تشکیک مندرج ہے تاکہ کوئی یقینی بات مل ہی نہ سکے۔ قرآن کریم کی آیات قطعی اور یقینی ہیں لیکن شان نزول اور روایات سب ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ ان کے سہارے سے قرآن کریم کی تفسیر کرنے سے قرآن کریم کی ساری تعلیم مشکوک، ظنی اور غیر قطعی ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے قرآن فہمی کے طریقے خود ہی مقرر فرمائے ہیں جن سے ہمارے مفسرین نے قطعاً استفادہ نہیں کیا۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ عربوں کی روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہے فو رب السماء والارض انه لحق مثل ما انکم تنطقون (۵۱/۲۳)۔ آسمان اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اس کا انداز کلام اس طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا (۲۶/۱۹۲)۔ غیر ذی عوج (۳۹/۲۸) ہے اس میں کوئی کجی نہیں۔ لہٰذا قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر مقام پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھا جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ کے وہ Original معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت مروج تھے۔ مرور ایام سے زبانوں کے الفاظ اپنے اصل معنی چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے معانی اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ، ذکر، تذکیر، وسیلہ، تہجد، وحی، مغفرۃ، شفاعت، امام، تسبیح، عبادت، الٰہ، وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کے معنی مرور ایام سے بدل گئے ہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے وہی معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت ان کے معنی تھے لیکن ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی نہیں لئے جو نزول قرآن کے دوران تھے اور روایات کے زیر اثر وہ معانی اختیار کئے جو نزول قرآن کے وقت نہیں تھے۔ اس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم مخفی ہو گئی اور غیر قرآنی نظریات رواج پا گئے۔

دوسرا طریقہ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کا تصریف الآیات قرار دیا ہے اور یہ طریقہ بہت اہم اور ضروری ہے۔قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم کے ساتھ ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق واحسن تفسیرا (۲۵/۳۳)۔(مفہوم) اے رسول لوگ آپ کے پاس قرآن کی مثل نہیں لائیں گے مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس حق (قرآن) اور اس کی تفسیر لاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کردی ہے۔قد فصلنا الایات لقوم یفقھون (۶/۹۸)۔نیز فرمایا کہ انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون۔ دیکھو ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ لوگ ان میں غور کریں۔حضور علیہ السلام کا طریقۂ تفسیر بھی تصریف آیات کے ساتھ تفسیر کرنے کا تھا۔کذالک نصرف الایات ولیقولوا درست ولنبینہ' لقوم یعلمون (۶/۱۰۵)۔ہم آیات پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیں تانکہ لوگ کہہ دیں کہ آپ نے خوب خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تا کہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دی۔ حضور علیہ وسلم ﷺ کی سنت یہی ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کریں۔قرآن کریم میں جو آیات بار بار پھیر پھیر کر لائی جاتی ہیں تو ان کا کوئی مقصد ہے یونہی بلا مقصد بار بار نہیں دہرائی جاتیں۔

تصریف آیات کا طریقہ اختیار کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ خارج از قرآن نظریات کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خارج از قرآن نظریات قرآن میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے قرآن کریم کے مقرر کردہ ان دونوں اصولوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔جس کی وجہ سے خارج از قرآن نظریات داخلِ تفاسیر ہو گئے۔قرآن حکیم نے زانی کی سزا سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن مبنی بر روایات تفاسیر میں زانی کی سزا رجم ہے اس طرح رجم کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان مفسرین کرام کی اطاعت ہوتی ہے

جنہوں نے یہ نظریہ شاملِ قرآن کیا ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ۱/۵ حصہ اسلامی حکومت کے لئے مختص کر کے، باقی ۴ حصص یتامیٰ، مساکین، ابن سبیل اور مجاہدین کے رشتہ داروں کے لئے مخصوص کئے ہیں جو بہت واضح احکام ہیں لیکن حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں اسی رسالہ کے صفحہ ۱۵۸ پر رقم فرمایا ہے ''قرآن کریم میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مال غنیمت حاصل کریں، اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے، سوال یہ ہے کہ باقی ۴ حصے کیا کئے جائیں۔ تمام مجاہدین پر برابر بانٹ دیئے جائیں یا فرق کے ساتھ۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔ یہ تقسیم قرآن کریم کے واضح احکامات کے خلاف ہے۔ لیکن یہ تفسیر روایات پر مبنی ہے۔ اسی طرح جو حضرات ہر سال کروڑوں روپوں کا خمس ذوی القربیٰ کی مد میں ساداتِ عالی درجات کو دیتے ہیں وہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس کی بڑی بڑی رقوم، مذہب کے نام پر رائیگاں جاتی ہیں۔ سادات کو خمس کی رقوم دے کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ بلکہ مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم میں ولذی القربیٰ سے مجاہدین اور شہداء کے رشتہ دار مراد ہیں۔ نہ کہ حضور ﷺ کے رشتہ دار، کیونکہ اس آیت کریمہ سے ماقبل و مابعد کی آیات میں جہاد کا تذکرہ ہے، سادات کا کوئی ذکر نہیں چل رہا ہے، اسی طرح غلام، لونڈی، نکاحِ نابالغاں، ملکیتِ زمین، پیشوائیت، ملوکیت، قرآن کریم کے برخلاف، ان سب کا جواز موجودہ تفاسیر کی بنا پر ہے اور بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسلمان زیادہ تر اطاعت خودساختہ انسانی نظریات کی کرتے ہیں اور تقریباً ۱۰ فیصد اطاعت اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں جس کی پاداش میں قرآن کریم کی آیت کریمہ کے مطابق خزی والحیوۃ الدنیا والاخرۃ میں مبتلا ہیں۔ جب تک خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کی جائے گی مسلمانوں کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ اور یہی طلوع اسلام کا مقصد ہے اور یہی اس کا دعویٰ ہے کہ مومن وہ

ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔اس کے نزدیک ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول ﷺ کے باغی اور نافرمان ہیں۔خواہ وہ کس قدر بھی نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔

اس سلسلہ میں مزید چند نقاط پیش خدمت کئے جاتے ہیں اور علماء کرام اور مفکرین قرآن کی خدمت میں درخواست ہے کہ ان نقاط کو دل جمعی سے مطالعہ فرمائیں اور اس کی ایک ایک شق پر غور فرمائیں اور اپنے غور وفکر کو دینی جرائد میں پیش فرمائیں۔

ا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی تفاسیر ہیں، سب ایک دوسرے کے چربے ہیں اور ایک ہی اصول یعنی تفسیر بالروایات کے طریقے پر تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تعداد کی کثرت، اسلاف سے اخلاف تک کا امتداد ان کی صحت کے لئے کوئی دلیل فراہم نہیں کرسکتی۔ ان سب کی طرف سے صرف نظر کرنا، صرف ایک اصول یا صرف ایک تفسیر سے صرف نظر کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس انداز پر تفسیر لکھنے سے فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا۔ چونکہ ہر فرقہ خواہش مند تھا کہ اپنے عقائد کی سند قرآن کریم سے مہیا کرے لیکن آیات کے

الفاظ ان عقائد کی سند مہیا کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے موضوع روایات کا سہارا لیا گیا اور ہر غیر قرآنی عقیدہ کی سند تفسیر بالروایات سے حاصل کی گئی۔ چونکہ موضوع روایات کی کوئی کمی نہیں تھی اس لئے اس طرح کی تائیدات فراہم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور اس سے فرقہ بندی میں اضافہ ہوا۔ ہر فرقہ کی تفسیر الگ ہونے لگی۔ ہر فرقہ کی مختلف تفسیر ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک ذخیرہ تفسیر درست ہے اور باقی سب فرقوں کی تفاسیر غلط ہیں اور غلط روایات سے ان کی تائید حاصل کی گئی ہے۔

۳۔ ساری تفاسیر جس دور میں لکھی جانی شروع ہوئی ہیں اس وقت تک اسلام اپنی اصل اور درست شکل میں نہیں رہا تھا۔ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور ایک دین ہے جس دین کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ نے اس دین کو جاری فرمایا اور خلافت راشدہ کا نظام اسی دین پر مبنی تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت غالب آ گئی اور دین اور ضابطۂ حیات کا تصور آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ ہماری تفاسیر ملوکیت کے دور کی تصنیف کردہ ہیں اور قرآن کریم کو دین کے بجائے مذہب کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ آج جب کہ انسانی ذہن کے تراشیدہ نظامہائے زندگی ناکام ہو رہے ہیں' اسلام بحیثیت ضابطہ حیات اور دین کے سامنے آ رہا ہے لیکن وہ تفاسیر جو قرآن کو بطور مذہب پیش کر رہی ہیں' اسلام کو بہ حیثیت دین پیش کرنے سے مانع ہو رہی ہیں اور اسلام کو بحیثیت نظام جاری کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

۴۔ ان تفاسیر میں شان نزول کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور شان نزول کو پیش نگاہ رکھ کر ہی آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس لئے آیات کو مقید اور محدود کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم ایک آفاقی دین پیش کرتا ہے۔ اس کو کسی ملک' خطہ' قوم' یا دور سے مختص نہیں کر سکتے اس کی آفاقیت ہمہ گیر ہے۔ شان نزول کی وجہ سے ان آیات کی آفاقیت ختم ہو جاتی ہے اور آیت کا صرف ایک واقعہ کے ساتھ اختصاص ہو جاتا ہے۔ عقلاً بھی شان نزول کا عقیدہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ

کی منشاء وتدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہیں ہوتی۔ یا اگر واقعات زیادہ تعداد میں پیش آجاتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ہوتا۔ یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

۵۔ آخری بات قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تصریف آیات پر اس قدر زور دیا ہے اور قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے خود بطور ایک اصول متعین فرمایا ہے' اس اصول سے ان تفاسیر میں کوئی مدد نہیں لی گئی اور اس اصول کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ آپ ایک ہزار سال کی تحریر کردہ تفاسیر کو کھنگال ڈالیں' اس اصول کی کوئی رمق آپ کو کہیں نہیں دکھائی دے گی اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس طرح تفسیر کرنے سے غیر قرآنی نظریات کی سند بالکل نہیں مل سکتی جن کی سند روایات سے بآسانی مل جاتی ہے اور عملاً یہ صورت ہوئی کہ قرآن کریم بالکل مخفی ہو گیا اور آج جو ہمارے پیش نظر ہے وہ صرف روایات کی تعلیم ہے اور بس۔

مسلمان قوم کو زندگی صرف اس صورت میں مل سکتی ہے کہ اس کے سامنے خالص قرآن ہو اور بحیثیت نظام' دین اور ضابطہ حیات کے اس پر عمل کیا جائے۔

وما ارید ان اخالفکم الی ما انھٰکم عنه ان ارید الا
الاصلاح ما استطعت ○ وما توفیقی الا باللہ
علیه توکلت والیه انیب (۱۱/۸۸)۔

وھٰھنا تم منا الکلام
علی مصطفٰنا الوف سلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں میں تصوف پھیلانے کی کوشش

ہمارا موجودہ دور جس قدر بے اطمینانی' تشدد اور ظلم وجور سے بھرا ہوا ہے۔ شاید اس سے قبل کم ہی ایسا ہوا ہوگا۔ اس بے چینی اور افراتفری کا کوئی ایک سبب نہیں ہے۔ اس کے بے شمار اسباب ہیں جن کی نشاندہی قرآن کریم نے بھی کردی تھی لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے حالات نے انہیں بالکل دیوار سے لگا کر کھڑا کردیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ تشدد پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ حالات کے بگڑنے میں سب سے بڑا کردار اسرائیل کا قیام ہے۔ اسرائیل کے قیام سے پیشتر مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ خود مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک میں یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہائش پذیر تھے۔ قیام پاکستان کے وقت کراچی میں یہودیوں کی آبادی موجود تھی۔ یہاں ایک Synagug (جو یہودیوں کی عبادت ہوتا ہے) بھی موجود تھا۔ اور ان کے Cafe بھی موجود تھے۔ ساری دنیا میں یہودیوں کی کل آبادی تقریباً 2 کروڑ سے کم ہی ہے' اسی تناسب سے وہ کراچی میں مقیم تھے۔ مسلمان بھی مجموعی طور پر امن پسند تھے۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر' یا فتوحات کی وجہ سے کوئی برا سلوک غیر مسلموں سے کیا ہو تو وہ الگ بات ہے' لیکن مسلمان بحیثیت مجموعی کبھی بھی تشدد پسند نہیں تھے۔ مسلمانوں کی موجودہ تمام تشدد پسند تنظیمیں آج کل کی سیاست کی پیداوار ہیں۔ ان کا مسلمانوں کے عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کے حالات اس

قدر برے نہ ہوتے، تو وہ اس درجہ تشدد پر نہ اتر آتے۔

افغانستان و عراق کے موجودہ حالات نے مسلمانوں کو مزید تشدد پسند بنایا ہے۔ یہ رسالہ چونکہ عملی سیاست سے تعرض نہیں کرتا، اس لئے اس مضمون میں سیاسی نوعیت کی کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔ اس رسالہ کا مقصد تو موجودہ حالات پر قرآن کریم کی رو سے تبصرہ کرنا ہوتا ہے اور وہ تبصرہ اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مسلمانوں کے موجود تشدد پسند رجحانات کے باعث مغرب اور امریکہ ان سے خوف زدہ ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ ان زیادتیوں کا مداوا کریں جو مسلمانوں پر ہوئی ہیں، اس بات کی فکر میں ہیں کہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ اختلافات پیدا کریں اور دوسرے یہ کہ ان کو فکری طور پر بالکل بے حس کر دیں۔ مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کی تاکید سیموئل ہنٹنگٹن S. Huntington نے اپنے مضمون Clash of Civilization میں کی ہے۔ ان پروفیسر صاحب کا یہ مضمون امریکہ کی مشہور میگزین میں بین الاقوامی سطح پر طبع ہوا تھا۔ وہ مضمون اب بھی دستیاب ہے، جس کا دل چاہے اس کو پڑھ سکتا ہے، ہمارا ایک مضمون، اس مقالہ کے تعاقب میں طبع ہو چکا ہے، مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کے علاوہ مغرب کی دوسری سوچی سمجھی سکیم یہ ہے کہ مسلمانوں میں تصوف کو فروغ دیا جائے۔ مغرب میں برابر، مسلسل اور متواتر تصوف کی مدح و تعریف میں بکثرت مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایک دن ایسا ہوتا ہوگا جس میں Printing Media یا Electronic Media میں ایسے مضمون نہ آ رہے ہوں، اخبارات کی اطلاع کے مطابق ہمارے ہاں پاکستان میں بھی بین الاقوامی تصوف کانفرنس یا اسی طرح کے اجتماعات منعقد کئے گئے ہیں۔ مغرب اور خود مسلمانوں میں بعض دانشور جو تصوف کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ ہوتی ہے کہ تصوف رواداری اور کشادہ دلی کو فروغ دیتا ہے اور ان حضرات کے خیال کے مطابق اگر مسلمانوں میں تصوف پھیل جائے تو وہ تشدد سے دست بردار ہو جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ خالص اسلام

کی تعلیم تشدد پیدا کرتی ہے' اور اسلام کی وہ Aspect جو تصوف پر اصرار کرتی ہے وہ امن پیدا کرتی ہے۔

کیرن آرم سٹرونگ Karen Armstrong' تاریخ مذاہب کی بڑی مشہور سکالر ہیں۔ وہ بیس (20) کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان کا ایک مضمون ''امن کی آشا'' کے سلسلہ میں مشہور اخبار ''دی نیوز'' کی یکم جنوری 2011ء کی اشاعت میں طبع ہوا تھا جس میں انہوں نے صوفیوں اور ہندو مذہب کے Bhakts حضرات کی بہت تعریف کی ہے اور تصوف کو بہت سراہا ہے۔ وہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر موقع ملا تو اس کا ترجمہ پیش خدمت عالی کیا جائے گا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام امن پسندی پر کتنا زور دیتا ہے اور تصوف کس درجہ قرآن کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں تصوف کا کتنا کردار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیْنَ آمَنُوا وَلَمْ یَلْبِسُوا اِیْمَانَھُم بِظُلْمٍ اُولٰئِکَ لَھُمُ الاَمْنُ وَھُم مُّھْتَدُون (6:82)-

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہیں کیا انہیں کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

قرآن کریم نے قیامِ امن کے لئے دو اجزاء ضروری قرار دیئے ہیں۔ ایک تو اللہ پر ایمان اور دوسرے عدلِ اجتماعی۔ اگر خدا پر ایمان ایسا نہ ہو جس کی وضاحت آگے آتی ہے اور دوسرے یہ کہ عدالت اجتماعی کی جگہ ظلم وستم کا دور دورہ ہو تو ایسے معاشرے سے امن وامان ختم ہو جاتا ہے اور دنیا میں بدامنی کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود کبھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔

قرآن پر ایمان لانے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ انسانی ذہن

نے جس قدر نظامہائے حیات وضع کئے ہیں، ان تمام نظامہائے حیات سے وہ نظام بدرجہا بہتر ہے جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ قرآن کے نظامِ حیات کے علاوہ تمام نظامہائے حیات میں انسانیت پر ظلم ہوتا ہے اور قرآن کا نظام وہ واحد نظام ہے جو دنیا میں عدالت اجتماعی قائم کرتا ہے۔ اگر ساری دنیا میں عدل اجتماعی قائم ہو جائے اور ہر شخص کو انفرادی طور پر اور ہر قوم کو اجتماعی طور پر اس کے حقوق ملتے رہیں تو دنیا سے ظلم و جور اور تشدد کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

(1) قرآن کریم میں ارشاد عالی ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى اَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ(5:8)-

اے ایمان والو ہمیشہ عدل کے علم بردار بنو۔ اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرسکو، عدل کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں پر بحیثیت مجموعی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ساری دنیا میں حق و عدل کے علم بردار بنیں۔ خود اپنے اندر اس کو قائم کریں اور اسی کی شہادت دنیا کے سامنے دیں۔ حق و عدل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کسی قوم کی دشمنی ہے، اس کے لئے تاکید کی گئی ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط سلوک بھی مسلمانوں کو عدل و حق سے ہٹانے کا سبب نہ بن سکے۔ ایسا رویہ قائم کرنے میں سب سے بڑا محرک یہ ہے کہ دشمن قوم سے عدل کرنا ہی تقویٰ ہے اور تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو سب سے بڑا اہم مقصدِ حیات ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں عدل پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ پہلے تو مسلمانوں کو عدل کا حکم

دیا گیا کہ ہمیشہ خدا کے لئے قیام کرو اور عادلانہ نظام جاری کرو اس کے بعد انحراف کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو سخت تاکید کی کہ قومی عداوتیں اور شخصی معاملات تمہیں عدل سے نہ روک سکیں کہ کہیں تم دوسروں کے حقوق تلف کرنے لگو' ضمناً آپ یہ بھی ملاحظہ فرمالیں کہ ہم عموماً اس شخص کو متقی سمجھتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ پرستش کرتا ہے لیکن قرآن کی رو سے تقویٰ کے مفہوم میں پرستش کا کوئی تصور موجود نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے تو اولین فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ساری انسانیت کی نگرانی کریں۔ ساری دنیا کی ایک ایک قوم' اور ایک ایک ملک پر نظر رکھیں کہ کسی کے ساتھ زیادتی تو نہیں ہو رہی ہے۔ اگر کسی ایک قوم یا ایک فرد کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہے تو مسلمانوں کا بحیثیت مجموعی یہ فرض کفایہ ہے کہ وہ مظلوم کا ساتھ دیں' اور ظالم کا ہاتھ ظلم کرنے سے روک دیں۔ ان واضح احکامات کے ہوتے ہوئے بھلا مسلمان خود کیسے ظلم کر سکتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں جس سے کسی دوسرے شخص کو کسی طرح کا بھی نقصان پہنچے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (2:143)-

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امتِ عادل بنایا تاکہ تم لوگوں پر نگران رہو' اور رسول (اور اس کے بعد اس کے جانشین) تم پر نگران رہیں۔

وَسَطً لفظ وَلَدَ کی طرح مذکر' مونث' واحد' جمع سب کے لئے آتا ہے۔ تفسیر ماجدی میں مرقوم ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں وَسَطً کی تفسیر عدل سے آئی ہے **عن ابی سعید الخدری عن النبی** ﷺ **امةً وسطاً قال عدلاً** (ابن کثیر عن (احمد) ص 270)۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم عدل وانصاف کے راستہ سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹے۔ یہ ایسی قوم ہو سکتی ہے جسے بین الاقوامی اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو اور جو تمام دنیا بھر کی اقوام کے اعمال وافعال کی

نگران ہو اور بین الاقوامی تنازعات کو عدل وانصاف سے حل کر سکے بالکل اسی مفہوم کو کہ مسلمان تمام دنیا کے نگران ہوں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (57:25)-

اور ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان پر اپنی کتاب و میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ ساتھ قیام کریں۔

(تفسیر نمونہ) انبیاء کرام کا اولین مقصد ''اقامۃ قسط'' ہوتا تھا' آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انبیاء کرام نہ صرف ''اقامۃ قسط'' کرتے تھے بلکہ وہ دوسرے انسانوں میں بھی قیام عدل کی تحریک پیدا کرتے تھے اسی لئے فرمایا ''لوگ انصاف کو بروئے کار لائیں۔'' قرآن کریم کے احکام اس طرح جاری کئے جائیں کہ مسلمان خود عدالت وانصاف جاری کرنے والے بن جائیں۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد محض وعظ ونصیحت کرنا نہیں تھا اور نہ ہی اللہ نے اپنی کتابیں تلاوت کے لئے نازل فرمائیں بلکہ ان دونوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ حق وعدل پر قائم رہنے والے اور اس کو قائم کرنے والے بنیں۔

اسلامی نظام کے سالانہ اجتماع کا نام حج ہے۔ ہمارے ہاں وہ نظام تو عرصہ ہوا کہ منقرض ہو گیا تاہم اس نظام کا سالانہ اجتماع اب بھی ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نظام ہی نہ رہا تو اس کے سالانہ اجتماع کی بھی وہ پوزیشن باقی نہیں رہی اس کو بھی پرستش میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسلامی نظام جاری رہتا تو یہ ہی حج پھر قیاماً للناس کا وعدہ پورا کرتا۔ یعنی اجتماع حج کے سامنے وہ مطامح حاصل کرنے ہوتے ہیں جن سے پوری انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے اور جو اس نظام میں داخل ہو گیا وہ امن میں آجائے 3:96- نیز یہ کہ اس اجتماع میں ساری انسانیت کے منافع وفوائد پیش نگاہ ہوتے ہیں اور ساری انسانیت کو یہاں آنے کی

دعوت دی جاتی ہے (22:27) تاکہ لیشھدوا منافع لھم 22:28، تمام اقوام عالم یہاں اس لئے آئیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مسلمان ان کی منفعت کے لئے کیا سکیمیں تیار کررہے ہیں کیونکہ یہ نظام ساری نوع انسانی کی پرورش کو پیش نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اقوام بھی اس نظام کی ثمر باریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کو اپنے ممالک میں بھی جاری کرنے کی کوشش کریں، یہ اجتماع اپنی نوعیت میں ساری انسانیت کو محیط ہوتا ہے مسلمان تو اس کے صرف داعی اور منتظم و منصرم ہوتے ہیں۔ ایسی قوم جو ساری دنیا کی خدمت گذار ہو، وہ بھلا کس طرح تشدد پسند ہوسکتی ہے۔

قرآن کریم امن پسندی پر اس قدر زور دیتا ہے کہ کوئی ایسا دشمن بھی جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کررہا ہو، اگر مسلمانوں کے پاس آکر پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دے دو، انسانیت کا یہ تقاضہ ہے کہ چونکہ وہ ایک انسان کی حیثیت سے پناہ لینے کے لئے آیا ہے تو اس سے دشمنی اور عداوت کو بھول جاؤ اور اسے پناہ دے دو، اسے زبردستی مسلمان نہ بناؤ۔ اس کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کردو، اگر وہ اس تعلیم کو قبول نہ کرے اور واپس اپنے مقام پر جانا چاہے تو اسے اپنی حفاظت میں اسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں بھی اسے مکمل امن ملتا ہو۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (9:6)۔ (ترجمہ) اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ کلام اللہ کو سن لے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پر پہنچا دو یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ آپ خود اندازہ فرمالیں کہ اسلام کس قدر مذہبی آزادی پر زور دیتا ہے، یہ غیر مسلم بالکل مسلمانوں کے رحم وکرم پر تھا، اسے زبردستی مسلمان بنایا جاسکتا تھا، لیکن یہ قرآن کی رواداری کے خلاف تھا اس کے متعلق یہی کہا کہ اسے قرآن سناؤ اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو اس کی پناہ گاہ تک خود چھوڑ کر آؤ۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ (22:40)-

اور اگر اللہ بعض کے ذریعے بعض کو مغلوب نہ کرے تو دیر، گرجے، عبادت خانے اور مساجد کہ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ویران کر دیئے جاتے اور اللہ تو ان کی مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

قرآن کریم ہر مذہب کے لوگوں کو پرستش کی اجازت دیتا ہے، خواہ وہ مذہب باطل ہی کیوں نہ ہو۔ سب لوگوں کو اپنی پرستش گاہوں سے محبت ہوتی ہے اسی لئے قرآن کریم کے نظام میں مسلمانوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں۔ اس نظام میں کسی کو زبردستی مسلمان بنانا بالکل ممنوع ہے۔ کوئی مذہب بھی ایسی کشادہ دلی کا تصور پیش نہیں کرتا جو قرآن نے پیش کیا ہے کہ اس میں خدا خود لوگوں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود اپنے سر لیتا ہے، جس طریق پرستش کو وہ باطل قرار دے رہا ہے، جن عبادت گاہوں کو وہ باطل قرار دے رہا ہے، جن معبودوں کو وہ باطل قرار دے رہا ہے، اگر ان کو بھی کوئی ڈھانے کے لئے آمادہ ہوتا ہے، تو اسلامی نظام ان کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

قرآن کریم میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں فساد کی سخت مذمت کی گئی ہے اور فساد پیدا کرنے سے سخت منع کیا گیا ہے۔ قرآن تو ہر جگہ سلامتی ہی سلامتی کا خواہاں ہے:

قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ

مُّبِین O یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہُ سُبُلَ السَّلاَمِ (5:15)-

اب تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آ گئی ہے اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، سلامتی کی راہیں دکھا رہا ہے۔

یہ اس کتاب کا مقصد بیان ہو رہا ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اس لئے اتاری ہے کہ اگر تم اس پر ایمان لائے تو یہ جنگ و جدل کے راستے سے نکال کر تمہیں امن و سلامتی کی راہ پر ڈال دے گی۔ اس کتاب کا بتایا ہوا راستہ انسانیت کو اس منزل تک لے جاتا ہے جسے دارالسلام کہا جاتا ہے:

لَھُمْ دَارُ السَّلاَمِ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوا یَعْمَلُونَ(6:127)-

(ترجمہ) ان کے لئے ان کے پروردگار کی طرف سے امن و امان کا گھر ہو گا اور اللہ ہی ان کا مددگار رہے، ان کے نیک اعمال کی وجہ سے جو وہ سرانجام دیتے ہیں۔

جو قوم بھی قرآن کریم کے مطابق اعمال سرانجام دے گی، ان کے ان اعمال کا نتیجہ میں ایسے معاشرہ کا قیام عمل میں آئے گا جس میں امن و سلامتی ہی ہو گی۔ اس معاشرے میں نہ جنگ ہو گی اور نہ خونریزی ہو گی۔

سورۂ یونس میں ان لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو دنیا کو اپنا نصب العین بنا لیں اور مستقبل کی کوئی فکر نہ کریں۔ ان کی یہ روش بالآخر تباہی پر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰہُ یَدْعُو اِلَی دَارِ السَّلاَمِ وَیَھْدِیْ مَن یَشَاءُ اِلَی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیمٍ(10:25)-

(ترجمہ) دعوتِ خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ ہر طرف تباہی سے سلامتی اور بربادی سے امن وسکون حاصل ہونا ہے۔

یہ وہ روش زندگی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا قانون ہر شخص کی راہنمائی کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کی رو سے انسان کی زندگی کا مقصد نفس انسانی کی نشوونما کرنا اور صفات خداوندی کو اپنے میں منعکس کرنا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی جس قدر صفات خداوندی کے مطابق عمل کرے گا' اس کے نفس میں اسی قدر بالیدگی ونشوونما ہوگی' اللہ تعالیٰ کے اسماء صفاتی میں دو اسماء صفاتی السلام اور المومن بھی ہیں' ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے میں سلامتی اور امن کی صفات کو اجاگر اور بیدار کرے' مسلمان تو ہر حال میں سلامتی اور امن کا پیکر اور اس کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہ تو مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو اس سے نقصان یا تکلیف پہنچے اور جو شخص سلامتی کا علمبردار نہیں' وہ قرآنی مسلمان نہیں ہوسکتا' وہ صرف پیدائشی مسلمان ہوسکتا ہے۔

یہاں تک آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام مسلمانوں کے لئے پرامن رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ چھوڑتا ہی نہیں۔ دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنے کے لئے' اپنی روزمرہ کی زندگی میں قرآن کا اتباع ضروری ہے اور یہ صرف اس معاشرہ میں ہوسکتا ہے جو قرآنی مملکت قائم کرتی ہے۔ اس کے لئے تصوف کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے اور مغربی اقوام یا ہمارے لبرل حضرات کا یہ خیال کہ مسلمانوں کو امن پسند بنانے کے لئے ان میں تصوف کو فروغ دیا جائے' درست نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کسی طرح اسلامی (قرآنی) حکومت قائم کردی جائے' تو لوگوں کو اندازہ ہو کہ اسلامی مملکت کس درجہ امن وسلامتی کا گہوارہ ہوتی ہے اور اس میں لوگ فوج درفوج داخل ہوتے ہیں (110:2)۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے تو یہ بات واضح رہے کہ تصوف قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ تصوف ہی ہے جو مسلمانوں کے زوال کا باعث ہے۔ تصوف چونکہ انفرادی نجات کا قائل

ہے اس لئے اس میں کسی بھی نظام کا تصور راہ نہیں پا سکتا۔ ہمارے ہاں تصوف کو فروغ ہی اس لئے ہوا کہ نہ تو اسلامی نظام ہی جاری رہا ہے اور نہ ہی اس کا تصور باقی رہا۔ ہمارے اس دور میں جب کہ تحریک طلوع نے دین کا تصور نکھار کے واضح کر دیا ہے اور اس تصوف کو عام کرنے میں کوشاں ہے۔ تصوف کی حقیقت کو سمجھ لینا آسان ہو گیا ہے' تصوف اور نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں' تصوف انفرادی نجات کا قائل ہے جبکہ دین میں اجتماعی اطاعت ہوتی ہے۔ آپ ایک وقت میں دو کشتیوں میں سوار نہیں ہو سکتے۔

تصوف یا پرستش کا انحصار روح کے غلط تصور پر ہے۔ تصوف کا سارا مقصود و منتہیٰ روح کا تزکیہ ہے' لیکن قرآن کریم کی رو سے روحِ انسانی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ یہ تصور صرف احادیث کے ذریعہ برآمد ہوا ہے۔ ان میں سے چند احادیث پیش خدمت کی جاتی ہیں۔

(1) ترمذی شریف نے اس حدیث کو حضرت ابودرداء کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ پھیرا جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی ساری گوری نسل نکل پڑی اور بائیں شانہ پر ہاتھ پھیرا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ جنت کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں اور بائیں شانے والوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں مجھے ان کی نافرمانی کی پرواہ نہیں۔ (تفسیر مظہری' جلد 3-4' صفحہ 284)۔

(2) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے اس آیت 7:172' کا مطلب دریافت فرمایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی

تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت پر اپنا دستِ قدرت پھیرا جس کی وجہ سے آپ کی ہونے والی ساری اولاد ظاہر ہو گی۔

(3) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب پیدا کیا اللہ نے آدم کو تو ہاتھ پھیرا اس کی پشت پر، پس گریں اس کی پشت سے ارواح جن کا خالق اللہ ہے، آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک۔

اسی طرح کی اور احادیث بھی ہیں جن سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میثاق کے روز کروڑوں روحیں پیدا کر لی تھیں اور جب اب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان کروڑوں روحوں میں سے ایک روح اس بچہ کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے اور جب وہ بچہ عمر گذار کر فوت ہوتا ہے تو یہ روح اس کے جسم سے نکل جاتی ہے۔ روح کا جو یہ نظریہ بیان کیا جاتا ہے یہ انفرادی پرستش، نجات، تصوف، ایصال ثواب، خانقاہیت، رہبانیت، وسیلہ قرب خداوندی، الہام وغیرہ قسم کے عقائد کو جنم دیتا ہے اور یہی سارے نظریات مسلمانوں کے زوال کا باعث اور دین کے قیام میں رکاوٹ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔

روح کے متعلق جو نظریہ ان احادیث میں بیان کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ احادیث میں بیان کردہ یہ نظریہ کہ استقرار حمل کے چار ماہ بعد رحم مادر میں روح ڈالی جاتی ہے بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ انسانی جنین مردہ ہوتا ہی نہیں کہ اس میں چار ماہ بعد روح ڈالی جائے۔ انسانی جنین شروع سے ہی زندہ ہوتا ہے۔ نر مادہ سے خارج شدہ مادۂ تولید (نطفہ) خود زندہ ہوتا ہے۔ اس میں روح ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر قرآن کریم نے کئی مقامات پر جنین کی مختلف Stages کو بیان فرمایا ہے کہ رحم مادر میں نطفہ علقہ سے مضغہ، ہڈیاں، پھر ہڈیوں پر گوشت پھر آخر میں انسانی بچہ کی شکل بنتی ہے 23:14، اس مضمون کو قرآن کریم نے کئی بار دہرایا ہے۔ لیکن

کسی ایک جگہ بھی ادخال روح کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگر یہ مزعومہ روح بھی جنین میں داخل کی جاتی، تو یہ ممکن نہیں کہ قرآن کریم اتنی بات کو Miss کر جائے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو جو جوہر وصلاحیت عطا ہوئی ہے اس کو قرآن کریم نے نفس کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی نشوونما اور وظائف نہیں بلکہ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے جو صرف اسلامی معاشرہ میں ہی ممکن ہے۔ اس میں انفرادی نجات کا تصور راہ نہیں پا سکتا، اگر آپ نفس کا قرآنی تصور تسلیم کر لیں تو روح، روحانیت اور تصوف کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

تصوف کا دوسرا خلاف قرآن عقیدہ یہ ہے کہ تصوف کائنات کا حقیقی وجود تسلیم ہی نہیں کرتا، اس کے نزدیک یہ خارجی کائنات محض ایک نظر کا دھوکا ہے اس کے نزدیک حقیقی کائنات عالم امثال میں ہے۔ جو کہیں عالم بالا میں موجود ہے اور ہماری یہ دنیا اس کا ایک پرتو ہے۔

کلما فی الکون وھم او خیال
او عکوس فی المرایا او ظلال

(ترجمہ) دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف وہم اور خیال ہے یا وہ آئینہ کا عکس ہے۔ اور یا محض سایہ ہے۔ ہماری ساری شاعری اس نظریہ کی داعی ہے۔

تصوف کا یہی وہ بنیادی نظریہ ہے جس سے اس کے ماننے والوں میں دنیا کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور نہ سائنسی علوم ان کے لئے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔

حالانکہ قرآن کریم نے اس بات پر بڑا اصرار کیا ہے کہ یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضَ بِالْحَقِّ (6:73)-

اللہ وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے۔

اسی مضمون کو مزید موکد کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاء وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِکَ ظَنُّ

الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (38:27)-

اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں بیکار پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہو بیٹھے ہیں۔تو جو لوگ دوزخ کے منکر ہیں ان پر افسوس ہے۔

جو لوگ کائنات کے وجود کو حقیقی نہیں مانتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ کائنات کسی خاص مقصد کے ماتحت تخلیق کی گئی ہے بلکہ اس کا وجود ہی باطل سمجھتے ہیں، قرآن کی رو سے وہ کافر ہیں، لیکن افسوس کہ تصوف کا بنیادی عقیدہ ہی یہ ہے کہ کائنات کا کوئی حقیقی وجود ہی نہیں ہے۔

یہ مضمون طویل ہوگیا ہے۔تصوف کا موضوع ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے،اس لئے آئندہ تصوف پر ایک جامع مضمون پیش خدمت عالی کیا جائے گا۔اس وقت ہماری طرف سے یہی کچھ پیش خدمت عالی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

☆☆☆